اہرامِ مصر

اور فرعونوں کے عجائبات

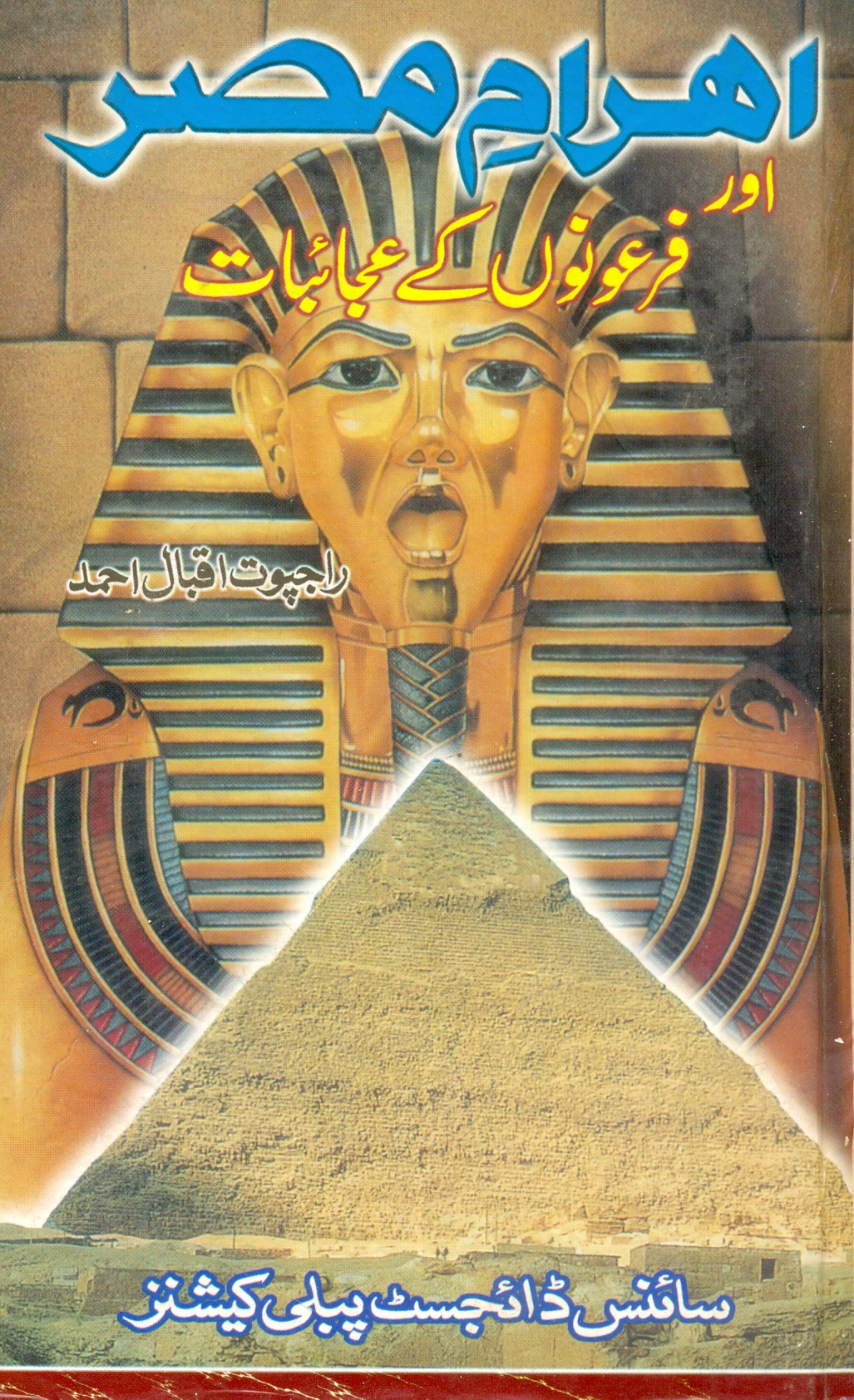

راجپوت اقبال احمد

سائنس ڈائجسٹ پبلی کیشنز

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ

برادرم

سلیم انور عباسی کے لیے

بصد خلوص

ضمیر الدین

۸ر دسمبر ۲۰۰۰ء

اہرامِ مصر

اور

فرعونوں کے عجائبات

تصنیف : وارن اسمتھ

ترجمہ : راجپوت اقبال احمد

سائنس ڈائجسٹ پبلی کیشنز

جملہ حقوق بنام ادارہ بذریعہ کاپی رائٹ ایکٹ محفوظ ہیں

بلااجازت شائع کرنے یا حوالہ دینے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی

نام کتاب---------------------- اہرامِ مصر اور فرعونوں کے عجائبات

مؤلف--------------------------------- راجپوت اقبال احمد

اضافہ، تصاویر اور کیپشنز-------------------- سلیم انور عباسی

تزئین واہتمام-------------------------------- محمد شکیل احمد

ناشر------------------------------------- رضی الدّین خاں

لیزر کمپوزنگ------------------- سیّد سلمان افتخار علی، محمّد رضوان احمد

باراوّل ------------------------------------ نومبر ۲۰۰۰ء

تعداد -- ایک ہزار

صفحات ------------------------------------- دوسو چالیس

کاغذ ------------------------------------- فلائنگ آفسٹ

قیمت مجلد-------------------------------- 160روپے

کلر پرنٹنگ ---------------------- الغزال پرنٹنگ پریس، کراچی

سرِ ورق ڈیزائن------------ سیّد وجاہت علی، احمد لیزر اسکینگ، کراچی

پرنٹر ------------------------- ابنِ حسن پریس ہاکی اسٹیڈیم، کراچی

رابطہ ---------------------- سائنس ڈائجسٹ پبلی کیشنز

207 النور چیمبرز پریڈی اسٹریٹ صدر، کراچی 74400

ٹیلیفون ---------------------------------- 7727064

ای میل---------------------------- sci-dig@hotmail.com

sci-dig@yahoo.com

کتاب ملنے کا پتہ------------ یونائیٹڈ نیوز پیپر ایجنسی آفس نمبر 9 فریئر مارکیٹ

شاہراہِ لیاقت کراچی، فون : 7722151, 7773359

انتساب

اپنے والدین کے نام

جن کے لئے میں

ہمہ وقت مجسّم دُعا

رہتا ہوں۔

اقبال احمد راجپوت

(راجپوت اقبال احمد)

اظہارِ تشکّر

۶۰ء کی دہائی میں پاکستان میں پہلی بار لفظ "ڈائجسٹ" سننے میں آیا جب کتابی سائز میں پہلے جریدے ماہنامہ "اردو ڈائجسٹ" کا اجراء ہوا جس کا مقصد یہ تھا کہ امریکہ کے مشہور و معروف جریدے "ریڈرز ڈائجسٹ" کی طرز پر بیش قیمت معلومات کو مختلف ذرائع سے کشید کر کے بہترین مضامین کا انتخاب شائع کیا جائے۔ پھر ۷۰ء کی دہائی میں جناب شکیل عادل زادہ نے "سب رنگ ڈائجسٹ" کی صورت میں فکشن کے بہترین انتخاب کا سلسلہ شروع کیا جو ایسا مقبول ہوا کہ پھر لفظ "ڈائجسٹ" صرف اور صرف کہانیوں کے لیئے ہی مخصوص ہو کر رہ گیا اور متنوّع و متفرق معلومات کا تصوّر ملیاٹ تہذیبوں کی طرح دفن ہو گیا اور ایک وقت وہ آیا جب سارا پاکستانی معاشرہ کہانیوں پر مبنی ڈائجسٹوں کے سحر کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ ایسے ہی جنوں خیز اور فکشن زدہ ماحول میں فروری ۱۹۸۱ء میں ہم نے متنوّع معلومات کے خزینے کو بازیافت کر کے "ماہنامہ سائنس ڈائجسٹ" کا آغاز کیا اور فنی و پاپولر سائنس جیسے مشکل موضوع کا بیڑا اٹھایا۔ گذشتہ بیس برسوں کے دوران تقریباً ۵ ہزار سے زائد مضامین سائنس کی تقریباً تمام ہی شاخوں بشمول طبیعیات، حیاتیات، کیمیاء، ریاضی، کمپیوٹر سائنس اور دفاعی سائنس پر چھپ چکے ہیں۔ یوں بیس برس کے اس تنہا سفر میں ہم پر کئی دشوار گزار مراحل آئے کہ جب کئی ہمدردوں و غم گساروں نے کہا کہ کیا "سائنس ڈائجسٹ" کی خشک دوکان لگا رکھی ہے۔ آپ بھی فکشن کی طرف آیئے تبھی آپ کو بے پناہ شہرت اور پیسہ ملے گا مگر ہم اپنے فیصلے پر اٹل رہے اور آج ہمارے کاروانِ سائنس کے سفر میں طالب علموں، وکیلوں، انجینئروں، طبیعیات دانوں، ماہرین حیاتیات، کمپیوٹر سائنس، دفاعی سائنس، صنعت و حرفت، نباتیات، کیمیاء، حیوانیات، فلسفہ، عمرانیات اور میڈیکل سائنس وغیرہ سے وابستہ لاکھوں افراد کا وسیع حلقہ شامل ہے۔ اللہ تعالٰی کے فضل و کرم سے آج "سائنس ڈائجسٹ" علم اور معلومات کی ایک سند بن چکا ہے اور آپ کا ساتھ رہا تو انشاء اللہ تعالٰی یہ سفر یونہی جاری رہے گا۔ ماہنامہ سائنس ڈائجسٹ کے اجراء کا مقصد پاکستان میں "سائنس کلچر" کا فروغ ہے اور اب ہم اس علمی مہم کو توسیع دیتے ہوئے سائنس ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی طرف سے اپنی پہلی کتاب "اہرامِ مصر اور فرعونوں کے عجائبات" پیش کر رہے ہیں جو برطانیہ کے معروف عاشقِ پراسراریات وارن اسمتھ (Warren Smith) کی کتاب "اہرام کی پراسرار قوتیں" (The Secret Forces of the Pyramids) کا ترجمہ ہے جسے جناب راجپوت اقبال احمد نے اس خوبی سے اردو کا لباس پہنایا ہے کہ آپ کو کہیں سے یہ گمان نہیں گزرے گا کہ یہ کتاب انگریزی میں لکھی گئی ہے۔ یہ ہمیں این ڈی ایف سی کے سابق سینئر نائب صدر جناب ایس ایم قمر علی نے مرحمت فرمائی تھی جن کا شکریہ ہم پر واجب ہے اور اگر ہم سائنس ڈائجسٹ کے نائب مدیر سلیم انور عباسی جنہوں نے تصاویر کے انتخاب اور کیپشنز میں خصوصی توجہ دی اور معاون مدیر عبدالجبار سلیمان کا شکریہ بھی نہ ادا کریں تو یہ ناسپاسی ہوگی کہ ان کی خاص توجہ اور تعاون نے اس کتاب کو آپ تک پہنچانا ممکن بنایا۔ دنیا کی باوقار قومیں احسان مند ہوتی ہیں اس لیئے وہ اپنے مخلص لوگوں کی تعریف و توصیف میں بخل سے کام نہیں لیتیں۔ سائنس ڈائجسٹ پبلی کیشنز کو مجسم صورت بنانے میں ہمارے جنرل منیجر محمد شکیل احمد پیش پیش رہے اور جس انداز سے کئی ہفتوں کی راتیں کالی کر کے شبانہ روز محنت و توجہ سے انہوں نے کتاب کی سیٹنگ سے لے کر طباعت کے آخری مراحل تک تعاقب کیا وہ قابلِ تعریف و ستائش ہے۔ کمپیوٹر پر سیٹنگ، کمپوزنگ، تصحیح در تصحیح کے مراحل میں سید سلمان افتخار علی، محمد رضوان احمد، محمد فرخ خان نے بھی اپنی جستجو و دلچسپی کو مسلسل قائم رکھا جبکہ دیگر بیرونی کاموں پریس، کاغذ وغیرہ کے مراحل مارکیٹنگ اسسٹنٹ محمد عمران خان او عرفان احمد نے خوش اسلوبی سے انجام دیئے۔ آخر میں ہم سب پر سب سے زیادہ شکریہ "روزنامہ جنگ" کا واجب ہے جس کے موٗ جریدے جنگ مڈویک میگزین کی ۸ نومبر ۲۰۰۰ء کی اشاعت سے ہم نے نادیہ عباسی کی کمال تحریر سے استفادہ کیا کتاب میں شامل تصاویر کے لیئے ہم نے (EYEWITNESS BOOKS) کی سیریز (Ancient Egypt) سے استفادہ کیا جسے جار ہارٹ نے لکھا ہے۔ ★ ★ ★

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کبریائی تو اسی کی ہے

یہ کائنات سادہ بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ سمجھ میں آتی ہے اور سمجھ سے بالکل ہی باہر ہے۔ جتنی عقل دوڑائیں گے طرح طرح کے تضادات اور ناقابلِ یقین اسرار سامنے آتے جائیں گے۔ سوچ کے دریچے بند رکھیں تو ہر چیز معمول کے مطابق محسوس ہو گی۔ سورج، چاند، ستارے، جمادات، حیوانات اور نباتات سبھی مخصوص قوانین اور طے شدہ شیڈیول کے مطابق اپنے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں اور مستقل طور سے یکساں طبیعی قوانین کے پابند ہیں اس طرح کہ ان سے سرِ مو انحراف نہیں کر سکتے۔ آئن اسٹائن نے کہا ”سائنسی تحقیق کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ ہر چیز قانونِ فطرت کے مطابق ظہور پذیر ہوتی ہے اور قوانینِ فطرت ساری کائنات میں یکساں ہیں“ اور پھر قوانینِ فطرت کی یکسانیت پر زور دینے والے اسی البرٹ کو زِچ ہو کر کہنا پڑا ”کائنات کی سب سے ناقابلِ فہم بات یہی ہے کہ یہ قابلِ فہم ہے۔“

یہ کائنات کیا ہے کیوں ہے کس نے بنائی کیوں بنائی کیا اس کا کوئی خالق ہے اگر نہیں تو کیوں نہیں اور ہے تو کیسا ہے اور وہ خود سے کیوں ہے اور جب ہے تو نظر کیوں نہیں آتا اور اگر نظر نہیں آتا تو عقل کے دائرے میں قید کیوں نہیں ہوتا۔ یہ اور اس جیسے سینکڑوں سوالات ہیں جو نوعِ انسان کو ہمیشہ سے تنگ کرتے رہے ہیں اور ہمیشہ تنگ کرتے رہیں گے اور ہر دور میں دہریت کا سب سے بڑا اور وزنی اعتراض یہ رہا ہے کہ جو ہستی (شئے) نظر نہیں آتی اور عقل کی گرفت اور دائرے سے خارج ہے اس کا وجود نہیں ہوتا، ہو نہیں سکتا۔ لیکن سائنس میں طبیعیات ہی کا یہ اصول ہے کہ ”اگر سائنس کے تمام مسلّمہ قوانین کی مدد لے کر بھی کسی شئے کا عدم وجود ثابت نہ کیا جا سکے تو وہ خود بخود اپنا وجود رکھتی ہے چاہے وہ کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے“ گویا اس کا وجود ”سمجھ میں آنے“ کا محتاج نہیں ہے۔

اب کائنات اور کہکشاؤں سے اُتر کر زمین پر آجایئے۔ کرۂ ارض پر ایک دو نہیں بے شمار چیزیں اور معاملات ایسے ہیں جن کی انسانی عقل کوئی ”عقلی توجیہہ“ نہیں کر سکتی اور جو ابھی تک ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔ اس سلسلے میں حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ کھلی آنکھوں سے نظر بھی آتی ہیں اور طبیعی قوانین کی مدد سے ان کا وجود ثابت ہے جس میں کسی قسم کے شک وشبے کی گنجائش نہیں ہے۔ انسان کی بنائی ہوئی جی ہاں انسانوں کی بنائی ہوئی چیزیں جو نظر بھی آرہی ہیں اور سات ہزار سال سے زمین کے سینے پر کھلم کھلا وجود رکھتی ہیں ابھی تک حضرتِ انسان کی عقل شریف میں نہیں آرہیں کہ کس نے بنائیں اور کیسے بنائیں۔ ان کا وجود سمجھانے والے تمام ہی تجزیئے غلط اور مضحکہ خیز ثابت ہوئے ہیں حتیٰ کہ اکیسویں صدی کے کمپیوٹر بھی اس معاملے میں قطعی عاجز ہو چکے ہیں۔

”جو شئے یا ہستی سمجھ میں نہیں آتی وہ اپنا وجود نہیں رکھتی“

لیکن اہرام تو سات ہزار سال سے وجود رکھتے ہیں اور انسانی عقل کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اے اہلِ عقل جب ہم انسانوں کی بنائی ہوئی نظر آنے والی چیزیں سمجھ میں نہیں آرہیں تو جو بھی اس ساری کائنات کا خالق

ہو گا اگر وہ نظر نہیں آرہا اور سمجھ میں نہیں آتا تو اس پر "عدم وجود" کا حکم لگانا کیا ضروری ہے۔؟ اور اس موضوع کو اتنا ہوّا کیوں بنایا ہوا ہے؟

اے اہلیانِ دہر سیدھے سیدھے مان لیں کہ ہماری عقل بڑی محدود اور ناقص ہے جبکہ انسانی عقل اور کل کائنات کا خالق اور قادرِ مطلق لامحدود اور کامل ہے۔

آج اس بات کو ایک طے شدہ حقیقت سمجھا جاتا ہے کہ اس دور کا انسان جتنا ترقی یافتہ اور فطری قوتوں پر حاوی ہے کسی دور کا انسان چاہے وہ کسی خطّے کا ہو 'اتنا ترقی یافتہ اور اعلیٰ دماغ کبھی نہیں رہا۔ لیکن اہرام کی تعمیر اور ان کی ساخت کا تجزیہ کرنے سے اس حقیقت کی نفی ہوتی ہے۔ کیا مصریوں پر "یکساں" قوانینِ فطرت کا اطلاق نہیں ہوتا تھا اور اگر قدیم دور کے انسان کم ترقی یافتہ اور پس ماندہ تھے تو اس دور کا انسان محض ان کی نقل کیوں نہیں کر سکا ہے۔

اہرام اور سرزمینِ مصر کے فراعین کی تفصیلات اور قصّے پڑھتے ہوئے اس بات کا شدّت سے احساس ہوتا ہے کہ ہر دور کا انسان توہّمات اور خرافات کا کتنا مارا ہوا ہے۔ اہراموں اور ممیّوں کے نام پر کس قدر الٹی سیدھی اور توہّمات سے بھرپور تفصیلات منسوب کردی گئی ہیں۔ قدیم مصری آخرت کی زندگی کے قائل تھے لیکن کفروشرک ورعونت کے سبب انہوں نے حقائق اور جذبات کو گڈمڈ کر کے کچھ کا کچھ کردیا۔ اسلام کا انسانیت اور اقوامِ عالم پر کیا یہ کم احسان ہے کہ روشن خیالی اور حقیقت پرستی کا پہلا اور معقول تصوّر اسی نے پیش کیا اور انسانوں کو ان تمام خام خیالیوں اور بے سروپا عقائد سے نجات دلائی جن کے نتیجے میں ان کی عقلیں کند ہو گئی تھیں۔ اہرام اور فرعونوں کے واقعات میں انسانی ہنر اور کمال کے ساتھ ساتھ عبرت اور بے بسی کے بھی بڑے گہرے نقوش ثبت ہیں۔ تو کھلے دل ودماغ کے ساتھ خود ہی تجزیہ کیجئے کہ روشن خیالی اور توہّمات کی سرحدیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں اور کہاں جاکر ختم ہوتی ہیں۔ اگر آپ کسی نتیجے پر پہنچ سکیں تو یہی ہماری کامیابی اور محنت کا حاصل ہوگا۔ اَلعِزّتُ لِلّٰہ۔

ناچیز
رضی الدین خاں

کراچی ۲۳ دسمبر ۲۰۰۰ء

اپنی زباں میں

اہرامِ مصر قسط وار شائع ہوئی تھی۔ اب کتابی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ کاوشیں، تحقیق و جستجو و نتائج کسی اور کے ہیں ہم تو صرف تالیف کرنے کے گناہ گار ہیں۔ شاید بعض گناہ بھی پسندیدہ ہوتے ہیں سزاوارِ تعریف و تحسین ہوتے ہیں۔ اگر ہمارا یہ گناہ بھی پسندیدہ ٹھہرا ہے تو خود کو تعریف و تحسین کا سزاوار سمجھیئے کہ اس دور میں بھی کمپیوٹر، ٹی وی، کیبل وغیرہ کے دور میں بھی۔۔۔۔ آپ کتاب ہاتھ میں لئے بیٹھے ہیں۔ کتاب۔۔۔ کہ جنسِ متروک ٹھہری۔۔۔ اب بھی ہمیشہ کی طرح اپنے اندر بیش بہا خزانے سمیٹے ہوئے ہے۔

ایک بات بتاؤں! ایک روز میرپور خاص میں، میں اپنی بیٹھک میں (ڈرائنگ روم جو میرا اسٹڈی روم بھی تھا) بیٹھا ہوا تھا۔ بیٹھک کا ایک دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ باہر سے آواز آئی "قرآن لے لو، سیپارے لے لو۔" مجھے ضرورت تھی۔ میں نے انہیں بیٹھک میں بلا لیا۔ صاف ستھرے کپڑوں میں ایک لمبے تڑنگے صاحب تھے ان کے ساتھ ایک مزدور تھا جس کے سر پر قرآن اور سیپاروں کی بھاری گٹھڑی تھی۔ میں نے ایک دو قرآن دیکھے۔ وہ باتیں کرنے لگا۔ میری میز پر کتابوں کا ڈھیر دیکھ کر اس نے پوچھا تو میں نے بتایا کہ میں ٹیچر ہوں۔ وہ کہنے لگا "میں پروفیسر ہوں" "اچھا" میں نے سادگی سے کہا اور قرآن دیکھتا رہا۔ وہ بولا۔ "میں چین جاپان، ایران، عراق، امریکا، وغیرہ میں گھوما ہوا ہوں۔" اس کا لہجہ فاخرانہ تھا جو مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے کہا "تم نے چین، جاپان، امریکا، افریقہ پیدل، کار میں، ہوائی جہاز میں، بحری جہاز میں جا کر دیکھا ہوگا"۔ وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔ میں نے اپنی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں اس کرسی پر بیٹھا بیٹھا جب چاہوں، دنیا کے جس ملک میں چاہوں' جس حصے میں چاہوں جا سکتا ہوں۔" وہ چند لمحوں تک میری صورت تکتا رہا پھر بولا "آپ سفلی جانتے ہیں۔" میں نے لاحول پڑھی، اسے قرآن لوٹایا اور اپنی بیٹھک سے رخصت کر دیا۔

جی ہاں، قارئین! یہ سچ ہے۔ کتاب میں اتنی قوت ہے کہ انسان کو کرسی پر بیٹھے بیٹھے دنیا جہان کی، ماضی حال اور مستقبل کی سیر کرا دیتی ہے۔ تو آیئے ہم بھی اس کتاب کے ذریعے سات ہزار سال قبل کی دنیا میں چلیں۔

اہرامِ مصر کی دنیا۔۔ حیرتوں اور عجائبات کی دنیا۔۔۔ سنگی چٹانوں سے چیستانی انبار کی دنیا جو ہزاروں سال سے ایک لاینحل معمے کی حیثیت سے دھرتی کے سینے پر ایستادہ ہے۔۔۔ دریائے نیل کے ڈیلٹا کی دنیا جو مندروں، محلوں، مقبروں، اہراموں، مٹھوں اور چار پہلو ستونوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔۔۔ نزاکت، نفاست، عمدگی اور انتہائی مہارت سے تیار کئے گئے حسین و جمیل دوشیزاؤں کے مجسموں کی دنیا۔۔ بادشاہ اور ملکہ کے مزین ایوانوں، منقش ستونوں اور جڑاؤ تابوتوں کی دنیا۔۔۔ کھوکھلی زمین، زیرِ زمین سرنگوں، بھول بھلیّوں اور طویل اور ویران راہ داریوں کی دنیا۔۔ بدسرشت اور ہوس پرست جناتوں کی دنیا۔۔۔ اس مہ جبیں عفریت کی دنیا جو کسی بھی مرد کو ورغلانے کی قوت رکھتی تھی پھر اپنے محبوب کے گوشت سے اپنی بھوک مٹاتی تھی۔

اس ایٹمی اور خلائی دور کے سائنس دانوں سے کہیں زیادہ ذہین اور فطین انسانوں کی دنیا۔ ستاروں اور سیاروں کی سیاحت پسند مخلوقات کی دنیا۔ تو آیئے قارئین! صفحہ الٹیئے اور دماغ کی چولیں ہلا دینے والی ہزاروں برس قبل کی حیرت آفریں دنیاؤں کی سیاحت پر روانہ ہو جایئے۔

آپ کا

راجپوت اقبال احمد

۲۰ دسمبر ۲۰۰۰ء

میں کہ راجپوت اقبال احمد ہوں

اقبال احمد راجپوت نام۔ دسمبر ۱۹۴۰ء میں کھیتڑی راجپوتانہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں اپنے والدین کے ساتھ پاکستان ہجرت کی۔ کھوکھراپار کے راستے سندھ میں آئے اور میرپور خاص کو مستقل ٹھکانہ بنالیا۔ یہیں تعلیم کی ابتداء کی۔ میٹرک گورنمنٹ ہائی اسکول میرپور خاص سے ۱۹۵۷ء میں پاس کیا۔ اس کے بعد حسرت ہی رہی کہ کسی کالج، کسی یونیورسٹی کی بہ حیثیت طالب علم شکل دیکھتے البتہ بہ حیثیت استاد اکیس سال مختلف ہائی اسکولوں (جس میں سے زیادہ عرصہ گورنمنٹ ہائی اسکول میرپور خاص میں) اور تقریباً بائیس برس گورنمنٹ ڈگری کالجوں میں (اور اس عرصے کا بھی ایک بڑا حصہ جامعہ ملیہ گورنمنٹ ڈگری کالج، ملیر میں) بہ حیثیت انگریزی کے استاد کے گزارا اور آخر جامعہ ملیہ کالج ملیر ہی سے دسمبر ۲۰۰۰ء میں ریٹائر ہوں گے۔ اور پھر نئے عزم و حوصلے کے ساتھ علم کے نئے اُفق تلاش کریں گے، آیئے جناب راجپوت اقبال احمد کے ساتھ ان کے بیتے ہوئے کل کی طرف چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ انہوں نے علم و ادب کی شاہراہوں سے کیسے کیسے آبدار موتی چنے:

بس پڑھنے کا سدا سے شوق تھا۔ اسی شوق نے پرائیویٹ اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے بی اے، بی ایڈ، ایم اے (اردو)، ایم ایڈ اور ایم اے (انگریزی) کی منزلیں بڑی آسانی سے طے کرادیں۔ ہاں۔ پڑھنے والوں کے لئے، کچھ کرتے رہنے والوں کے لئے ہر امتحان ''بچوں کا کھیل'' ہوتا ہے۔

بننا کچھ اور چاہتے تھے مگر جب قسمت نے استاد بنادیا تو پتا چلا کہ اسی کام کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ اپنے پیشے سے عشق کی حد تک لگاؤ ہے۔ جو اچھی بات پڑھی اسے امانت سمجھا اور اپنے طلباء تک پہنچانے کی کوشش کی۔

کتابوں سے، موسیقی سے، شاعری سے دلچسپی رہی، اور بہت رہی۔ افسانے اور ناول بے تحاشا پڑھے پھر خود بھی لکھنے لگے مگر اپنا لکھا کچھ معیاری نہ لگا تو ترجمے شروع کردیئے۔ پہلی ترجمہ کہانی ''اینٹ کی بیگم'' سب رنگ ڈائجسٹ میں شائع ہوئی جو عالمی شہرت یافتہ ناول نگار فیودور دوستوسکی کی تحریر کردہ تھی اور پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ ملک کے تقریباً ہر اردو ماہنامہ ڈائجسٹ میں کہانیاں شائع ہوتی رہیں۔ تراجم کے دوران میں کبھی کبھار اپنی کوئی کہانی طبع زاد طویل، مختصر اور قسط وار بھی لکھتے رہے اور شائع ہوتی رہیں۔ عالمی ڈائجسٹ میں ایک طویل طبع زاد کہانی ''میڈونا'' کئی قسطوں میں شائع ہوئی اور پسند بھی کی گئی۔

لکھنے کی ابتداء ''خان اقبال احمد'' کے نام سے ہوئی پھر ''راجپوت اقبال احمد'' کا اضافہ ہوا۔ اس کے بعد تقریباً دس قلمی نام اپنے بچوں کے دوستوں کے استعمال کرنے پڑے کہ ایک رسالے میں بہ یک وقت ایک ہی نام سے چھ یا آٹھ کہانیاں شائع نہیں ہوسکتی تھیں۔ ان قلمی ناموں میں سے چند معروف نام احمد سعید، راحیل عبید، روبینہ احمد، حاشر اقبال، لبنیٰ اختر وغیرہ وغیرہ ہیں۔

طبع زاد تراجم، تلخیص، ماخوذ سب ہی کچھ لکھا مگر لکھنے کا یہ تجربہ بڑا تلخ رہا۔ میں نہ شاعر تھا نہ ادیب، نہ افسانہ نگار، نہ قلم کار۔۔۔ صرف قلم کا مزدور تھا۔ استاد کی تنخواہ میں گزارا مشکل ہوگیا تو جو کام شوق سے شروع ہوا تھا، مجبوری اور مزدوری بن گیا۔ اوراق کے حساب سے نہیں، بقول کسے ''راجپوت کلو کے حساب سے لکھتا تھا'' مگر زمانہ شناس نہ تھا اس لئے مات کھا گیا۔ مزدوری ملنے اور بڑھنے کے بجائے وعدوں پر ٹلنے لگی اور آخر مزدور نے پھاوڑا پھینک دیا۔ ''اب نہیں لکھوں گا'' کا عہد کیا مگر یہاں کب کسی کا عہد پورا ہوسکا ہے۔ سائنس ڈائجسٹ میں پہلے بھی کئی مضامین شائع ہوچکے تھے۔ یہ سلسلہ بھی بند ہوگیا تھا مگر پھر رضی الدین خاں صاحب۔۔ کہ سدا سے اچھے دوست رہے ہیں۔۔ ضد کر بیٹھے کہ سائنس ڈائجسٹ کے لئے لکھو۔۔ آپ کے نوکِ قلم سے نکلی ہوئی شگفتہ وشیریں سائنسی تحریر کی قارئینِ سائنس ڈائجسٹ کو اشد ضرورت ہے اور ایک بار پھر قلم اٹھانا پڑا۔ نتیجتاً برمودا ٹرائینگل اور اہرامِ مصر قسط وار شائع ہوئیں۔

اور اب ''اہرامِ مصر'' کتابی صورت میں آپ کے ہاتھوں میں موجود ہے۔

لکھنا پھر اختتام کو پہنچا وقتی طور پر یا دائمی۔۔۔ کچھ پتا نہیں۔۔ مگر تدریس کا عمل جاری ہے اور انشاء اللہ تادمِ آخر جاری رہے گا۔ آج کل پی ٹی اے کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، کورنگی میں جو نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف لیدر ٹیکنالوجی (NILT) کا ذیلی ادارہ ہے درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہے۔۔۔ جانے کب تک!

دعاگو و طالبِ دعا

راجپوت اقبال احمد

۲۰ دسمبر ۲۰۰۰ء

فہرست

۱۔	2600سال پرانی ایرانی شہزادی کی پراسرار ممی	۱۳
۲۔	قدیم مصر اور فرعونوں کی سلطنت	۱۹
۳۔	اہرامِ مصر۔انسانی تاریخ کا سات ہزار سالہ معمّہ	۲۵
۴۔	دنیا کے پراسرار اہرام	۳۷
۵۔	دنیائے قدیم کے عجائبات	۵۱
۶۔	گیزا کے عظیم اہرام	۶۹
۷۔	آفاقی فارمولے یا اتفاقات	۸۱
۸۔	ابتدائی دور کے سیاح	۹۱
۹۔	ماہرینِ اہرامیات کی پیش گوئیاں	۱۰۶
۱۰۔	ایٹلانٹس کے اہرام	۱۱۶
۱۱۔	ڈاکٹر اینڈریسن : اہرام اور خفیہ سرنگیں	۱۲۴
۱۲۔	غیر مکانی سیلانی اور متفرق اشیاء	۱۴۴
۱۳۔	کیا اہرام جنّاتوں نے تعمیر کئے ہیں	۱۵۸
۱۴۔	قدماء کے گم شدہ راز	۱۷۳
۱۵۔	اہراموں اور یوایف اوز کے رابطہ کار	۱۸۷
۱۶۔	قدیم مصری اور موت	۱۹۹
۱۷۔	فزکس اور اہرام	۲۱۶
۱۸۔	امیدیں اور توقعات	۲۲۵

2600 سال پرانی ایرانی شہزادی کی پر اسرار ممّی

ترتیب : شائستہ جبیں عباسی

قدیم مصر کے اہراموں کا نام جب جب بھی آئے گا، تب تب مصریوں کے فنِ حنوط کاری (Art of Mummification) کا ذکر ضرور آئے گا۔ مصر اس کرۂ ارض پر واحد تہذیب تھی، جہاں پر مرنے کے بعد جسم کو محفوظ کرنے کے لئے باقاعدہ حنوط کاری کی جاتی تھی جس کے اثرات دیگر تہذیبوں پر بھی ہوئے۔ کوئٹہ سے بازیافت کی جانے والی ممّی کو قدیم ایران کی تہذیب سے منسلک کیا جارہا ہے جس کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ قدیم ایران میں زرتشت کے دور میں مردوں کو حنوط کرنے کا رواج تھا۔ تاہم مصری دنیا کی واحد قوم تھے جہاں ممیانے کا فن ان کے عقیدے اور مذہب کا حصہ تھا اور ان ہی سے یہ فن دیگر تہذیبوں میں منتقل ہوا۔ مصری موت کے بعد زندگی پر یقین رکھتے تھے، اس لئے وہ لاش کو ممی کر کے زروجواہر کے ساتھ دفناتے تھے۔ پاکستان میں بازیافت کی جانے والی ممی کے بارے میں ۲۶ اکتوبر ۲۰۰۰ کو کراچی پولیس اور قومی عجائب گھر کے عہدے داروں نے ممی کی دریافت کا اعلان باقاعدہ ایک پریس کانفرنس کے ذریعے کیا جس میں پولیس کے اعلیٰ نمائندوں کے ساتھ قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے محکمۂ آثارِ قدیمہ کے پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن دانی بھی موجود تھے۔ ممی کے بارے میں ابتدائی تحقیقات سے پتا چلا ہے کہ یہ ایک اٹھارہ سال کی شہزادی یا کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے والی لڑکی کی ممی ہے۔ ممی کا تابوت پرانی لکڑی کا بنا ہوا ہے جس پر زرتشتوں کے مقدس نشانات بنے ہوئے ہیں۔ یہ مقدس درخت اور مقدس پھولوں کی علامات کے نشانات ہیں۔ یہ تابوت ۱۹۶ سینٹی میٹر لمبا اور ۵۶ سینٹی میٹر اونچا ہے۔ تابوت کے اندر ایک چٹائی بچھی ہوئی ہے جس پر شہزادی کی ممی رکھی ہوئی ہے۔ ممی کو

محفوظ کرنے کے لئے اس پر گرینائٹ کی تہہ لگائی گئی ہے۔ اسے موم اور شہد کا آمیزہ لگا کر محفوظ کیا گیا ہے۔ ممی کو قدیم مصری انداز میں پٹیوں سے لپیٹا گیا ہے۔ ممی کے سر پر سات مقدس درختوں کا تاج ہے جسے چہرے کے اوپر اوڑھے ہوئے سنہرے ماسک کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ ماہرین کے مطابق سات درختوں سے سات مقدس آسمانوں کو ظاہر کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے زرتشتوں میں کئی مذہبی کہانیاں مشہور ہیں ممی کے سینے پر سونے کی پلیٹ لگی ہوئی ہے۔ جس پر تکونی (Cuniform) زبان میں تحریر موجود ہے۔ ماہرین کے مطابق اس میں شہزادی کے بارے میں تفصیلات درج ہیں۔

ممی کو دیکھنے کے بعد ذہن میں سب سے پہلا جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ کس کی ممی ہے؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے ماہرین اپنی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔

اس ممی کی اصل تاریخ کی تصدیق سونے کی پلیٹ پر لکھی تکونی تحریر کو پڑھنے کے بعد ہی کی جا سکتی ہے۔ ابتدائی تحقیقات سے جو معلومات ملی ہیں اس کے مطابق یہ ایک اٹھارہ سال کی شہزادی کی حنوط شدہ لاش ہے، جس کا نام کورالاگیان یا ٹنڈل گیان ہے۔ چھبیس سو سال پرانی اس ممی کا تعلق قدیم فارسی شاہی خاندان خمام النشیان سے تھا جہاں کا پہلا بادشاہ خرش الخبیر تھا۔

نیشنل میوزیم کراچی کی کیوریٹر ڈاکٹر اسماء ابراہیم نے ممی کے بارے میں ابتدائی معلومات فراہم کیں ان کے مطابق ''اندازاً اس ممی کا تعلق ۵۹۰۔۶۴۰ قبل مسیح کے زمانے سے لگتا ہے۔ یہ زمانہ سائرس اوّل اور اس کے بھائی آریارامس کے دورِ حکومت کا تھا۔ اس کے بھائی کے زمانے کی تختی اتفاقیہ طور پر ہمدان میں دریافت ہوئی ہے جس میں تکونی شکلیں بنی ہیں اور قدیم ایرانی تحریر لکھی ہوئی ہے۔ یہ تختی قدیم ترین چیز ہے اس سے ساتویں قبل مسیح میں ایرانی قبائل کی ترقی کا پتا چلتا ہے۔ ان کی تکونے حروف کی ابجد قدیم اشوریائی ابجد سے بہت زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ اس کی سلطنت کی حدود فارس سے لے کر بلوچستان تک وسیع تھی۔ دونوں بھائیوں کی حکومت میں قدیم عراق، شام، مصر، یونان اور موجودہ پاکستان کے کچھ حصے بھی شامل تھے۔ شہزادی کے سینے پر نصب سونے کی پلیٹ سائرس اعظم کے دور کی ملنے والی اسی پلیٹ سے مشابہت رکھتی ہے۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ اس پلیٹ کا کوئی تعلق اسی دور سے بنتا ہو اس بارے میں تکونی تحریر پڑھنے کے بعد ہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس ممی کو یا تو گیان، سرخ دہم، داؤدختر اور ہمدان کے علاقوں میں واقع مقبروں سے چوری کیا گیا ہے یا پھر اس کا تعلق خاران سے ہے جہاں زرتشت دور کے چند مقبرے موجود ہیں۔ لوگ مدفون قیمتی اشیاء کے لالچ میں ان مقبروں کی کھدائی بھی کرتے رہتے ہیں۔''

ممی کے لیبارٹری ٹیسٹ کے حوالے سے ڈاکٹر اسماء نے بتایا ''ہمارے میوزیم میں لیب ٹیسٹ کی جدید سہولتیں دستیاب نہیں ہیں۔ ہم اس سلسلے میں پوری کوشش کر رہے ہیں کہ ممی کا سی ٹی اسکین اور دوسرے ٹیسٹ کرائے جائیں فی الحال ممی کو باہر لے جانا ممکن نہیں۔ لاہور میں مکمل ٹیسٹ کی سہولتیں موجود ہیں مگر ہم وہاں بھی سیکورٹی کی وجہ سے ممی کو نہیں لے جا سکتے ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ یہاں رہ کر ہی اس کے تمام ٹیسٹ کئے جائیں۔ سونے کی پلیٹ پر ملنے والی تحریر کے لئے ہم نے اسلام آباد میں مصر کے سفارت کار سے بات کی ہے وہ ہمارے ساتھ تعاون کے لئے تیار ہیں، امید ہے کہ چند روز میں مزید حقائق سامنے آجائیں گے۔'' ممی کی شناخت کے حوالے سے ماہرین اپنے رائے ابھی ترتیب دے رہے ہیں۔ اس بارے میں احمد حسن دانی نے اخبار نویسوں سے گفتگو کے دوران بتایا کہ ''ممی کے

خدو خال دیکھنے سے تو یہ کسی مصری شہزادی کی حنوط شدہ لاش معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کے سینے پر نصب پلیٹ پر تحریر قدیم فارسی زبان میں ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کسی مصری شہزادی کو سائرس اعظم کے دور میں ایران لایا گیا ہوگا جہاں اس کی شادی ایران کے بادشاہ سے کر دی گئی ہو اور شہزادی کے مرنے کے بعد اسے مصری تہذیب کے مطابق حنوط کر دیا گیا ہو۔ حنوط شدہ لاشوں کا تصوّر مصر میں پایا جاتا ہے۔ جہاں اہم شخصیات اور شاہی خواتین کو مرنے کے بعد منجمد کرنے کا رواج تھا۔''

احمد حسن دانی نے اسے ایک انوکھی دریافت قرار دیتے ہوئے کہا کہ ''ابھی ممی کی اصلیت کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا ممکن نہیں۔ ممی کے چند حصوں کے کیمیکل ٹیسٹ کے بعد حقائق سامنے آجائیں گے جس سے ہمارے تمام سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔''

ڈاکٹر اسماء ابراہیم نے ''پراسرار ممی'' کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے کہا:

''حال ہی میں دریافت ہونے والی ممی کے بارے میں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ خاران (بلوچستان) سے دستیاب ہوئی ہے جو قدیم مصری طریقوں کے مطابق ایک دوہرے تابوت میں بند ہے جس کا اندرونی حصہ پتھر کا اور بیرونی حصہ لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ لکڑی کے تابوت پر موجود تمام آثار اور تصورات کا ایک مخصوص مذہبی اور معاشرتی پس منظر ہے۔ شہزادی کے سر پر موجود تاج، صنوبر کے سات پتوں پر مشتمل ہے جبکہ سونے سے بنا صنوبر کا ایک درخت شہزادی کے سینے پر نقش شدہ ہے۔ ممی کا جسم لینن کی پٹیوں میں لپٹا ہوا ہے اور اس کے ہاتھ اس کے سینے پر رکھے ہوئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کے جسم کو پہلے پتھر کے تابوت میں رکھا گیا تھا جس کے بعد پگھلے ہوئے موم میں شہد ملا کر تابوت کے اندرونی حصے کو لیپا گیا ہے۔ ممی پتھر کے تابوت کے ساتھ ایک چٹائی پر رکھی گئی ہے۔ جیسا کہ میں اپنی ابتدائی رپورٹ میں بیان کر چکی ہوں، ممی کی صورت میں ملنے والی اس شہزادی کا تعلق سائرس اوّل (۵۲۹۔۵۵۹) قبلِ مسیح کے خاندان سے ہے جو ایکیمنڈ خاندان کا بانی تھا۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں زیریکسز اوّل (۴۶۵ تا ۴۸۵) کی سلطنت کے، ہمدان اور پرسی پولس دو صدر مقامات تھے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ صرف قدیم مصری ہی ''ممی سازی'' کے فن سے واقفیت رکھتے تھے لیکن مشہور عالم یونانی مورخ ہیروڈوٹس نے اس واقعے کی تصدیق کی ہے کہ سائرس اوّل کے مقبرے میں سکندر اعظم نے اس کی حنوط شدہ لاش کو دیکھا تھا جو سونے سے بنے ہوئے ایک گدے پر رکھی ہوئی تھی۔

پتھر کے تابوت میں ممی کے سینے پر رکھی ہوئی پلیٹ پر کندہ عبارت کا تعلق زیریکسز کے دور سے ہے جس پر لکھا ہے ''میں، زیریکسز کی بیٹی ہوں جو ایک عظیم بادشاہ تھا! میں، رُوڈُونا (رودمنا) ہوں جس پر ''آہورامزدا'' کی عنایات ہیں جو میری حفاظت کرنے والا ہے۔'' تابوت کے بالائی حصے کے ڈھکنے پر بھی یہی عبارت درج ہے۔''۔ سوائے چند لفظوں کے تاہم اس کا نام رودونا اسی انداز سے لکھا ہوا ہے۔ اس ڈھکنے پر لکھی ہوئی دو عبارتوں کے اطراف میں دو سطروں میں، اوپر سے نیچے کی طرف، یہ دعائیہ عبارت تحریر ہے ''یہ سب آہورامزدا کا کرم اور مدد ہے جس کے زیرِ سایہ اس عظیم سلطنت کی تخلیق ہوئی۔ آہورامزدا ہمارا دوست اور محافظ ہے، جس نے اس سلطنت کو تخلیق کیا۔'' پتھر کے تابوت پر کندہ ہے ''رودونا کی حفاظت کر اور اس پر اپنی عنایات نازل فرما۔'' ممی کے سینے پر رکھی سونے کی پلیٹ پر درج ہے!! ''میں سائرس کی بیٹی

ہوں جو ایک عظیم بادشاہ تھا! میں ''رودوامنا'' ہوں۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ ممی کے نام میں مختلف عبارتوں میں تھوڑا سا فرق ہے جو غالباً کسی غلطی کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ قواعد کی بھی کچھ غلطیاں ہیں۔ تاہم یہ عبارتیں صحیح اور بامعنی ہیں، ایسا بالکل نہیں لگتا کہ کسی نے خود اسے لکھنے کی کوشش کی ہے، یا کسی نے دھوکا دینے کے لئے ایسا کیا ہے! ماسوائے چند قواعد کی غلطیوں کے اور اضافی الفاظ کے، یہ عبارتیں بالکل صحیح ہیں۔ ان کے متن میں پائی جانے والی غلطیاں کسی علاقائی اثر یا عبارت کے مکمل علم سے کسی ناواقفیت کا نتیجہ ہو سکتی ہیں۔ پھر بھی یہ غلطیاں معمولی نوعیت کی ہیں جن کی جانچ پڑتال کوئی ماہر ہی کر سکتا ہے ورنہ عام آدمی انہیں پڑھ کر کسی بھی صحیح یا غلط نتیجے پر پہنچ سکتا ہے۔ شہزادی کے تاج کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ شہر ہمدان کی ایک شاہی علامت تھی جس نے زریکسز کے عہدِ حکومت میں اہمیت حاصل کر لی تھی۔ صنوبر کا یہی درخت شہزادی کے سینے اور تابوت پر کندہ ہے۔ شہزادی کی ممی کی یہ دریافت بے حد اہم نوعیت کا ایسا واقعہ ہے جو ہمیں اس بات کا موقع فراہم کرتا ہے کہ ہم اکیمینیز کے دور میں ''ممی سازی'' کے فن اور سائنس کے بارے میں جان سکیں۔ اس دریافت نے ایک نئے باب کا در وا کر دیا ہے جس کے تحت ان دونوں علاقوں یعنی مصر اور ایران میں ''ممی سازی'' کے فن کا تقابلی مطالعہ اور جائزہ ممکن ہو سکے گا۔ اس سلسلے میں مطالعے اور تحقیق کو مزید وسعت دینے کی غرض سے سائنسی تحقیق اور چھان بین کا سلسلہ برابر جاری ہے اور متعلقہ شعبۂ آثارِ قدیمہ اس امکان پر بھی غور و خوض میں مصروف ہے کہ کسی ایسے غیر ملکی اسکالر کو بھی اس میں شریک کیا جائے جس نے حال ہی میں مصر میں ممی سازی کے فن پر تحقیقی کام کیا ہو۔ پاکستان قومی عجائب گھر کے حکام بھی دنیا بھر کے متعلقہ اداروں سے باہم رابطے میں ہیں۔ اگرچہ اس نو دریافت شدہ ممی کے زمانے کا تعین کیا جا چکا ہے تاہم ابھی سائنسی طور پر اس کے زمانے کا تعین ہونا باقی ہے جس کے لئے ایک طویل طریقۂ کار درکار ہوگا کیونکہ اس ممی کی حفاظت کی غرض سے بے انتہا احتیاط اور دیکھ بھال سے کام لینا اشد ضروری ہوگا تاکہ سائنسی تحقیق کے دوران اسے کسی بھی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچ سکے۔ چونکہ یہ ممی دستیاب ہونے کے بعد سے، مختلف قسم کی آب و ہوا اور موسموں سے گزر چکی ہے جس سے اس کی حفاظت کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ اسے بے احتیاطی کے ساتھ اٹھائے جانے سے بے شمار پیچیدگیاں بھی پیدا ہو گئی ہیں جنہیں دور کرنے کے لئے ممکنہ اقدامات کا جائزہ لیا جا رہا ہے اور اس ضمن میں تمام ضروری احتیاطی تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔ ممی کے نقوش اور جسم پر تبدیلیاں واقع ہوتی دکھائی دیتی ہیں جن کا سائنسی تجزیہ اور آزمائش ضروری ہے۔ ماہرِ آثارِ قدیمہ کی حیثیت سے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس سلسلے میں بھرپور اور مکمل ریسرچ کریں تاکہ کسی صحیح نتیجے پر پہنچ سکیں۔ ممی کو اس کی اصل حالت میں برقرار رکھنے کی غرض سے ہمیں بڑی احتیاط سے اس کی دیکھ بھال کرنا ہوگی تاکہ اسے مزید کوئی نقصان نہ پہنچ سکے۔ ابتدائی مطالعے نے اس ممی کی شخصیت اور زمانے کی شناخت کر دی ہے۔ اس سلسلے میں حاصل ہونے والے دیگر شواہد اس ابتدائی نتیجے کی مزید توثیق کر دیں گے۔ کاربن کے مستند ہونے کی تصدیق کے لئے بھی چودہ ٹیسٹ بنیادی اہمیت کے حامل ہیں اس سلسلے میں متعلقہ مواد کے مختلف نمونے تجزیے کے لئے دیئے جا چکے ہیں تاہم اس نوعیت کے نوادرات کے مستند ہونے کی تصدیق کے حوالے سے ہمیں غیر معمولی احتیاط سے کام لینا چاہئے تاوقتیکہ تقابلی اور متعلقہ مواد اور معلومات ہمیں حاصل نہ ہو جائیں۔ ممی کی اصلیت اور ندرت کی توثیق کے لئے ایکس

رے یا سی ٹی اسکین کیا جانا اشد ضروری اور لازمی ہے تاہم یہ خیال رکھنا ہوگا کہ اس عمل سے گزرتے ہوئے ممی کو کوئی ضرر یا نقصان ہرگز نہ پہنچے۔ اس ضمن میں ابتدائی احتیاطی تدابیر اختیار کی جاچکی ہیں اور تحقیق کے ساتھ ساتھ اس کی نمائش کی تیاریاں بھی جاری ہیں۔ موسم اور روشنی کی تبدیلیوں کے ساتھ فلیش گن کی مدد سے کھینچی جانے والی تصاویر بھی اس کے لئے نقصان کا موجب ہوسکتی ہیں۔ چنانچہ جب تک اس ضمن میں مخصوص نوعیت کا حفاظتی ساز و سامان دستیاب نہ ہو جائے ممی کو مستقل نوعیت کی رطوبت، حرارت اور روشنی میں رکھنا ضروری ہوگا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ممی کے جسم میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر بھی گہری نظر رکھی جارہی ہے کیونکہ اس معاملے میں بناوٹ کے امکان کو یکسر رد نہیں کیا جاسکتا۔

ممی کی قیمت

ماہرین کے مطابق ممی کی قیمت کا تعین کرنا ناممکن ہے، بیچنے والے نے اس کی قیمت 60 کروڑ روپے لگائی تھی اور 6 کروڑ کی آفر ملنے پر اسے فروخت کرنے سے انکار کردیا۔ ایک اطلاع کے مطابق فرانس کا ایک عجائب خانہ اس ممی کے عوض ایک ارب 10 کروڑ روپے دینے کو تیار ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جو چیز جتنی پرانی ہوتی ہے وہ اتنی ہی انمول ہو جاتی ہے اور انمول شئے کو بیچا نہیں جاتا بلکہ اسے محفوظ کرلیا جاتا ہے۔ یقیناً یہ شہزادی بھی کسی کے لئے انمول ہوگی کہ اس نے شہزادی کے مرنے کے بعد اسے دفنانے کے بجائے ممی کی صورت میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کرلیا ہے۔ اب یہ پاکستانی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس ممی کی حفاظت کا بھرپور انتظام کرے۔ بے شک یہ پاکستان کا قیمتی سرمایہ ہے۔ ممی کے قیمت کے حوالے سے ایک خبر یہ بھی سننے میں آئی ہے کہ مختلف انشورنس کمپنیوں نے میوزیم کے عملے سے ممی کا انشورنس کرانے کے لئے رابطے شروع کردیئے ہیں لیکن میوزیم حکام عام طور پر صرف ان ہی نوادر کا انشورنس کراتے ہیں جن کو نمائش کے لئے باہر لے جانا ہوتا ہے۔ کیونکہ یہاں تو ہر چیز کروڑوں روپے مالیت رکھتی ہے جس کے لئے بھاری پریمیم ادا کرنا عجائب گھر انتظامیہ کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔

وہ ممالک جہاں ممیاں دریافت ہوئی ہیں

۴۰۰ قبلِ مسیح میں مصریوں نے مردے کو حنوط کرنے کا عمل متعارف کرایا تھا اور دس سے سولہ برس قبل مسیح تک اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ حنوط کرنے کا سب سے تفصیلی اور مہنگا طریقہ باحیثیت لوگوں اور قیمتی جانوروں پر اپنایا جاتا تھا۔ گزشتہ صدیوں میں حنوط کی جانے والی بااثر شخصیات میں (۱) طوطامس، (۲) طوطامن آمخ، رامیس (۳) اور سیطی (۴) شامل ہیں۔ حنوط کرنے کا عمل قدیم ایتھوپینز، قدیم گوانا کو میں اور افریقا کے چند قدیم لوگوں نے اس طریقۂ کار کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ جزیرہ پیسینک میں بھی یہ طریقۂ کار اپنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ قدرتی طور پر حنوط کی ہوئی ممیاں مصر، شمالی امریکا، وسطی امریکا اور جنوبی امریکا میں ملی ہیں۔ اب تک دریافت ہونے والی سب سے قدیم مصری ممیاں ہیں جو ۲۵۰۰ قبل مسیح کی ہیں اور بالکل صحیح حالت میں موجود ہیں۔ چند افریقی قبیلوں کے ساتھ سوڈان، کانگو، مڈغاسکر اور آئیوری کوسٹ کے خطے میں ہیں، آسٹریلیا میں کچھ قبیلوں نے اس طریقۂ کار کو اپنایا ہے۔ ٹورس ٹریس جزیرے میں ایسی ممیاں ملی ہیں جو بالکل سیدھی کھڑی ہوئی ہیں جنہیں اسی حالت میں نمائش کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ مارکوئس میں ایسی لاشیں ملی ہیں جو سورج کی تپش میں خشک ہوگئی تھیں اور ان پر گوشت اور

جلد کا نام ونشان نہیں ہے۔ جنوبی امریکا میں آروکاس، پیرو ویان اور کوچوا نامی قبیلوں میں روایتی طور پر مردوں کو حنوط کرنے کا رواج تھا۔ اینڈیز کے دامنِ کوہ سے تعلق رکھنے والے جیوارو نامی قوم کے لوگ مردے کے دماغ کے نرم حصے کو خشک ہوا اور تپش کے ذریعے اس طرح محفوظ کرتے تھے کہ وہ سکڑ کر ٹینس بال کی شکل اختیار کر لیتا تھا صرف چہرے کے خدوخال باقی رہ جاتے تھے سیبیا (Cibcia) کے لوگ اپنے سرداروں کی لاشوں کو محفوظ کرنے کے لئے مردے کے جسم کھوکھلا کر کے اس میں چیڑ کا گوند بھر دیتے تھے، اس کے بعد مردے کو غار میں رکھ دیا جاتا تھا اور جنگ کے زمانے میں وہ اس مردے کو اپنے ساتھ میدان جنگ لے جاتے تھے۔ ''ان کاس'' اپنے مردے کو کفن میں لپیٹنے سے قبل اسے نیا سوٹ پہناتے تھے بعد ازاں اسے ۸۴ فٹ لمبے اور ۱۳ فٹ چوڑے کفن میں لپیٹ دیا جاتا تھا۔ ممی کے اس بنڈل کے اوپری حصے پر ایک ڈیزائن بنا ہوا باکس لگا دیا جاتا تھا۔ یہ لوگ مردے کے جسم پر کوئی خاص مسالا نہیں لگاتے تھے۔ البتہ جسم کو اندر سے خالی کر کے سورج کی روشنی میں سکھا لیا جاتا تھا۔

قدیم بلوچستان کے لئے کہا جاتا ہے کہ یہ علاقہ بازنطینی تہذیب کی ایک ضمنی شاخ تھا۔ بازنطینی تہذیب پر قدیم روم اور یونان ہی کے اثرات تھے جن کی وجہ سے اس کا مرکز عراق سے ملحقہ علاقے تھے جہاں سے ترکی کے پاس سے یورپ قریب تھا اور خاص طور پر روم اور یونان بہت قریب تھے۔ تجارت نے ان دونوں ممالک کو بازنطینی سلطنت کے مزید قریب کر دیا تھا۔ جس کے باعث پہلے عہد نامے سمیت علم و دانش اور فلسفے کی تمام اہم کتابیں یونان کے راستے سے بازنطینی سلطنت تک پہنچ چکی تھیں۔ اس بازنطینی سلطنت ہی نے دنیا کو پہلی مہذب قانونی دستاویز ''حمورابی کا قانون'' دیا تھا۔ بازنطینی تہذیب کے لئے کہا جاتا ہے کہ یہ کئی حوالوں سے مصر کی قدیم تہذیب کے ساتھ وابستہ تھی۔ اس ضمن میں کون سی رائے درست ہے اور کون سی فقط اندازوں پر مبنی ہے اس کے بارے میں تاریخ اور آرکیالوجی کے ماہرین کو حتمی فیصلے دینے ہیں۔ اس لئے مذکورہ بالا آراء ابھی تک ثبوت کی متقاضی ہیں۔ قدیم بلوچستان کی مقابلتاً مستند تاریخ لکھنے والے گل خان نصیر نے اپنی ایک کتاب میں اس بات کو رد کیا ہے کہ بلوچ عربوں کی اولاد ہیں۔ گل خان نصیر نے رائے ظاہر کی ہے کہ یہ یا تو فرعون یا پھر نمرود کا تسلسل ہے۔ تین دہائی قبل گل خان نصیر کی دی گئی اس رائے پر ابھی تک سخت تنقید کی جاتی رہی ہے مگر اب جب کہ بلوچستان سے ملحقہ ایرانی بلوچستان سے ایک شہزادی کی ممی دریافت ہوئی ہے تو کیا اس امکان اور رائے کے بارے میں چھان بین نہیں کر سکتے کہ ہو سکتا ہے کہ ہزاروں برس قبل بازنطینی سلطنت اور اسکی بلوچستان جیسی ضمنی تہذیبوں میں موجود پہاڑوں میں کہیں پر اہرام بھی پائے جاتے ہوں۔ اس سوال پر کوئی غور نہیں کر رہا بلکہ اصرار ہر بار مصر پر ہے جیسا کہ ماہر آثارِ قدیمہ پروفیسر احمد حسن دانی نے کہا ہے کہ ممیز صرف مصر میں ہوتی ہیں اور جو دوسرے ماہرین اس کا ماخذ (Origin) ایران یا افغانستان میں ڈھونڈ رہے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ ممی پر موجود نقش کاری کی بنیاد پر اس کا ماخذ تلاش کرنا غلط ہے کیونکہ جس کسی کی تحویل میں ممی ہوگی وہ بھی اسے نقش بنا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایرانی شہزادی کی ممیِ زمانۂ قدیم میں مصر سے چوری کی گئی ہو اور وہ مختلف ہاتھوں سے ہوتی ہوئی عراق اور پھر ایران جا پہنچی ہو۔ ممی کی قدامت کے بارے میں ابھی درست اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تاہم مصر میں ممیاں ۴۰۰۰ اور ۶۰۰۰ قبل مسیح کے دوران تیار کی گئیں اور وقت کے اتنے زیادہ فرق کے باعث یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ پاکستان میں جو ممی ملی ہے وہ کس زمانے کی ہے۔ حتمی تحقیقات کے بعد اصل صورتحال سامنے آجائے گی۔

قدیم مصر اور فرعونوں کی سلطنت

ترتیب : سلیم انور عباسی

اس سے پہلے کہ ہم اہرام مصر کی پراسرار دنیا میں داخل ہوں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مملکت اور اس کے فرعونوں سے ملاقات کرتے چلیں جنہوں نے دنیا کے یہ عجوبے بنائے اور عقلِ انسانی تادمِ تحریر حیران و پریشان ہے کہ غزہ کے مقام پر موجود تین عظیم اہرام اتنے بھاری بھر کم پتھروں سے لق و دق صحراؤں میں کیسے بنائے گئے اور وہ کونسی ٹیکنالوجی تھی جس کو استعمال کرتے ہوئے انہوں نے یہ عظیم مقابر بنائے اور جن کی دیواروں پر تحریر کردہ پیشن گوئیاں تقریباً ۱۰۰ فیصد درست ثابت ہوئیں۔

مصر کا سرکاری نام جمہوریہ مصر العربیہ ہے جو ۳۸۶،۶۵۰ مربع میل رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ ٹیکساس، اوکلاہوما اور آرکنساس کو ملا کر اس کا کل رقبہ بنتا ہے۔ دارالحکومت قاہرہ ہے۔ یہ ملک براعظم افریقہ کے شمالی کونے اور جنوب مغربی ایشیاء میں جزیرہ نمائے سینائی پر مشتمل ہے۔ اس کے شمال میں بحیرۂ روم، مشرق میں بحیرۂ قلزم اور خلیج سوئیز اور خلیج عقبہ کے دوبازو ہیں۔ جنوب میں سوڈان، مغرب میں لیبیا اور مشرق میں اسرائیل کے ممالک ہیں اور یہ ان تین ممالک کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ ۱۹۴۹ء کے ایک معاہدے کی رو سے فلسطین کے جنوب مغرب میں غزہ کی ۲۸ میل چوڑی ساحلی پٹی مصر کو دے دی گئی۔ مصر دراصل ایک صحرائی علاقہ ہے اور ۹۰ فیصد خطہ صحرا پر مشتمل ہے، اس لئے اسے "سرخ سرزمین" بھی کہتے ہیں، جسے دریائے نیل دو حصوں مشرقی اور مغربی صحرا میں تقسیم کرتا ہے۔ مصر کو دریائے نیل کا تحفہ کہا جاتا ہے کیونکہ اگر یہ دریا نہ ہوتا تو مصریوں کا پنپنا ناممکن تھا اور قدیم مصر کی عظیم سلطنت اسی دریائے نیل کی مرہون منت ہے۔ نیل کا پانی مصریوں کے لئے آبِ بقا سے کم نہیں ہے کیونکہ اس خطے میں بارش نہیں ہوتی اور لوگوں کی زندگی کا دارومدار اسی دریا پر ہے۔ وہ اسی دریا کا پانی پیتے ہیں، یہی دریا ان کی زمینوں کو زرخیز بناتا ہے اور زراعت کے لئے بھی اسی پر انحصار ہے۔ ساتھ ہی ان کی نقل و حرکت کے لئے سب سے آسان ذریعہ بھی یہی ہے۔ اگر یہ دریا سوکھ جائے تو مصریوں کے لئے جینا محال ہو جائے۔ دوسرے ملکوں میں تو عام طور پر دو بڑے دریا اور کئی چھوٹی چھوٹی باج گزار ندیاں ہوتی ہیں لیکن مصر کا واحد دریا نیل ہے۔ واضح رہے کہ دنیا کی عظیم تہذیبوں کا نزول دریا کے کناروں پر ہوا۔ سب سے پہلی تہذیب قدیم عراق میسوپوٹیمیا (عراق کا قدیم نام) کی وادیٔ دجلہ و فرات تھی جو تین ہزار سال سے زائد عرصے تک زندہ رہی۔ اس کے بعد مصر کی تہذیب سامنے آئی، جسے مورخ "وادیٔ نیل" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اسی طرح پاک و ہند کی تہذیب "وادیٔ سندھ" کہلاتی ہے، جو دریائے سندھ کے قریب پھلی پھولی۔ نیل، دجلہ و فرات کے برعکس بڑا شائستہ، قابلِ اعتبار اور نرم رو دریا ہے۔ اگست کے مہینے میں جب وسطی افریقہ کے پہاڑوں پر بارش ہوتی ہے تو دریا آہستہ آہستہ چڑھنے لگتا ہے۔ بارش کا یہ پانی یکم ستمبر کو اسوان پہنچتا ہے اور یکم اکتوبر کو قاہرہ اور کیا مجال ہے جو ان معمولات میں کوئی فرق آجائے اور اگر فرق آجائے تو ملک میں قحط پڑ جاتا ہے جس طرح حضرت یوسفؑ کے عہد میں ہوا تھا۔ سیلاب آتا ہے تو دریائے نیل کی ساحلی زمین میلوں تک پانی سے ڈھک جاتی ہے۔ دو تین ماہ کے بعد جب دریا اترتا ہے تو زمین پر اپنے پیچھے

مٹی کی نہایت زرخیز ایک تہہ چھوڑ جاتا ہے۔ کسان اسی زمین پر کاشت کرتے ہیں۔ ملک کا بقیہ ۹۰ فیصد علاقہ بے آب وگیاہ ریگستان ہے۔ چنانچہ آج بھی مصر کے ۹۹ فیصد باشندے دریا کے کنارے کنارے آباد ہیں۔ مصر کے لوگ اس دریا کی فیض رسانیوں کا جتنا احسان مانیں کم ہے۔ وہ اگر ابتداء میں دریا کے بہاؤ کی سمت منہ کر کے عبادت کرتے تھے تو ہمیں حیرت نہیں ہونی چاہیئے کہ یہی دریا ان کے رزق کا وسیلہ تھا۔

دریائے نیل کی پابندیٔ اوقات کی بدولت انسان کو تقویم سازی کا ہنر ہاتھ آیا اور اہلِ مصر نے ۴۲۴۱ قبل مسیح میں دنیا کا پہلا کلینڈر بنایا۔ اس وقت وہاں کے نجومی اپنے مشاہدے کی بناء پر اس نتیجے پر پہنچے کہ ستارہ شعرائے یمانی (Sirius) ہر سال طلوعِ آفتاب سے ذرا پہلے ٹھیک اسی افق پر نمودار ہوتا ہے جس دن سیلاب شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے سال کو ۳۶۵ دن اور تیس تیس دن کے بارہ مہینوں میں تقسیم کیا اور جو پانچ دن بچ رہے، ان کو "جشنِ نوروز" کے لئے مخصوص کردیا۔ ستارہ شعرائے یمانی کو انہوں نے افزائش و محبت کی دیوی است سے' دریائے نیل کے پانی کو اس کے مقتول شوہر اوسیرس کے خون سے اور سیلاب کو است کے آنسوؤں سے تعبیر کیا۔

مصریوں کا نیا سال ۱۹ جولائی سے شروع ہوتا تھا کہ اس ستارے کا یومِ طلوع وہی تھا اور اسی دن سیلاب کا آغاز ہوتا تھا۔ نئے سال کی رسومات کی تفصیل فرعون رعمیس سوم کے مندر کی دیواروں پر اب تک موجود ہیں۔ یہ تہوار پورے ملک میں منایا جاتا تھا۔ قدیم مصر کی تہذیب کی کونپل ۳۰۰۰ قبل مسیح میں کھلنی شروع ہوئی کہ جب فلسطین' شام اور نوبیا سے خانہ بدوش یہاں آکر آباد ہوئے اور دریائے نیل کی اٹھلاتی موجوں کا نظارہ کر کے ایسے فریفتہ ہوئے کہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ یوں وادیٔ دجلہ و فرات کی عظیم تہذیب میسوپوٹیمیا سے مصر میں اکتساب اور فیض علم کی شمع فروزاں ہوئی۔ اس لئے کہ مصر کے ابتدائی آرٹ کے نمونوں پر ہمیں قدیم عراقی تہذیب کی شباہتیں ملتی ہیں۔ پتھر کی منقش تصویریں اور تصویری رسم الخط ہیرو غلافی سمیری رسم الخط کی ترقی یافتہ صورت ہے، اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سمیریوں اور مصریوں کے مابین تجارتی و ثقافتی مراسم تھے۔ وادیٔ نیل کی اپنی الگ اختراعی کاوش دریائے نیل کی وجہ سے ممکن ہو سکی۔ ۴۰۰۰ قبلِ مسیح میں انہوں نے سیلاب کو روکنے کے لئے بند باندھنے شروع کئے۔ ذرا پانچ ہزار قبل مسیح کی تاریخ ملاحظہ کیجئے۔ یہاں پر آپ کو پتھر کے زمانے کے آخری حیتی لوگوں کا گروہ نظر آئے گا جو باضابطہ طور نیل کے جنوب میں بالائی مصر میں آکر بس گیا۔ یہ لوگ شکار کیا کرتے، مچھلیاں پکڑتے اور کھیتی باڑی کیا کرتے وہ گول سی چھوٹی جھونپڑیاں بنا کر رہتے اور ہر ایک قبیلے کا اپنا اپنا الگ گاؤں تھا۔ اور ہر قبیلے کے اپنے اپنے جانوروں کی علامات یا ٹوٹم تھیں، جن کو وہ اپنے برتنوں پر بھی نقش کیا کرتے تھے۔ یہ پہلی سیاسی تنظیم تھی جو آگے بڑھ کر ہر قبیلے کے سردار کی حیثیت میں سامنے آئی جس کے احکام کی تکمیل کرنے کے لئے قبیلے کے لوگ دل و جان سے حاضر رہتے۔ جانوروں کی علامات دیوی اور دیوتاؤں کے نام منسوب تھیں اور یہی مصری مذہب کی ابتدائی شکل تھی۔ پورے ملک میں چھوٹی چھوٹی آزاد قبائلی ریاستیں تھیں اور ہر ریاست کا اپنا الگ سربراہ ہوتا تھا اور اپنے اپنے دیوی دیوتا۔ ماہرِ بشریات فریزر لکھتا ہے "ٹوٹم وہ مادی اشیاء تھیں جن کو وحشی انسان بڑے ادب و احترام سے دیکھتا ہے اور یہ یقین کرتا ہے کہ اس میں اور اس مخصوص شئے کے درمیان ایک دوستانہ ربط ہوتا ہے۔ مثلاً کسی پرانی قوم کا ٹوٹم مور ہوتا تھا، کسی کا خرگوش، کسی کا گھڑیال، کسی کا بیل، کسی کا باز، کسی کا ہرن، کسی کا دریائی گھوڑا، کسی کا کتا، کسی کا سانپ، کسی کا بچھو، کسی کا گائے، کسی کا بھیڑیا، کسی کا گینڈا اور کسی کا شیر۔ ان قوموں کی شناخت ان کے ٹوٹم کی علامات سے ہوتی تھی اور یہی ٹوٹم ان کی ذات بن جاتے تھے اور یہیں سے مصری مذہب کی

تشکیل ہوئی جس کا سراغ ہمیں پیپرس پر رقم ملا ہے، بلکہ مقبروں اور مندروں کی دیواروں، تابوتوں، ستونوں، پتھروں اور مجسموں پر بھی کندہ صورت میں دستیاب ہوا ہے۔ مصری مذہب کی معلوم تاریخ تقریباً چار ہزار قبل مسیح یعنی اب سے چھ ہزار سال قبل سے لے کر ۶۰۰ء تک پھیلی ہوئی ہے۔ بیلوں، گایوں، گیدڑوں اور دوسرے جانوروں کی لاشیں بڑی احتیاط سے دفنائی ہوئی ملی ہیں۔ ان شواہد سے پتا چلتا ہے کہ چھ ہزار برس قبل مصر میں جانوروں کی پرستش بھی ہو رہی تھی اور ہر قبیلے کا ٹوٹم الگ الگ تھا۔ پھر پہلے خاندان کے بانی نارمر نے شمالی اور جنوبی مصر کو ایک پرچم تلے متحد کیا اس اتحاد کے وقت وہاں جو مذہبی عقائد اور تصورات مروج تھے وہ اس سے بھی بہت پہلے کے مذہبی عقائد سے ماخوذ تھے یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں مصری تاریخ کے ابتدائی باشندے پتھروں، پہاڑوں، درختوں، چوپایوں' پرندوں، رینگنے والے جانوروں، مچھلیوں اور دوسری اشیاء کے علاوہ اپنے آباؤ اجداد کی ارواح کو بھی پوجتے تھے۔ یہیں سے حیات بعد الموت کا نظریہ سامنے آیا اور لاشوں کو محفوظ کرنے کے لئے حنوط کاری کے فن نے اپنی مجسم شکل نکالنی شروع کی اور ان لاشوں کو زروجواہر کے ساتھ دفن کرنے کے بعد اہرام مصر بنائے گئے جو آج کے ترقی یافتہ انسان کے لئے حیرت واستعجاب کا باعث ہیں۔

مصر کی ابتدائی سلطنتیں شہری ریاستوں پر مبنی نہیں تھیں بلکہ اپنے اپنے قبیلے کے سربراہ اس مملکت کے بادشاہ تھے اور یہ ریاستیں زراعتی مارکیٹ پر مبنی ہوتی تھیں جہاں پر کسانوں اور تاجروں کے گروہ رہا کرتے تھے اور آپس میں تجارتی مفادات کے باعث چپقلش بھی ہوا کرتی تھی اور زیادہ تر وہی شخص طاقتور ہوتا تھا جو بہت بڑا زمیندار ہوتا تھا۔ ۳۲۰۰ قبل مسیح سے پہلے کے بالائی وزیریں مصر کے بادشاہوں کے بارے میں ہمارے پاس کم معلومات ہیں۔ تاہم یہ وہ دور تھا جب مصریوں نے تحریری ریکارڈ رکھنا شروع کیا تھا، مگر ایک بات ذہن میں رہے کہ مصریوں نے پہلے پہل یادگاروں اور تختیوں پر اپنی بقاء کے بارے میں ریکارڈ رکھنا شروع کیا تھا مگر ان میں انتظامی و معاشی امور کا تذکرہ نہیں تھا۔

"مصر کا قدیم ادب" میں جناب ابن حنیف نے مصر کے قدیم تاریخی ادوار اور فراعنہ کو کچھ یوں سمیٹا ہے

"تاریخی دور کے آغاز سے قبل مصر بہت سارے مقامی حکمرانوں کے زیر اقتدار چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ بالائی یعنی جنوبی اور زیریں یعنی شمالی علاقوں پر مشتمل متحدہ مصر کا پہلا تاریخی حکمران یا فرعون (منا۔ منی) تھا۔ مصر کی ایک قدیم مہر اور ایک زیور پر اس پہلے فرعون کا پورا نام "نار مرمینا" لکھا ہوا ہے۔ اس نے ۳۱۰۰ء قبل مسیح کے لگ بھگ اب سے کوئی پانچ ہزار برس پہلے مختلف ننھی منی مقامی ریاستوں کو زیر اور ختم کر کے بالائی اور زیریں مصر پر مشتمل پورے ملک کو سیاسی وحدت کی لڑی میں پہلی مرتبہ پرو دینے کا کارنامہ انجام دیا اور اس طرح اس نے مصری بادشاہوں یا فراعنہ کے تیس خاندانوں کے طویل سلسلے کا آغاز کیا۔ فرعونوں کے ان تیس خاندانوں نے ۳۱۰۰ قبل مسیح سے لے کر سکندر یونانی کے حملۂ مصر ۳۳۲ ق م تک یعنی تقریباً پانچ ہزار برس قبل سے لے کر کوئی سوا دو ہزار برس پہلے تک تین ہزار برس حکومت کی۔ پہلے فرعون مینا (منا۔ منی) کو مصریوں نے نارمر، حور نارمر اور نارمرزا بھی کہا۔ یونانیوں اور رومیوں نے مصری نام مینا (منا) کو من، منز، منس، منیاس اور منرس وغیرہ ناموں سے پکارا۔ بہر حال مصری تاریخ میں متحدہ مصر اور فراعنہ کے پہلے خاندان کی بنیاد رکھتے ہوئے مینا (نار مرمینا) نے فرعونوں کے تیس خاندانوں کے طویل سلسلے کا آغاز کیا اور بالآخر یہ سلسلہ سکندرِ اعظم کی کامران تلوار کی وجہ سے ختم ہوا۔ مختلف قدیم تمدنی ادوار کی رو سے مصری "تاریخ" کی تقسیم اس

طرح کی جا سکتی ہے۔

۱۔ قدیم عہد حجریہ کا اختتام.... قریباً ۱۰۰۰۰ق۔م
۲۔ فیوم اور مری مدہ سلامہ تمدن (جدید عہد حجریہ)..... قریباً ۵۵۰۰ق.م
۳۔ بالائی اور زیریں مصر کی آزادانہ حکومتیں ۴۵۰۰/۳۱۰۰ق.م
۴۔ تاسائی اور بداری تمدن (جدید عہد حجریہ اور برانزدور).... ۴۵۰۰ق.م
۵۔ تقویم کا آغاز ۴۲۴۱ق.م
۶۔ عراق (سومیری) اثر ۳۲۵۰ق.م
۷۔ بالائی اور زیریں مصر کی متحدہ بادشاہت کا آغاز ۳۱۰۰ق.م

محققین نے مختلف سہولتوں کے پیش نظر قدیم مصری تاریخ یعنی فرعونوں کے تیس خاندانوں کے تین ہزار برس پر مشتمل عرصۂ حکومت (۳۱۰۰/۳۳۲ق۔م) کو سیاسی آغاز، عروج اور زوال کے لحاظ سے سات بڑے ادوار پر تقسیم کیا ہے۔

۱۔ دور قدیم یا تنی عہد۔ (۳۱۰۰۔۲۶۸۶ق۔م)
۲۔ قدیم بادشاہت۔ (۲۶۸۶۔۲۱۸۱ق۔م)
۳۔ پہلا دورِ زوال یا انتشار (۲۱۸۱۔۲۰۴۰ق۔م)
۴۔ وسطی بادشاہت (۲۱۳۳۔۱۷۸۶ق۔م)
۵۔ دوسرا دورِ زوال یا انتشار (۱۷۸۶۔۱۵۸۰ق۔م)
۶۔ شہنشاہیت یا جدید شہنشاہیت (۱۵۷۵۔۱۰۸۷ق۔م)
۷۔ دورِ متاخر یا بعد از شہنشاہی دور' (۱۰۹۰۔۶۶۳ق۔م)

یہ تقسیم کئی لحاظ سے مفید ہونے کے ساتھ ساتھ یوں بھی بڑی سود مند ہے کہ اس سے مصریوں کے مذہب، ادب اور آرٹ کے مختلف ادوار سے متعلقہ خصوصیات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ قدیم مصری تاریخ کے ان اہم اور دوسرے ادوار اور فراعنہ کے خاندانوں کے عرصۂ حکومت کا یہاں ذرا تفصیل سے ذکر ضروری ہے۔ جملہ ادوار کے لحاظ سے قبل از تاریخ اور قدیم تاریخ مصر کی تقسیم اس طرح ہے۔

"قبل از تاریخ یا قبل از بادشاہت"(PREHISTORY OR PREDYNASIC PERIOD)
۵۰۰۰۔۳۱۰۰ق۔م

۱۔ اسی دور میں یعنی تقریباً ۴۵۰۰ قبل مسیح سے لے کر ۳۱۰۰ قبل مسیح تک بالائی (جنوبی) اور زیریں (شمالی۔ڈیلٹائی) مصر میں چھوٹے چھوٹے حکمرانوں نے اپنی آزاد ریاستیں قائم کر رکھی تھیں اور "متاخر زمانۂ حجریہ" (۵۰۰۰۔۴۵۰۰ق۔م LATE NEOLITHIC AGE) میں بھی جگہ جگہ مقامی قبائل برسرِ اقتدار تھے۔ مصر میں "قدیم زمانۂ حجریہ"(PALAEOLITHIC AGE) کوئی دس ہزار سال قبل مسیح یعنی اب سے بارہ ہزار سال پہلے ختم ہوا تھا۔

۲۔ "دورِ قدیم یا تنی عہد"—— (ARCHAIC OR THINITE PERIOD)
۳۱۰۰۔۲۶۸۶ق۔م یہ عہد فراعنہ کے پہلے اور دوسرے خاندان پر مشتمل تھا۔

۳۔ قدیم بادشاہت ـــــــــ (OLD KINGDOM) ۲۶۸۶۔۲۱۸۱ق۔م اس دور میں تیسرا، چوتھا، پانچواں اور چھٹا خاندان شامل تھا۔

۴۔ "پہلا دور انتشار یا زوال" (FIRST INTERMEDIATE PERIOD) ۲۱۸۱۔۲۰۴۰ق۔م یہ عہد ساتویں، آٹھویں، نویں اور دسویں خاندان پر مشتمل تھا۔

۵۔ "وسطی بادشاہت" ـــــــ (MIDDLE KINGDOM) ۲۱۳۳۔۱۷۸۶ق۔م "وسطی بادشاہت" کا دور گیارہویں اور بارہویں خاندان پر محیط تھا اور بعض محققین تیرہواں خاندان بھی اس میں شامل کرتے ہیں۔

۶۔ "دوسرا دور انتشار یا زوال" (SECOND INTERMEDIATE PERIOD) ۱۷۸۶۔۱۵۷۵ ق۔م اس دور میں تیرہواں، چودھواں، پندرہواں، سولھواں اور سترہواں خاندان شامل تھا۔

۷۔ "دور شہنشاہیت" یا جدید شہنشاہیت" (EMPIRE OR NEW EMPIRE) ۱۵۷۵/۱۰۸۷ق.م "جدید شہنشاہیت" یا "دورِ شہنشاہیت" اٹھارہویں، انیسویں اور بیسویں خاندان پر مبنی تھا۔

۸۔ "دور متاخر یا بعد از شہنشاہیت" (LATE OR POST- EMPIRE PERIOD) ۱۰۹۰/۶۶۳ ق.م اس عہد میں اکیسویں، بائیسویں، تئیسویں، چوبیسویں اور پچیسویں خاندان کی حکومتیں رہیں۔

۹۔ "سئیس دور" (SAITE PERIOD) ۶۶۳/۵۲۵ق.م یہ دور حکومت صرف ۲۶ ویں خاندان کے عہد پر مشتمل تھا۔ جس کا دارالحکومت سئیس تھا۔ یہ شہر مغربی ڈیلٹائی علاقے میں واقع تھا، آج کل اس جگہ کا نام ساء الحجر ہے۔

۱۰۔ "ایرانی بالادستی" (PERSIAN PERIOD) ۵۲۵/۳۳۲ق.م ستائیسویں، اٹھائیسویں، انتیسویں اور تیسویں خاندان کا عہد ایرانی بالادستی کا زمانہ تھا۔

۱۱۔ "یونانی دور" (GREEK PERIOD) ۳۳۲/۳۰ق.م

۱۲۔ "رومی دور" (ROMAN PERIOD) ۳۰/۶۴۰ق.م

۱۳۔ "اسلامی دور" ۶۴۰ء سے شروع

۳۴۳ قبل مسیح میں ایرانیوں نے مصر کو پھر فتح کرلیا۔ ۳۳۲ قبل مسیح سکندر اعظم نے مصر کو فتح کیا اور یوں وہاں یونانی نژاد بطلیموسی خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔ بعض مؤرخین نے اسے مصر کا اکتیسواں خاندان قرار دیا ہے جس نے ۳۰ قبل مسیح تک حکومت کی۔ قلوپطرہ اسی یونانی بطلیموسی خاندان کی ملکہ تھی۔ قلوپطرہ کے زمانے میں مصر روم (اٹلی) کے قبضے میں چلا گیا۔ رومیوں کے بعد وہاں حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے دور میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی۔

فنِ تحریر، ادب، آرٹ اور مصوری کی ایجاد تخلیق، ارتقاء اور عروج کے لحاظ سے مصری تاریخ کے "دور قدیم یا تنی عہد"، قدیم بادشاہت، پہلے دور انتشار یا زوال، وسطی بادشاہت، دوسرے دور انتشار یا زوال اور جدید شہنشاہیت کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

"دور قدیم یا تنی عہد": یہ عہد ۳۱۰۰ق.م سے لے کر ۲۶۸۶ق.م تک پہلے دو خاندانوں پر مشتمل تھا۔ ان فرعونوں کے دارالحکومت کا نام "تنی" تھا۔ اسی لئے یہ زمانہ "تنی یا تھنی عہد" کہلاتا ہے۔ "تنی" کو یونانی تھس (This) اور تھن (Thin) کہتے تھے۔ پہلے خاندان کے بانی فرعون مینا (منا، منی) نے بالائی اور زیریں مصر کو متحد

کر کے پورے ملک پر حکومت کی۔

قدیم بادشاہت : ۲۶۸۶ق.م سے لے کر ۲۱۸۱ق.م تک تیسرے، چوتھے، پانچویں اور چھٹے خاندانوں پر مشتمل امن اور شان و شوکت کا یہ زمانہ پانچ صدیوں پر مشتمل تھا۔ مصری اس وقت ہر گوشے میں ترقی کر رہے تھے۔ خصوصاً آرٹ کو تو قابلِ رشک حد تک فروغ حاصل ہوا۔ مجسمہ سازی اس کمال کو پہنچی کہ بعد کے زمانے اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر رہ گئے۔ اہرام اسی زمانے میں بنے جو فنِ تعمیر کے لحاظ سے چوتھے خاندان کے فراعنہ خُوفُو (خُوف دی۔ یونانی تلفظ چیوپس) خفرا (خاف را۔ یونانی تلفظ چفرن) اور منقورا (یونانی تلفظ منکرس) کے عہد میں انتہا کو چلے گئے۔ قاہرہ کے نزدیک غزہ (جیزہ) کے تین سب سے بڑے ہرم مذکورہ تینوں فراعنہ کے ہی بنوائے ہوئے ہیں۔

پہلا دورِ انتشار : ساتویں، آٹھویں، نویں اور دسویں شاہی خاندان کے عرصۂ حکومت (۲۱۸۱ / ۲۰۴۰ق.م) کے دوران مصر برسوں تک جمود اور سیاسی تنزل کی گہرائیوں میں ڈوبا رہا تاہم اس پر آشوب دور کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس وقت اعلیٰ پائے کا ادب وافر مقدار میں تخلیق ہوا۔

وسطی بادشاہت : فراعنہ کے گیارھویں اور بارھویں خاندانوں کے دور (۲۱۳۳ / ۱۷۸۶ق.م) میں حکمرانوں نے دارالحکومت منِ نوفر (یونانی تلفظ ممفس) کی بجائے جنوب کی طرف ساڑھے چار سو میل کے فاصلے پر "تپے" (یونانی تلفظ تھیبائی یا تھیبس) کو اپنا صدر مقام بنالیا۔

قدیم بادشاہت کے بعد کے پہلے دورِ انتشار یا زوال کی پیدا کردہ طوائف الملوکی ختم کر کے انتف (ان یو تف) نامی ایک سردار نے فرعون بن کر گیارھویں خاندان کی بنیاد ڈالی۔ یہ فرعون انتف اول تھا۔ اس تابناک دور کے بادشاہوں نے فیوم کے علاقے میں آبپاشی کے لئے بڑے بڑے بند بنوائے۔ انہی فرمانرواؤں نے مصری تاریخ کے سب سے بڑے مندر کی تعمیر شروع کی۔ اس مندر کا مصری نام "اپت اسوت" تھا۔ آمن دیوتا کا یہ رفیع الشان مندر آج کل "کرنک" کا مندر کہلاتا ہے۔ اس زمانے میں نہ صرف ادب بلکہ مصریوں نے ہر لحاظ سے خوب ترقی کی۔

دوسرا دورِ انتشار : چودھویں، پندرھویں، سولھویں اور سترھویں خاندانوں کا یہ عہد (۱۷۸۶ / ۱۵۷۵ق.م) مصری تاریخ کا ایک تاریک باب کہا جاسکتا ہے۔ تیرھویں اور چودھویں خاندان کے زمانے میں مصر فوری طور پر زوال کی لپیٹ میں آگیا۔ غیر ملکی (ایشیائی) فاتحین نے مصر پر کامیاب یلغار کر کے اپنی حکومت قائم کرلی۔ مصر کے ایشیائی فاتح "ہائیکسوس" کہلاتے ہیں۔ ہائیکسوس غلبے (۱۷۳۰ / ۱۵۷۵ق.م) کے دوران بھی کمزور فرعونوں کا سلسلہ برابر جاری رہا، گویا حکمران تھے برائے نام ہی۔ سترھویں خاندان (۱۶۵۰ / ۱۵۷۵ق.م) کے فراعنہ "تپے" (تھیبس) کے مقامی حکمران تھے اور بس۔

جدید شہنشاہیت : یہ اٹھارھویں، انیسویں اور بیسویں خاندانوں (۱۵۷۵ / ۱۰۸۷ق.م) کا زمانہ تھا۔ اٹھارھویں خاندان کے بانی احمس (احموسی ۱۵۷۵ / ۱۵۵۰ق.م) نے غیر ملکی حملہ آوروں ہائیکسوس کو طاقت کے بل پر مصر سے باہر نکال کر اپنے اٹھارھویں خاندان اور جدید شہنشاہیت ــــــ کی بنیاد رکھی۔ مصر اس زمانے میں تقریباً ہر لحاظ سے قابلِ رشک حد تک عروج کو پہنچا اور مصری تاریخ کے اس شاندار ترین عہد میں ادب بھی خوب ہی پھلا پھولا

☆

انسانی تاریخ کا سات ہزار سالہ معمہ

اہرامِ مصر

اہرام دنیائے قدیم کی اعلیٰ سائنسی ترقی کے ٹھوس اور جیتے جاگتے ثبوت ہیں۔ اہرام کا عمل پیمائش گویا پتھروں کی زبان میں الہام بیانی ہے۔ اہرام کی ساخت و تعمیر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کام میں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق کا تعاون حاصل رہا ہے۔ اہرام کے سربستہ رازوں کا انکشاف جدید سائنس کا شیرازہ بکھیر سکتا ہے۔

یہ ہیں وہ چند در چند نظریات جو اہرام مصر کے معانی' اصلیت اور تاریخ کے بارے میں پیش کیے جاتے ہیں۔ ان عظیم سنگی مقبروں کی اہمیت پچھلے ایک ہزار برسوں سے دنیا بھر کے سائنسدانوں' علماء' صوفیاء اور عام لوگوں کے درمیان موضوع بحث رہی ہے۔ ان کے مباحثے کا زیادہ تر محور و مرکز مصر کا سب سے بڑا اہرام "شی اوپس یا چیوپس کا عظیم اہرام" (The great Pyramid Of Cheops) رہا ہے۔ یہ تراشیدہ سنگی چٹانوں کا وہ چیستانی انبار ہے جو ہزاروں برسوں سے انسانی ادراک واذہان کے لیئے ایک لاینحل معمہ اور ناقابلِ تسخیر چیلنج کی حیثیت سے سینۂ گیتی پر بڑی شان اور دبدبے سے ایستادہ ہے۔ آج بھی جب کہ انسان نے خلاء کی وسعتوں اور سمندروں کی گہرائیوں تک کو کھنگال ڈالا ہے شی اوپس کا یہ عظیم اہرام پہلے ہی کی طرح کھڑا جدید سائنس اور سائنس دانوں کا منہ چڑا رہا ہے۔

نئی دریافتیں' نئے انکشافات' نئی معلومات' وسیع تحقیقات و مطالعات و مشاہدات نے اس اہرام کے بارے میں کئی پختہ نظریات و افکار کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ "یورپین او کلٹ ریسرچ سوسائٹی" (European Occult Research Society) کے بانی اور سابق صدر گنتھر روزن برگ (Gunther Rosenberg) نے اپنی رپورٹ میں بتایا "سائنس دانوں نے حال ہی میں "شی اوپس" کا کمپیوٹری مطالعہ کیا تو بیشتر ماہرین حیرت و استعجاب سے آنکھیں پھاڑے' بے یقینی سے سر جھٹکتے ہوئے چلے گئے۔ فی الحال ہم اس بارے میں قطعی تاریکی میں ہیں کہ یہ اہرام کن لوگوں نے بنائے تھے' کیوں بنائے تھے اور آخر ان کے وجود کا سبب کیا ہے۔" بہر حال تازہ ترین معلومات (Data) نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ یہ اہرام قدیم اور انتہائی ترقی یافتہ سائنسی تخلیقات کا مظہر ہیں اور یہ انتہائی ترقی یافتہ سائنس' حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے ہزاروں سال قبل پوری دنیا پر غالب تھی۔ اہراموں کے معمار کائنات کے بیشتر سربستہ رازوں سے واقف تھے۔ وہ اعلیٰ ترین ریاضی (Advanced Mathematics) کا ادراک رکھتے تھے۔ دنیا کے جغرافیہ کے بارے میں ان کا علم حیرت انگیز تھا۔ تعمیر اہرام کے مطالعہ و تحقیقات سے حاصل شدہ حقائق میں سے چند ایک کو خلائی

سائنس دان ثابت کرنے میں کامیاب بھی ہو چکے ہیں۔ اس کے نتیجے میں خدشہ ہے کہ ہمیں ہماری نصابی کتب اور انسانی تاریخ کو دوبارہ مرتب کرنا پڑے گا۔

"میں نے حال ہی میں عروس البلاد قاہرہ سے چند میل جنوب میں واقع غزہ یا گیزا (Giza) کے میدان کا دورہ کیا تھا۔ یہ علاقہ جو امریکہ کے کسی بھی اوسط درجے کے فارم سے زیادہ وسیع نہیں ہے بلاشبہ دنیا کی پراسرار ترین جاگیر ہے۔ حیرت انگیز ابوالہول اور دیگر اہرام اس بے آب و گیاہ میدان میں صدیوں سے ایک لاینحل چیستاں کی طرح ایستادہ ہیں۔ اسی ویرانے میں عظمتِ رفتہ کی اَن مٹ دلیل بنا سر تانے ممتاز کھڑا وہ "شی اوپس کا اہرام" ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس اہرام کو فرعون شی اوپس کے مقبرے کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا۔ شی اوپس حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے تین ہزار سال قبل مصر پر بڑے کرّوفر سے حکمرانی کرتا تھا۔ اہرام شی اوپس کی محض جسامت ہی کسی سیاح کے لیئے انتہائی حیرت و استعجاب کا باعث ہو سکتی ہے۔ میرا گائیڈ ایک مصری پروفیسر تھا جس نے اپنی زندگی ان سنگی یا حجری تعمیرات کے پوشیدہ اسرار کو جاننے کے لیئے وقف کر رکھی ہے۔

"بنیادی طور پر اس اہرام کی بلندی ۴۸۵ فٹ ہے" مصری پروفیسر نے بتایا "اور اساس تیرہ ایکڑ رقبے پر محیط ہے جو شکاگو یا لندن زیریں (Down Town) کے تقریباً آٹھ مربع بلاکوں کے مساوی ہے۔ ہم نے اندازہ لگایا ہے کہ اس اہرام کی تعمیر میں پتھروں کی پچیس لاکھ سلیں (Blocks) استعمال کی گئی ہیں۔ ان میں سے ہر سل کا وزن تین ٹن سے نوے ٹن تک ہے۔ چند ایک بلاکوں کا وزن چھ سو ٹن تک بھی ہے۔ جب نپولین مصر میں تھا تو اس نے تخمینہ لگایا کہ صرف اس ایک اہرام میں اس قدر پتھر استعمال ہوئے ہیں کہ ان سے پورے فرانس کے گرد دس فٹ اونچی اور ایک فٹ موٹی دیوار تعمیر کی جا سکتی ہے۔"

"اور اگر ان پتھر کی سلوں کو ایک فٹ کی سلوں میں کاٹ لیں تو؟"

"تو پھر یہ چھوٹے بلاک پوری دنیا کے گرد ایک زنجیر بنانے کے لیئے کافی ہوں گے۔"

جہاں تک انسانی توانائی اور تعمیراتی سامان کا تعلق ہے تو اس اہرام کو اس صدی کی تیسری دہائی میں امریکہ میں دریائے کولیریڈو پر ہوور ڈیم کی تعمیر سے پہلے دنیا کی تمام تعمیرات پر برتری حاصل تھی۔ "درحقیقت آج کے اس ترقی یافتہ دور میں ایک بھی تعمیراتی کمپنی ایسی نہیں ہے جو اہرام بنا سکے۔" پروفیسر نے کہا "یاد رکھیں، اہرام شی اوپس کے اندر اتنی وسعت ہے کہ اس میں روم، میلان اور فلورنس کے تمام گرجا سما سکتے ہیں اور پھر بھی اتنی گنجائش باقی رہتی ہے کہ نیویارک کی ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ، ویسٹ منسٹر ایبے، سینٹ پال کیتھاڈرل اور انگلش ہاؤس آف پارلیمنٹ کی عمارات بھی اس میں آ سکتی ہیں۔ اس اہرام میں استعمال شدہ تعمیراتی سامان حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے لے کر آج تک انگلینڈ میں تعمیر کیے گئے تمام گرجا گھروں میں استعمال کیے گئے تعمیراتی سامان کے برابر ہے۔ دنیا بھر کی تمام مشینیں (Locomotives) مل کر بھی اس اہرام کو اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتیں کیونکہ یہ ناقابلِ یقین حد تک بھاری یعنی ساڑھے چھ ملین ٹن (پینسٹھ لاکھ ٹن) وزنی ہے۔ راہ داریوں، تدفینی بالوں اور

نادریافت شدہ امکانوں' پوشیدہ کمروں کے علاوہ یہ اہرام مکمل طور پر ٹھوس پتھروں کا بنا ہوا ہے۔"

بیرونی سطح کی سلیں جنہیں غارت گر تہذیب ونڈال (جرمنی کے قدیم باشندوں) نے تباہ کر دیا تھا ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر مہارت سے منسلک ہے کہ ایک عام بزنس کارڈ بھی اس میں نہیں جا سکتا' سو سو ٹن وزنی پتھر ایسی نفاست سے جڑے ہوئے ہیں کہ ان کے درمیان جوڑ کی لائن تلاش کرنا محال ہے۔ ایک عرب تاریخ داں' ابو زید بلخی' کا بیان ہے کہ بیرونی پتھروں پر کسی قدیم زبان کے حروف کندہ تھے جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان اہراموں کی تعمیر کا زمانہ وہ ہے جب لائر سرطان کے جھرمٹ میں تھا (Lyre was in the Constellation Of Cancer) اس حساب سے یہ (۷۳۰۰۰) تہتر ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ اکثر سائنس داں اس پر متفق ہیں کہ یہ اہرام فرعون شی اوپس کے زمانے میں ہی تعمیر کیا گیا تھا۔ "ان کا دعویٰ ہے کہ شی اوپس نے اپنی تمام رعایا کو مشقتی (Labour Gangs) کے طور پر غلام بنا رکھا تھا" ایک مصری ماہرِ اہرامیات نے بتایا "ان کا کہنا ہے کہ میرے قدیم آباؤ اجداد نے دستی اوزاروں کی مدد سے پتھر کی کانوں میں سے ان جناتی سلوں کو تراشا اور انہیں وسیع صحرا میں سے گھسیٹتے ہوئے یہاں تک لائے یا دریائے نیل سے تیراتے ہوئے غزہ تک پہنچایا پھر انہیں ریگستان میں سے کھینچتے ہوئے اس اہرام کی تعمیر میں استعمال کیا۔ مگر ایسا ہرگز ممکن نہیں ہے قدیم زمانے کے لوگ اس قدر ناقابلِ یقین حد تک درستگی کے ساتھ یہ عمارت تعمیر نہیں کر سکتے تھے۔"

تاریخی تخمینے کے مطابق فرعون شی اوپس کے دورِ حکومت میں مصر کی آبادی دو کروڑ تھی۔ "ذرا اس اہرام کی تعمیر کے سلسلے میں فنِ حمل و نقلِ انسانی کے بارے میں سوچیئے۔" مصری پروفیسر کہہ رہا تھا "ان تعمیراتی مسائل پر قابو پانے کے لیئے دس لاکھ سے زیادہ افراد کی ضرورت تھی۔ انہیں پتھر کی کانوں اور پھر اس مقام تک لے جانا تھا جہاں اہرام تعمیر ہونا تھا۔ انہیں سپاہیوں اور نگرانوں کی ضرورت تھی۔ ان کے کھانے پینے کا کیا بندوبست تھا؟ وہ لوگ رات کو کہاں سوتے تھے؟ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ رات بھی صحرا ہی میں گزارتے ہوں۔ پھر وہاں ہزاروں فورمینوں' سپروائزروں' مستریوں' ان کے نائبوں کے علاوہ ایسے افراد کے ایک عظیم گروپ کی بھی

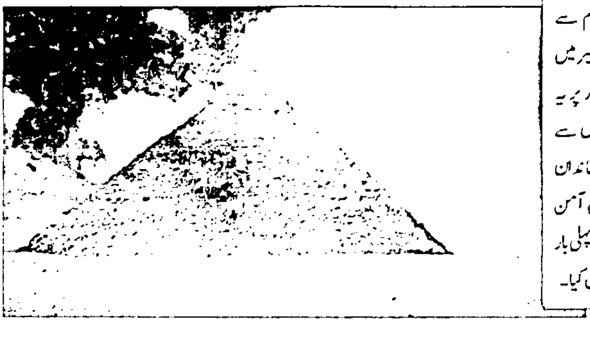

مصر کے دارالحکومت قاہرہ سے چند میل دور غزہ کے مقام پر چوتھے خاندان کے تین فرعونوں خوفو، خفرے اور منکارے کے اہرام مصر کی شناخت ہیں۔ ۲۳۰۰ ق م سے پہلے کی چار صدیاں اہرام کی تعمیر میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ عام طور پر یہ مقبرے اینٹوں یا چوکور پتھروں سے بنائے جاتے تھے۔ تیسرے خاندان کے بادشاہ جوزر کے عہد میں آمن ہوتپ نامی ماہر تعمیرات نے پہلی بار ان میں چوکور پتھروں کا استعمال کیا۔

ضرورت تھی جو اس پورے پروجیکٹ کی نگرانی کر سکے۔" پروفیسر نے چند اور ایسے مسائل کی بھی نشان دہی کی جن کا اہراموں کی تعمیرات کے وقت سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔

پتھر کی کانوں سے چھبیس لاکھ جناتی بلاک کاٹنے کے لیئے نہ جانے کتنی بڑی تعداد میں غلام تھے؟ انہوں نے کانوں سے پتھروں کی سلوں کو کاٹنے کے لیئے کس قسم کے آلات واوزار استعمال کیے تھے؟ اس زمانے میں نہ ڈائنامائٹ تھا اور نہ کسی اور قسم کا دھماکہ خیز مادہ پھر انہوں نے کس طرح چٹانیں توڑیں؟ اس کام کے لیئے انہوں نے کس اوزار کو استعمال کیا؟" چٹانوں سے پتھر توڑنے کے بعد انہوں نے ان کے بلاک کیسے بنائے؟ ان میں سے بے شمار بلاک اس طرح ایک دوسرے سے منسلک ہیں کہ کہیں ذرا سی بھی دراڑ یا شگاف دکھائی نہیں دیتا۔ اس طرح پتھروں کو دبانے کے لیئے کم از کم دوٹن دباؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوٹن' میرے دوست! اس قدر دباؤ ڈالنے کے لیئے انہوں نے کون سا آلہ استعمال کیا تھا؟

تیسری بات۔ غزہ کے تعمیراتی مقام پر آخر اس عظیم سنگی ذخیرہ کو کس طرح لے جایا گیا ہوگا؟

چوتھی بات۔ آخر مصر جیسے چھوٹے سے ملک میں اتنے بہت سارے آدمیوں کے کھانے کا انتظام کیسے کیا گیا؟ یہ خوراک کہاں سے آئی؟ کس نے یہ خرچہ برداشت کیا؟ کس نے یہ کھانا پکایا؟ اناج کہاں سے آیا؟ جب کہ تقریباً ہر اہل آدمی اہرام کی تعمیر میں کسی نہ کسی طور پر شامل تھا تو پھر کھیتوں میں زرعی مشقت کس نے کی؟

پانچویں بات۔ ان بھاری بھرکم سنگی بلاکس کو کھینچ کر منزل تک پہنچانے کے لیئے رسے کہاں سے آئے؟ قدیم مصر میں یہ تو ممکن نہیں تھا کہ آپ کسی بھی ہارڈ ویئر اسٹور پر جائیں اور جتنا چاہیں رسہ خرید لائیں۔ چھبیس لاکھ سنگی بلاکوں کو باندھ کر گھسیٹنے کے لیئے کس قدر رسوں کی ضرورت تھی؟ ان میں سے چھوٹے سے چھوٹے بلاک کا وزن بھی کم از کم تین ٹن ہے۔

چلیے ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ایک پتھر کو کھینچنے کے لیئے ہمیں چار رسوں کی ضرورت تھی۔ بعض رسے دوبارہ بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں اس طرح ہمیں ایک پتھر کے لیئے دو رسوں کی ضرورت تھی اس طرح بھی رسوں کی تعداد باون لاکھ تک جا پہنچتی ہے جو ناقابلِ یقین ہے۔ موٹے اور مضبوط رسے! آخر وہ آئے کہاں سے تھے؟

چھٹی بات۔ آخر اس فرعون کو ایسا معمار کہاں سے میسر آگیا تھا جس نے اس قدر حیرت انگیز عمارت کو ڈیزائن کیا اور پھر اس قدر ٹھیک ٹھیک پیمائش کے ساتھ اسے زمین کے سینے پر کھڑا بھی کر دیا؟ فرض کر لیتے ہیں کہ اس فرعون کے پاس درشت مزاج لمبے تڑنگے مضبوط جسموں والے چابک دست فورمینوں کا ایک بڑا دستہ تھا پھر بھی پتھر کی کانوں سے چٹانوں کو کاٹ کر انہیں بلاک کی صورت دینے کے لیئے ایک جمِّ غفیر مزدوروں کی ضرورت تھی۔ چلو یہ بھی تسلیم کیا کہ ان کے پاس مزدوروں کی کافی تعداد بھی تھی۔

"کیا ہم یوں کہہ لیں کہ ان تمام لوگوں نے دس گرینائٹ بلاکس روزانہ تیار کر لیئے ہوں گے؟

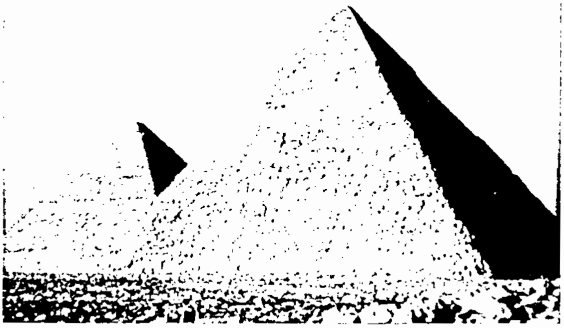

اہرام مصر کا شمار دنیا کے سات عجائبات میں کیا جاتا ہے۔ زمانہ قدیم کے ان پراسرار عجائبات نے آج کے ترقی یافتہ دور کے کمپیوٹر کو بھی شکست دے دی ہے۔ ان اہرام مصر کی تعمیر، ان میں استعمال کئے گئے میٹریل، پیمائش کی درستگی اور ان پر درج پیش گوئیوں نے ساری دنیا کے سائنس دانوں اور اہلِ علم کو ششدر کر رکھا ہے کیونکہ ان میں سے بیشتر پیش گوئیاں درست ثابت ہوئیں۔

پروفیسر نے پوچھا "یاد رکھیں ان پتھروں کو چٹانوں سے کاٹنا تھا۔ انہیں ہموار بلاکس کی صورت میں ڈھالنا تھا انہیں غزہ(Giza) تک لانا تھا پھر ان بلاکوں کو بڑی مہارت سے اہرام کی تعمیر میں لگانا تھا۔ اگر یہ تمام کام دس بلاک روزانہ کے حساب سے ہو رہے تھے تو تکمیلِ اہرام میں دو لاکھ پچاس ہزار دن لگے یعنی چھ سو اسی سال"

اگر یہ بھی فرض کرلیں کہ ان لوگوں نے ایک سو پتھر روزانہ کے حساب سے عمارت میں لگائے تو اس طرح بھی اہرام شی اوپس کی تعمیر چھبیس ہزار دنوں یعنی کم از کم ستر سالوں میں مکمل ہو سکتی تھی۔

پروفیسر مسکرایا "کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ کوئی بادشاہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اتنے عرصے تک زندہ نہیں رہ سکے گا آپ اپنے مدفن کی تعمیر کروا سکتا تھا! تو کیا یہ عظیم اہرام مصریوں نے اپنے چند سادہ دستی اوزاروں سے بنایا تھا؟ اونٹ کی پشت پر سوار غزہ کی طرف جانے والے شخص کو کئی حیران کن حقائق کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جدید معماروں کو ان کے بھاری بھرکم تعمیراتی پروجیکٹس میں اگر ایک انچ کے دسویں حصے کی درستگی بھی میسر آجاتی ہے تو یہ بڑی خوش کن بات ہوتی ہے جب کہ اس اہرام میں بے شمار راہداریوں، سرنگوں، شہد کی مکھیوں کے چھتے کی مانند کمروں اور خفیہ مدفنوں کی تعمیر میں اس سے کہیں زیادہ صحت اور درستگی موجود ہے۔ بیشتر جدید تعمیرات کے برخلاف یہ اہرام صدیاں گزر جانے کے باوجود اپنی بنیادی حالت پر قائم و دائم ہے یعنی نہ یہ عمارت کسی بھی طرف ایک انچ جھکی ہے اور نہ ہی زمین میں دھنسی ہے۔ "مجھے دنیا کی کسی بھی بڑی سے بڑی تعمیراتی کمپنی کا نام بتادیں جو یہ دعویٰ کر سکے کہ ساڑھے چھ ملین ٹن وزنی عمارت کو وہ بھی ایسا ثبات عطا کر سکتے ہیں۔" پروفیسر کہہ رہا تھا "نہیں شاید اس دور کے کسی بھی معمار کے لیئے یہ ناممکن ہے" ان اہراموں کی تعمیر میں سرّیت کا سلسلہ بڑا طویل ہے۔ اس کی ایک قابلِ ذکر مثال اہرام کے انتہائی اندرونی حصے میں تعمیر شدہ "ایوانِ شاہی"(King's Chamber) ہے جس کی لاثانی چھت ستر ستر ٹن وزنی سرخ رنگ کے نادر ترین سنگِ سماق(Granite) کی دو صفوں سے مزین ہے۔ یہ سرخ پتھر صرف غزہ سے چھ سو میل دور واقع پتھروں کی کانوں سے ہی حاصل کیے جا سکتے تھے۔ "ڈاکٹر روزن برگ نے بتایا" اس زمانے کے مصر میں

گھوڑا گاڑی یا بار برداری کی اور کسی قسم کا تصور بھی نہیں تھا۔ پھر اس قدر فاصلے سے یہ پتھر مقام اہرام تک کیسے لائے گئے ؟"

تواریخ داں کہتے ہیں کہ ستر ٹن وزنی یہ بلاکس اور قدرے چھوٹے پتھر لکڑی کے رولروں کے ذریعے وہاں لائے گئے تھے۔ یہ رولر موٹے موٹے درختوں کو کاٹ کر انہیں لٹھوں کی شکل دے کر بنائے گئے تھے اور پھر ان کے ذریعے بھاری سنگی سلوں کو لڑھکا کر لایا گیا تھا۔

"درخت! درخت ؟۔!" ڈاکٹر روزن استہزائیہ انداز میں ہنس کر بولا "اگر درخت ہوں تو یہ نظریہ بھی قابلِ قبول ہے مگر مصر میں کھجور کے چند درختوں کے سوا جنگلات عنقا ہیں۔ اگر تواریخ داں لکڑی کے رولروں کے ذریعے پتھروں کو مقام اہرام تک لانے کے نظریے پر اصرار کرتے ہیں تو پھر انہیں مصر میں تصوراتی جنگلات بھی پیدا کرنے پڑیں گے تاکہ ان لٹھوں سے رولروں کا کام لیا جا سکے۔" اس ریتلی سرزمین پر پتھر کے ان بھاری بھاری بلاکوں کو دھکیلنے 'لڑھکانے' کھینچنے اور گھسیٹنے کے عمل نے بلاشبہ لکڑی کے بیشتر رولروں کو تباہ کر دیا ہوگا۔ پتھر کی بھاری سلوں کے نیچے دبے رولروں کو کنکر 'ریت اور دیگر قدرتی رکاوٹوں نے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہوگا۔ اس طرح کم از کم ایک بلاک کو منزل مقصود تک پہنچانے کے لیئے دس رولر کام میں آئے ہوں گے۔ گویا اس عظیم اہرام کو چھبیس ملین (دو کروڑ ساٹھ لاکھ) لکڑی کے لٹھوں کی ضرورت تھی جو مصر میں ناپید تھے۔ کیا یہ لٹھے باہر سے منگوائے گئے تھے ؟" اس کام کے لیئے تو تاریخ کے سب سے بڑے بحری بیڑے کی ضرورت تھی۔" ڈاکٹر روزن برگ نے کہا "یہ ہیں وہ سوالات جن کے تواریخ دانوں کے پاس کوئی جواب نہیں ہیں۔ آخر کہاں سے ان مصریوں کو ایک ملین' دو ملین خدا کی پناہ' چھبیس ملین درخت ملے ہوں گے ؟ ان جنگلات کو کس نے کاٹ چھانٹ کر لٹھے بنائے ہوں گے ؟ ان لٹھوں کو کس طرح پتھر کی کانوں تک پہنچایا گیا ہوگا ؟

اگر آپ کا ذہن چھبیس ملین درختوں کے تصور سے قاصر ہے تو ذرا ایک ملین (دس لاکھ) درختوں سے ہی اندازہ لگالیں کہ اس میں کس قدر انسانی توانائی کی ضرورت ہوئی ہوگی۔ ؟ سو یہ نظریہ کہ قدیم انسانوں نے یہ اہرام اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا تھا انتہائی بعید از قیاس اور ناممکن ٹھہرا ہے۔ اپنی تاریخ کی کتاب کی جلد دوم میں یونانی مورخ ہیروڈوٹس نے قدیم مصر کے ایک دارالحکومت تھیبز میں اپنے دورے کے بارے میں لکھا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ "مصری اپنے رواج کے مطابق اپنے بڑے بڑے مذہبی رہنماؤں کے مجسمے بنا کر اپنے مقدس مندروں میں سجایا کرتے تھے۔ اس آوارہ گرد یونانی تاریخ داں نے جب اس ایک مندر میں تین سو اکتیس ایسے مجسمے دیکھے تو حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مصر میں پچھلے بارہ ہزار سالوں سے پادریوں کی حکومت تھی۔ ڈاکٹر روزن برگ کا بیان ہے کہ ہیروڈوٹس کو یہ بھی بتایا گیا کہ مصر کی پہلی نسل کے ساتھ ان کے دیوتا بھی رہتے تھے جو بعد میں اپنے آفاقی گھروں میں لوٹ گئے۔ اگر نسل انسانی کی افزائش میں ان ستارہ مکینوں کا بھی ہاتھ تھا تو یقیناً ان آفاقی مخلوقات کے سائنسی علوم کا تھوڑا بہت حصہ ان کی سرشت میں بھی شامل ہو گیا تھا۔

مشرقی وسطی میں نہرِ سوئز کے بحران کے نتیجے میں مصر اور روس ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ اس تعلقِ خاطر کی وجہ سے روسی سائنس دانوں کو شمالی افریقہ کے صحرا میں آثارِ قدیمہ سے متعلق ایک مہم سر کرنے کا موقع مل گیا۔ اس مہم کے نتائج پیٹر کولوسیمو نے میلان اٹلی کے ''ٹیرا اسینسا ٹیسپو''میں شائع کیئے تھے۔ اس نے بتایا کہ رومیوں کو ہزاروں سال پہلے کے ایسے فلکیاتی نقشے ملے تھے جن میں اجرامِ فلکی کے ٹھیک ٹھیک مقامات دکھائے گئے تھے۔ ''ان روسی مہم جوؤں کو ایک انتہائی مہارت سے بنایا ہوا کرسٹل عدسہ بھی ملا تھا'' ڈاکٹر روزن برگ نے بتایا ''ان چیزوں سے پتا چلتا ہے کہ قدیم دنیا سائنسی علوم میں کس قدر ترقی یافتہ تھی۔''

قدیم مصر میں ''خلائی انسان'' کے نظریے کی موجودگی بھی عظیم اہرام اور اڑن طشتریوں (UFO's) کے درمیان تعلق کی نشان دہی کرتی ہے۔ ایک یو ایف او لوجسٹ کے مطابق ایک خلائی جہاز اہرام کی چوٹی پر حفاظت اتر سکتا تھا اور یہ کہ اہرام میں موجود 'شاہی دیوان' کنگز چیمبر دراصل ان ستارہ مکینوں کا استقبالیہ کمرہ تھا۔

صدیوں سے ماہرِ فوقیات (Occulists) اس عظیم اہرام کو بہت زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔ صوفیت (Theosophy) کی ایک متنازعہ بانی میڈم ایچ پی بلاوٹسکی کا دعویٰ ہے کہ اسفنکس (Sphinx) (سنگی مجسمہ جس کا سر عورت کا اور دھڑ شیر کا ہے) سے لے کر اہرام تک ایک طویل سرنگ تھی۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اہرام کے کمروں میں وہ عجیب و غریب رسمیں ادا کی جاتی تھیں جن کے ذریعے نوآمدہ افراد کو اس پراسرار برادری میں شامل کیا جاتا تھا۔ اس کا یہ نظریہ بھی تھا کہ یہ اہرام پتھر کی صورت میں ایک ریکارڈ تھا جو جیومیٹری' ریاضی' نجوم اور فلکیات کے اصولوں کا مظہر تھا۔ ان رسموں کے دوران میں انسان دیوتاؤں تک بلند ہو جاتے تھے اور دیوتا آسمانوں سے اتر کر انسانوں میں شامل ہو جاتے تھے۔

یہ غیر معمولی نظریات چند برس پہلے سنتے ہی رد کر دیئے جاتے تھے مگر آج صرف چند افراد ایسی جرأت کر سکتے ہیں کہ ان نظریات کا مذاق اڑائیں جب کہ حالیہ سائنسی مطالعے کے بعد بیشتر افراد اس اہرام سے منسلک پراسراریت کے قائل ہوتے جارہے ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں فزکس (طبیعیات) میں نوبل انعام پانے والا ڈاکٹر لوئی الوریز (Alverez) نے گیزا (Giza) کے اہراموں سے پھوٹنے والی کاسمک شعاعوں کی پیائش کرنے کا ایک طریقہ دریافت کیا ہے۔ کمپیوٹر کے ذریعے ٹیسٹ کے لیئے شیفرین (Chephren) کے چھوٹے اہرام کا انتخاب کیا گیا۔ اس مہم کو قاہرہ کی عین الشمس (Ein Shams) یونیورسٹی' امریکہ کے ایٹمک انرجی کمیشن اور اسمتھ سونین انسٹی ٹیوشن نے اسپانسر کیا تھا۔ اس مطالعہ اور تجزیہ کے نتائج نے سائنس کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا اس کی رپورٹ ۱۴/ جولائی ۱۹۶۹ء کے ''دی لندن ٹائمز'' میں جرنلسٹ جون ٹنس ٹال نے شائع کی تھی۔

''وہ سائنس داں حضرات جو قاہرہ کے نزدیک گیزا کے شیفرین نامی اہرام کے اندر کا حال جاننے کے لیئے ایکس ریز استعمال کر رہے تھے اہرام کے پراسرار اثرات دیکھ کر بھونچکا رہ گئے جو ان کے

خلائی دور کے انتہائی جدید برقی آلات کی ریڈنگ کو نا قابلِ فہم بنائے دے رہے تھے۔ یہ سائنسدان ایک سال سے بھی زیادہ عرصے تک روزانہ چوبیس گھنٹے' اس امید پر کہ 'اس ساٹھ لاکھ ٹن وزنی اہرام کے اندر متوقع طور پائے جانے والے کمروں کو دریافت کر لیں گے اندر تک اتر جانے والی کاسمک شعاعوں سے بننے والی لکیروں (Patterns) کو متناطیسی ٹیپ پر ریکارڈ کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر یہ شعاعیں اہرام کے چاروں جانب یکساں طور پر پھینکی جائیں گی تو اہرام کے ٹھوس ہونے کی صورت میں ان کا اہرام کی تہہ میں لگا ڈی ٹیکٹر یکساں نتائج ریکارڈ کرے گا۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر ڈی ٹیکٹر کی رینج کے اوپر والے حصے میں کمرے ہوئے تو وہ ٹھوس حصے پر ڈالی جانے والی شعاعوں سے زیادہ طاقت ور شعاعیں استعمال کریں گے تاکہ ان کی موجودگی کا پتہ چل سکے۔ دس لاکھ ڈالر سے زیادہ رقم اور انسانی اوقات کے ہزاروں گھنٹے اس پروجیکٹ پر صرف کیے گئے اور چند ماہ قبل جب عین الشمس یونیورسٹی قاہرہ کو اس کام کے لیئے آئی بی ایم ۱۲۰ کمپیوٹر مہیا کیا گیا تو متوقع نتائج برآمد ہونے کی امید قوی تر ہو گئی۔ عین الشمس یونیورسٹی کے ڈاکٹر امر گوہد نے جو اس کمپیوٹر کی تنصیب کے انچارج تھے' مجھے ٹن کے ڈبوں میں بند وہ سینکڑوں ریکارڈنگ ٹیپس دکھائیں جو تاریخ وار کمپیوٹر کے گرد رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے مجھے بتایا کہ اس قدر جاں سوزی کے بعد بھی وہ جیسے کسی اندھیری گلی میں کھڑے ہوئے تھے۔

"اس ریکارڈ شدہ مواد نے سائنس اور برقیات کے تمام معلوم اور تسلیم شدہ قوانین کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔" اس نے ریکارڈنگ کا ایک ڈبہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ اس نے وہ ٹیپ کمپیوٹر پر لگایا اور کاسمک شعاعوں کی لکیریں کاغذ پر نمودار ہونے لگیں۔ پھر اس نے دوسرے روز ریکارڈ کیا ہوا ٹیپ کمپیوٹر میں لگایا لیکن اس سے ظاہر ہونے والی لکیروں کا حال پہلے ٹیپ کی گئی لکیروں سے بالکل مختلف تھا۔ "یہ سائنسی طور پر بالکل ناممکن اور انہونی بات ہے" ڈاکٹر گوہد نے بتایا۔ بڑے مباحثے کے بعد میں نے اس سے پوچھا "کیا یہ سائنسی معلومات کسی ایسی قوت نے ناکارہ بنا دی ہیں جو انسانی فہم سے بالاتر ہو۔" جواب دینے سے قبل وہ ذرا ہچکچایا پھر بولا "یا تو اس اہرام کی جیومیٹری میں کوئی سنگین غلطی ہے جو ہماری ریڈنگز پر اس بری طرح اثر انداز ہو رہی ہے یا کوئی ایسا اسرار ہے جو ہماری فہم سے بہت بالاتر ہے۔ چاہے تم اسے فوق الفطرت کہہ لو۔ فراعین کی بددعا کا اثر کہہ لو۔ جادوگری یا ساحری کا نام دے لو۔ اس اہرام میں کوئی ایسی غیر مرئی قوت پنہاں ہے جو ہماری تمام سائنسی سرگرمیوں کو مختل کیئے دے رہی ہے۔"

ڈاکٹر گنتھر روزن برگ نے اس مطالعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا "ہمارے ان جدید ترین کمپیوٹروں کی مدد سے بھی ہم ان اہراموں کے اسرار کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔"

"کمپیوٹر کے تمام پرنٹ آؤٹس کو اس اہرامی شکل سے منسلک کسی بہت طاقت ور مگر پراسرار قوت نے الجھا کر رکھ دیا تھا۔" ایک فرانسیسی موسیو بووس نے اہرام کا دورہ کرتے ہوئے اس کی راہداری میں ایک بڑا سا ڈبہ دیکھا۔ ڈاکٹر روزن برگ نے بتایا "اس نے دیکھا کہ جو بلیاں اور چھوٹے موٹے جانور ان

راہداریوں میں پھنس کر مر جاتے انہیں اہرام کے گارڈز اس کنٹینر (ڈبے) میں پھینک دیتے مگر بووس کو ان مردہ جسموں میں سے کسی قسم کے گلنے سڑنے کی بو نہیں آئی حالانکہ اس حصے میں معمول کے مطابق مرطوبیت موجود تھی۔ یہ مردہ اجسام نابید(Dehyderated) ہو کر ممی بن چکے تھے۔
بووس فطری طور پر ایک متجسس شخص تھا۔ اس نے سوچا کہ کہیں ان لاشوں کا یوں ممی بن جانا اس اہرامی شکل کی وجہ سے تو نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے ایک گز اساس(Base) کی لکڑی کا ایک اہرام بنایا اور اس ماڈل کا رُخ شمال کی جانب کر دیا۔ اس نے اس کے اندر ایک مردہ بلی رکھی چند ہی روز بعد وہ بلی ممی میں تبدیل ہو چکی تھی۔

بووس نے اپنے یہ تجربات بیل کے مغز اور دوسری ایسی جاندار چیزوں پر جاری رکھے جو جلدی گلنے سڑنے کی خاصیت رکھتی تھیں۔ "جب یہ چیزیں اس خود ساختہ اہرام میں رکھی گئیں تو نہ وہ گلی سڑیں اور نہ ان کا کچھ اور بگڑا۔ روزن برگ نے بتایا کہ بووس نے اپنے تجربات کے نتائج ایک رپورٹ کی صورت میں شائع کروائے تو بڑا گھمبیر مگر خاموش رد عمل سامنے آیا۔ سائنسی دنیا کے لوگ "اہرامی" (Pyramidist) کی اصطلاح سے ہی نفرت کرنے لگے یعنی ایک ایسا شخص جو اہراموں سے منسلک پوشیدہ پراسرار قوتوں پر یقین رکھتا ہو۔ انہوں نے اس حقیقت کو ماننے سے قطعی انکار کر دیا کہ اگر کوئی نامیاتی (Organic) مادہ ان خود ساختہ اہراموں میں رکھا جائے تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ انہوں نے تازہ مردہ گوشت کی تاخیری بوسیدگی کے سلسلے میں بووس کی دریافت کو یکسر انداز کر دیا۔ انہوں نے یہ نظریہ بھی رد کر دیا کہ اہرام کے اندر نابیدیت (Dehydration) اور حنوطیت (Mum-mification) کا پیچیدہ عمل ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔

آہنی پردے کے پیچھے چیکو سلاویکیا میں بووس کی رپورٹ پڑھ کر ایک پراگی(Prague) براڈکاسٹ انجینئر نے حیرت سے اپنا سر ہلایا۔ کارل ڈربل ایک چیک ریڈیو اور ٹیلی وژن پہل کار (Pion-eer) الجھن میں پڑ گیا اور اس نے اپنے طور پر تجربات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنے فاضل اوقات میں اس نے گتے کا ایک ناپختہ (بے ڈھنگا) مگر ہو بہو اہرام بنایا پھر اس نے بووس کے تجربات کو آزمایا اور دریافت کر لیا کہ وہ فرانسیسی اپنے نتائج اخذ کرنے میں کس

اہرامِ مصر پر غروب آفتاب کا منظر ایسا سحر انگیز ہوتا ہے کہ چند لمحوں کے لئے آپ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں اور آپ کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ آپ زمین پر کھڑے ہیں اس دیو قامت اہرام کو جب آپ گردن اٹھا کر دیکھتے ہیں تو دہشت اور خوف سے آپ کے جسم میں سنسنی دوڑ جاتی ہے۔ حضرت عیسیٰ کی ولادت سے تقریباً پانچ ہزار سال قبل یہ اہرام عالم وجود میں آئے کہا جاتا ہے کہ اس کے بانیان و معماران کو کائنات کے سربستہ رازوں کا علم تھا۔ ایک اندازے کے مطابق ہر ایک اہرام کو بنانے میں ایک لاکھ مزدوروں نے حصہ لیا اور وہ بیس برس تک ان کی تعمیر میں مصروف رہے۔

قدر درست تھا۔ ڈربل نے واضح کیا کہ ”اہرامی شکل کے اندر کے خلاء اور طبیعیاتی ‘کیمیائی اور حیاتیاتی عمل میں گہرا تعلق ہے۔ مناسب شکل و صورت استعمال کر کے ہم اس عمل کے تاخیری اور تعجیلی نظام کو مناسب حد تک کنٹرول کر سکتے ہیں۔ اپنے ان تجربات کے دوران میں ڈربل نے گتے کے اہرام میں رکھے جانے والے مادے کی ساخت میں حیرت انگیز تبدیلیاں دریافت کیں۔ اسے پختہ یقین ہو گیا کہ اس شکل کے ساتھ ایک نامعلوم مگر انتہائی طاقت ور توانائی وابستہ ہے شاید یہ شکل برقی مقناطیسی لہروں کو اپنی جانب کھینچتی ہے اور یہاں کائناتی لہروں(Cosmic Rays) کا اجتماع ہو جاتا ہے“اس کا بیان تھا کہ ”اہرام انتہائی توانائی کی ایک قطعی نامعلوم قسم اپنے اندر مجتمع کر رہا ہے اور اسے برقرار بھی رکھتا ہے۔“

ایک روز جب ڈربل اپنے تجربات میں منہمک تھا تو اسے ایک ساتھی نے یاد دلایا کہ وہ نئی ریزر بلیڈ تو خرید لے۔ حالانکہ چیک کی بلیڈیں اعلیٰ معیار کے فولاد کی بنی ہوتی ہیں مگر وہ بہت جلد ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ امریکہ اور انگلینڈ کی بلیڈیں آہنی پردے کے پیچھے دستیاب نہیں تھیں۔ چنانچہ ڈربل کے ذہن میں خیال آیا ’کیا اہرام کی یہ نامعلوم توانائی کسی ناکارہ بلیڈ کے کناروں کو دوبارہ تیز اور کارآمد بنا سکتی ہے ؟“ اگلی صبح ڈربل نے اپنے ریزر میں نئی بلیڈ لگائی اور پھر اس استعمال شدہ بلیڈ کو اپنے چھوٹے سے گتے کے اہرام کے اندر رکھ کر اہرام کو ٹھیک شمال جنوبی محور پر رکھ دیا اور پھر وہ حیران رہ گیا کہ رات ہی رات میں اس بلیڈ کے کناروں کی اصل تیزی لوٹ آئی تھی۔ چیک انجینئر کے بلیڈ کے کناروں کو دوبارہ تیز کرنے کی بے مثال خبر بڑی تیزی سے آہنی پردے کے تمام ممالک میں پھیل گئی۔ اعلیٰ معیار کی بلیڈیں حاصل کرنا ایک مسئلہ تھا۔ ایک بار جب شیو کرنے والا کوئی بلیڈ کا پیکٹ خریدتا تو اس سے زیادہ سے زیادہ شیو کرنا چاہتا تھا۔ ڈربل نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ اہرام کی تکنیک کے ذریعے ایک بلیڈ سے آدمی پچاس سے ساٹھ دفعہ شیو کر سکتا تھا۔ ”اہرام کے اندر کا ماحول حیرت انگیز طور پر بلیڈ کی بنیادی تیزی واپس لے آتا ہے“اس نے کہا اپنی اس دریافت کے تجارتی امکانات کے پیش نظر ڈربل نے چیکوسلاویکیا کی حکومت کو پیٹنٹ (Patent) درخواست دے دی۔ آزمائش کے بعد حکومت نے اسے تحفظِ ایجاد کی سند نمبر ۹۱۳۰۴(Patent) عطا کر دی اور ”شی اوپس پیرامڈ ریزر بلیڈ شارپنر“ نامی ایک چیک فرم نے اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ تاہم یورپ کے کارخانہ دار چیک کے اس اہرامی مظہر حقیقت اور افادیت کو تسلیم کرنے سے ہچکچاتے ہی رہے۔ پھر فرانس کے ایک ڈیری فارم کے مالک نے دہی رکھنے کے لیئے اہرام کی شکل کے ظرف کو پیٹنٹ کرا لیا۔ اس کے گاہک قسم کھاتے تھے کہ دہی کی خوشبو اور لذت دوچند ہو گئی تھی۔ اٹلی میں ایک اور ڈیری نے دودھ کے لیئے اہرامی کنٹینر کو پیٹنٹ کرایا اور اس غیر معمولی ظرف نے دودھ کی میعادِ تازگی میں حیرت انگیز اضافہ کر دیا۔

”دی یورپین اوکلٹ ریسرچ سوسائٹی“ نے اہرام کے ماڈلوں پر کئی تجربات کیے۔ ”ہمارے نزدیک اس شکل کی اہمیت زیادہ تھی۔“ ڈاکٹر روزن برگ نے کہا ”ہم نے پلاسٹک ‘لکڑی‘ شیشے ‘دھات اور کاغذ کے اہرام بنائے۔ ہم نے یہ دیکھا کہ کارآمد ہونے کے لیئے ان اہرامی ماڈلوں کو شمال جنوبی محور

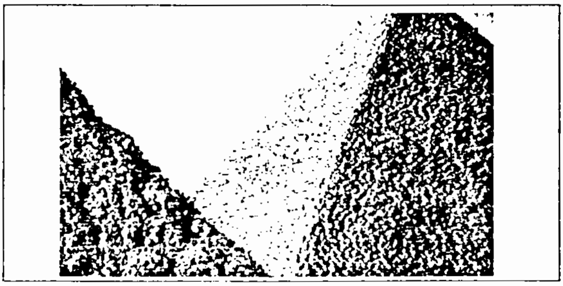

غزہ پر واقع چیوپس فرعون کے اہرام کو دیکھ کر آپ ورطۂ حیرت میں غرق ہو جائیں گے۔ بے آب و گیاہ صحرا میں واقع یہ ہیبت ناک عمارت اب بھی ماہرین کے لئے سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے کہ یہاں پر اتنے بھاری بھر کم پتھر کیسے لائے گئے جبکہ اس زمانے میں نہ گاڑیاں تھیں اور نہ کرینیں تو یہ سب کیونکر ممکن ہوا؟ اس اہرام کی تعمیر میں ۵۲ لاکھ پتھروں کی سلیں استعمال کی گئیں۔ ہر بلاک کا وزن تین ٹن سے لے کر ۹۰ ٹن تک ہے۔ چند بلاکس کا انفرادی وزن چھ سو ٹن تک بھی ہے۔

پر رکھنا پڑتا تھا ورنہ سمت کی ذرا سی بھی غلطی اہرام کی توانائی میں کمی کا باعث بن جاتی تھی۔ اگر شمال کی جانب سے سمت میں پانچ ڈگری کا بھی فرق پڑ جاتا تو اہرام کی قوت میں پانچ فیصد کمی واقع ہو جاتی تھی۔ "یہ بڑی غیر معمولی صورتِ حال ہے اور ہم ابھی تک اس کے جواب کی جستجو میں ہیں۔" روزن برگ نے کہا "شاید کبھی ہم اپنے رہائشی مکان بھی اہرام کی شکل میں بنانے لگیں اور اس طرح ان میں زیادہ آرام دہ اور سود مند ماحول میسر آ سکے۔" روزن برگ سوسائٹی ان تحقیقات میں مصروف تھی اور دوسرے لوگ اس امید پر جی رہے تھے کہ شاید کبھی اہرام کے اسرار کا معمہ حل ہو جائے۔

۱۸۶۴ء میں اسکاٹ لینڈ کا شاہی ماہر فلکیات اور ریاضی داں پیازی اسمتھ مصر گیا اور شی اوپس کے اہرام کی پیائش کی۔ اسمتھ کی ان کاوشوں سے پتا چلا کہ یہ اہرام اپنی چوڑائی کے ہر نو یونٹ کے مقابلے میں دس یونٹ بلند تھا۔ اسمتھ نے اس بلندی کو $۱۰^{۹}$ سے ضرب دیا جس کا حاصل ضرب نو کروڑ اٹھارہ لاکھ چالیس ہزار آیا جو سورج کے گرد زمین کے مدار کا میلوں میں فاصلہ ہے۔ ابتدائی محققین کی دریافت کے مطابق یہ اہرام مصر کے ٹھیک مرکز میں واقع تھا جو قدیم دنیا کے مرکز سے بھی قدیم ترین مقام بتایا جاتا ہے۔ یہ عمارت ہمارے آج کے سیارے کی زمینی سطح پر ایستادہ ہے اس بات کی تصدیق کے لیئے زمین کے جغرافیائی حالات سے متعلق بڑے وسیع علم کی ضرورت ہے۔ اس حیرت انگیز اور محیر العقول اہرام کی تعمیر کا مشاہدہ کرنے کے لیئے آج تک سیاحوں کی ایک نہ ختم ہونے والی قطار لگی ہوئی ہے۔ سائنس داں اور سیاح دونوں ہی اس اہرام کے معماروں کی غیر معمولی درستگی اور تناسب دیکھ کر مسحور ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ مثال کے طور پر دروازوں کی کھڑکیوں کے چوکھٹوں میں لگائے گئے پتھر اس اعلیٰ مہارت سے لگائے گئے ہیں کہ پچھتر انچوں کے بعد کہیں جا کر ان کی سیدھ میں ایک انچ کے سوویں حصے (۱۰۰/۱) جتنا فرق آیا ہے۔ ابتدائی دور کے ایک محقق ولیم ایف پیٹری کا کہنا ہے کہ "محض ان پتھروں کو اس ٹھیک ٹھیک انداز میں چن دینا ہی بڑی حیرت انگیز بات ہے جب کہ اس دور کے معمار اپنے تمام تر سائنسی آلات و امداد کے ساتھ ایسی نفاست اور درستگی حاصل کرنے سے قطعی قاصر تھے۔" اہرام کے معماروں کو یقیناً ایک انتہائی طاقت ور سیمنٹ کا بھی علم تھا۔ ہزاروں سال سے تپتے صحرا کی دھوپ اور گرم ہوا کے جھکڑوں کا سامنا کرتے ہوئے چوکھٹوں کے پتھر تو کہیں کہیں سے

ادھڑ گئے ہیں مگر انہیں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے والے سیمنٹ پر آنچ تک نہیں آئی ہے۔ "ذرا آج کے دور میں اس سیمنٹ کو ہائی ویز کی تعمیر میں استعمال کرنے کے بارے میں سوچیں" روزن برگ نے کہا "اگر ہمیں اس کا وہ گمشدہ فار مولا مل جائے تو ہماری سڑکیں ہزار سال تک بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہ ہوں۔" یہ عظیم اہرام بڑے درست انداز سے شمال جنوبی محور پر ایستادہ ہے آج کے انجینئر تیرہ ایکڑ کے رقبے پر پھیلی ہوئی عمارت کی تعمیر میں سمتوں کا اس قدر صحیح اندازہ برقرار نہیں رکھ سکتے۔ اس دور کے معمار یقیناً جیومیٹری اور علمِ مثلث (Trigonometry) کے علوم سے بھی کماحقہ' واقف تھے۔ اس کی پیائش سے پتہ چلتا ہے کہ اس اہرام کی تعمیری میں پائی (Pi) اور ریاضی کی دوسری اقدار کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ تاریخ دانوں کا دعویٰ ہے کہ پائی (Pi) اور ایڈوانس ریاضی کے دیگر تصورات و اقدار مصر میں اہرام کی تعمیر کے ایک ہزار سال بعد پہنچے تھے۔ ایک ماہر مصریات کا کہنا ہے کہ "حکماء کا دعویٰ ہے کہ اہرام کی تعمیر میں ان پیائشوں اور اقدار کی موجودگی محض ایک ارتقائی امر کے سوا کچھ نہیں ہے۔" اہرام کے محققین نے اہرام کی تعمیر سے متعلق ریاضی کے رمز و قوانین (Codes) کی جلدوں کے ڈھیر لگا دیئے ہیں۔ اس تعمیر میں ہمارے سیّارے کا محیط' کئی اعشاریہ کے نیچے تک ایک سال کی پیائش اور لمبائی' روشنی کی رفتار' زمین کی کثافت' کشش ثقل کی حالت' اسراع (Acceler-ation) وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ان میں چند ایک پیائشیں ہمارے خلائی پروگرام کی مدد سے ثابت بھی ہو چکی ہیں۔ ہماری زمین کے گرد چکر لگانے والے مصنوعی سیاروں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمارے اس سیارے کا قطبی نصف قطر ۳۹۴۹٫۸۹ میل ہے اور یہ بات بھی اس اہرام کی تعمیری پیائش سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس سنگی صندوق یا تجوری کی بھی پیائش کی جا چکی ہے جو اس اہرام کے دیوان شاہی (king's Chamber) میں رکھی ہوئی ہے۔ اس صندوق کے اندرونی حجم یا وسعت کی پیائش کی گئی تو وہ بائبل میں دی گئی کشتیِ نوحؑ کی پیائش کے برابر نکلی۔ ممتاز مذہبی علماء کا خیال ہے کہ کشتیِ نوحؑ کسی زمانے میں اس اہرام کے اندرونی حصے میں ہی رکھی گئی تھی۔

کئی برسوں کی ہٹ دھرمی کے بعد سائنس داں آخر کار یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ اس اہرام سے بے شمار اسرار وابستہ ہیں۔ ایک مشہور ماہرِ مصریات بائنک ژابا (Zbynek Zaba) نے چیکوسلاواکیا کی حکومت کے لیئے حال ہی میں ایک مقالہ لکھا ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ مصر کے یہ اہرام دیرینہ اور خود پرست بادشاہوں کے مقبرے نہیں بلکہ قدیم دنیا کی سائنس' ٹیکنالوجی اور مذہبی علوم کے دائمی سنگی آثار و یادگار ہیں۔ ان اہرام کی پوشیدہ قوتوں اور اسرار کے بارے میں ذہنِ انسانی میں بے شمار سوالات پیدا ہوتے ہیں جن میں سے اکثر ابھی تک تشنہ جواب ہیں اور جن کے جواب مل بھی گئے ہیں وہ بھی قطعی ناکافی ہیں بہر حال یہ حیرت انگیز اور محیر العقول تعمیرات ہمارے اجداد کا ہمارے لیئے ایک بیش قیمت ورثہ ہیں۔ ایک ایسا ورثہ جو صدیوں سے پتھروں اور ریاضی کی زبان میں اپنی سرفرازی کی سرمدی داستان سنا رہا ہے۔

☆

دنیا کے پراسرار اہرام

شاید قدیم دنیا کا ایک عظیم ترین عجوبہ ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے کی ایک دور دراز وادی میں چھپا ہوا ہے۔ یہ ایک عظیم الشان دیو ہیکل اہرام ہے جو سفید جھلملاتے پتھروں کی دیواروں میں بند ہے اور جس کی چوٹی پر ہیروں جڑا تاج جگمگا رہا ہے۔ جس کی کہانیاں صدیوں سے ایشیا کے داستان گویوں کی زبان پر ہیں۔ اس عجوبۂ روزگار اہرام کا صحیح محلِ وقوع تو معلوم نہیں ہو سکا ہے تاہم دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں ایک امریکی ہواباز نے ان پہاڑوں پر سے پرواز کرتے ہوئے اس کے مشاہدے کی خبر ضرور دی تھی۔

"میں جانتا ہوں اس سفید اہرام کی داستانیں بالکل سچی ہیں۔ میں نے خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے"۔ نیواورلینس (New Orleans) سے تعلق رکھنے والے جنگِ عظیم دوم کے ایک ہواباز جیمز گاسمین نے جو اب آنجہانی ہو چکا ہے، اپنی رپورٹ میں بتایا کہ کارگو جہاز اڑاتے ہوئے اس شخص نے اس عظیم پہاڑی سلسلے کی ایک وادی میں یہ حسین و حیرت انگیز عمارت دیکھی تھی۔ وہاں گمشدہ شہروں کے کھنڈرات بھی تھے اور اس ویرانے میں شکستہ عمارات بھی تھیں مگر اہراموں نے ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے کو ایک عجیب سی سرّیت کا حامل بنا دیا تھا۔ گاسمین جنگ عظیم دوم میں موت کی وادی پر سے اپنے کارگو جہاز میں محوِ پرواز تھا۔ یہ انڈیا اور چین کے درمیان بلند و بالا سنگی چٹانوں کا ایک پانچ سو میل طویل سلسلہ تھا۔ اس جان لیوا فضائی آپریشن کا مقصد چینی فوجوں کو جو جاپانیوں کے خلاف برسرِ پیکار تھیں، گنوں اور دیگر سامان کی سپلائی تھا۔ اگر یہ باربردار طیارے جاپانیوں کے جنگی طیاروں کی گولیوں کا نشانہ بننے سے بچ جاتے تو انہیں ایک اور قدرتی آفت یعنی ایشائی مان سونوں یا تبت کے برفانی طوفانوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان کے علاوہ پہاڑوں اور وادیوں پر پھیلے ہوئے گہرے کالے بادل بھی ان پروازوں کے لیے سنگین خطرہ تھے۔

بعض پروازیں تو ایک خوفناک خواب کی طرح تھیں۔ جنگ کے خاتمے کے کئی برس بعد گاسمین نے بتایا "اگر ہمارا جہاز پہاڑوں سے بلند نہ ہوتا تو اس کے پر برف کی طرح منجمد ہو جاتے اور اگر پہاڑوں میں سے پرواز کرتے تو پھر گہرے کہر اور بادلوں کی مصیبت تھی۔ ایمونیشن سے بھرے ہوئے چرچراتے ہوئے طیارے کو ان حالات میں اڑانا بڑا اعصاب شکن کام تھا۔ اگر کہر اور بادلوں کی وجہ سے بصارت زیرو ہو جاتی تو پھر طیارے کا خدا ہی حافظ تھا۔ ہمارے کئی طیارے اسی وجہ سے پہاڑوں سے ٹکرا کر تباہ ہو چکے تھے"۔ ۱۹۶۷ء میں گاسمین ایک ایسے ہی مشن پر تھا کہ اس کے طیارے کے ایک انجن میں خرابی پیدا ہو گئی۔ طیارے کے انجن میں کٹنگ شروع ہو گئی۔ اس نے بتایا "میں نے اسے نیچی پرواز

پر ڈالا تو لگا جیسے اس کی گیس لائن منجمد ہو گئی ہو۔ دوسرے طیارے آگے نکل گئے ہمارا اصول تھا کہ اگر کسی طیارے میں اس دوران میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو وہ خود اسے سنبھالے دوسروں کو اپنا مشن جاری رکھنے کا حکم تھا۔ میں نے زگ زیگ پرواز شروع کر دی تو تھوڑی ہی دیر بعد انجن کی خرابی دور ہو گئی"۔ اس وقت گاسمین اپنی واپسی کی پرواز پر تھا اور اسے آسام پہنچنا تھا۔ "میں نے چوٹی سے طیارے کو بچایا اور پھر ایک طویل وادی پر آ گیا"۔ اس نے بتایا کہ "میرے ٹھیک نیچے ایک دیو ہیکل اہرام تھا سفید اہرام بالکل ایسا لگتا تھا جیسے وہ پریوں کا محل ہو۔ وہ جگمگاتے سفید پتھروں کا بنا ہوا تھا یا شاید کسی سفید دھات کا۔ وہ چاروں طرف سے بالکل سفید دکھائی دے رہا تھا۔ سب سے حیرت انگیز چیز اس کی چوٹی تھی جو ہیرے جواہرات کی طرح جھلملاتی تھی یا شاید وہ کرسٹل تھا جو روشنیاں بکھیر رہا تھا"۔ گاسمین نے اس پر تین چکر لگائے۔ "وہاں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں میں طیارے کو اتار سکتا۔ حالانکہ میرا بڑا جی چاہ رہا تھا کہ اس عجوبۂ روزگار عمارت کو قریب جا کر دیکھوں"۔

پہاڑوں کے اندرونی اور بیرونی حدود میں پرواز کرتے ہوئے گاسمین نے طیارے سے نیچے دریائے برہمپترا دیکھا"۔ وہ آسام کے ہوائی اڈے پر بڑی حفاظت سے اتر گیا۔ ہم نے بیس پر موجود انٹیلیجنس آفیسر کو اس سفید اہرام کی رپورٹ کی۔ وہ بتا رہا تھا اور اس نے بتایا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکا تھا اس وقت سب کے ذہنوں میں جنگ غالب تھی پھر چند ہی ہفتوں بعد میرا وہاں سے ٹرانسفر ہو گیا۔ اس کے بعد ہمیشہ سفید اہرام میرے ذہن پر سوار رہا اور جی چاہتا رہا کہ ان پہاڑوں میں کوئی مہم لے کر جاؤں اور سفید اہرام کو قریب سے دیکھوں مگر اس کے لیئے وقت، دولت اور جدوجہد کی ضرورت تھی جب کہ مجھے روزی کمانا ہی مشکل ہو رہا تھا۔

گاسمین کو یقین تھا کہ اس سفید اہرام کو کسی روز ضرور دریافت کر لیا جائے گا۔ "پتا نہیں اس میں کتنا وقت لگے گا"۔ وہ بولا "کیونکہ ہمالیائی سلسلۂ کوہ ابھی تک دریافت نہیں کیا جا سکا ہے اور نہ ہی اس کے نقشے تیار ہو سکے ہیں اور جب یہ کام ہو جائے گا تو پوری دنیا میں سنسنی پھیل جائے گی۔ اس اہرام کے گرد کچھ نہیں ہے بس ویرانے میں وہ اکیلا بڑی شان سے ایستادہ ہے میرا اندازہ ہے کہ وہ صدیوں سے وہاں موجود ہے۔ اسے کس نے بنایا؟ کیوں بنایا؟ اس کے اندر کیا ہے؟ ان سوالوں کے جواب شاید مجھے کبھی نہ مل سکیں۔ گاسمین کی ایشیا کے اس سفید اہرام کی داستان پتا نہیں جھوٹی ہے یا سچی ہے۔ اس نے خود تسلیم کیا کہ اس کے پاس اس کی موجودگی کا کوئی مادّی ثبوت نہیں ہے۔ تاہم اہرام کے متبدی اس بات کی طرف ضرور اشارہ کرتے ہیں کہ اس قسم کی چو سطح مجسم (Tetrahed-ron-Shaped) عمارات تقریباً ساری دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ مہم جو متلاشی سیاح، عسکری طالع آزما، سائنس دان اور دفینوں کے متلاشی حضرات جو دنیا کے نامعلوم خطوں سے لوٹتے ہیں گمشدہ اہراموں کی داستانیں ضرور سناتے ہیں۔

"ایک فضائی نظارہ بھی نیچے قدرتی پہاڑوں کو اہرام کا روپ دے سکتا ہے"۔ ڈاکٹر روزن برگ نے کہا۔ اہرام اکثر جھاڑ جھنکار اور دیگر خودرو پودوں سے ڈھکے ہوتے ہیں۔ وسطی اور جنوبی امریکہ کے

اہرام تو زیادہ تر اسی حالت میں پائے گئے ہیں"۔

ایسا لگتا ہے جیسے قدیم دور کے انسانوں نے زمین پر پراسرار اہراموں کا ایک جال سا بچھایا ہوا تھا۔ ان سنگی یادگاروں کی تعمیر کا مقصد اب تک سمجھ میں نہیں آسکا ہے اور نہ ہی ہم اب تک ان کی تعمیر کا راز جان سکے ہیں۔

ان عظیم الجثہ عمارتوں کی تعمیر کے سلسلے میں ان قدیم ماہرین تعمیرات کی ہنر مندی پر بحث کرتے ہوئے اکثر سائنس داں جھنجھلا اٹھتے ہیں۔ کیا ہم تاریخ دانوں پر یقین کر سکتے ہیں؟ ڈاکٹر روزن برگ چلایا۔ "ٹیکنالوجی کے علم کے بغیر، جدید تعمیری ساز و سامان و آلات کے بغیر، ایڈوانس ریاضی کے علم کے بغیر ہم سے کہا جا رہا ہے کہ ہم اس بات پر ایمان لے آئیں کہ یہ عجوبۂ روزگار اہرام قدیم زمانے کے سیدھے سادے کسانوں کے ایک گروہ نے تعمیر کئے ہیں۔ یہ تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم کہہ دیں کہ امریکہ کی یہ فلک بوس عمارتیں اسکول کے بچوں کا تعمیری کارنامہ ہیں۔ ڈاکٹر روزن برگ کو یقین ہے کہ جب اہرام کے اسرار کھلیں گے تو انسانی تخلیق کے بہت سے سربستہ رازوں پر سے پردہ اٹھ جائے گا۔ "کچھ یا شاید سارے ہی سوالوں کے جواب مل جائیں"۔ روزن برگ نے کہا۔ میں خود کو "اہرامی" ثابت کرنا نہیں چاہتا نہ ہی ان اہراموں سے میں کسی ساحرانہ قوت کے رابطہ پر یقین رکھتا ہوں۔ بس یہ یہاں سینۂ گیتی پر موجود ہیں اور کھلے اذہان والے سائنس دانوں کو ان کا مطالعہ و مشاہدہ اور تجزیہ کرنا چاہئے۔ تاہم اب تک کے سائنسی مشاہدے و تجزیے تو اہراموں کی تشریح کرنے سے قاصر رہے ہیں"۔ عرب کی ایک لوک داستان کے مطابق ان اہراموں کا تعلق بائبل میں درج عظیم سیلاب سے ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی انگلینڈ کی بوڈلین لائبریری میں ایک عرب تاریخ داں ابو بلخی کا تحریر کردہ ایک نسخہ محفوظ ہے جس میں وہ رقم طراز ہے

"اس دور کے عقل مند لوگوں نے پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا قدرت کی طرف سے آگ یا پانی کا ایک ایسا طوفانِ عظیم آنے والا ہے جو ہر

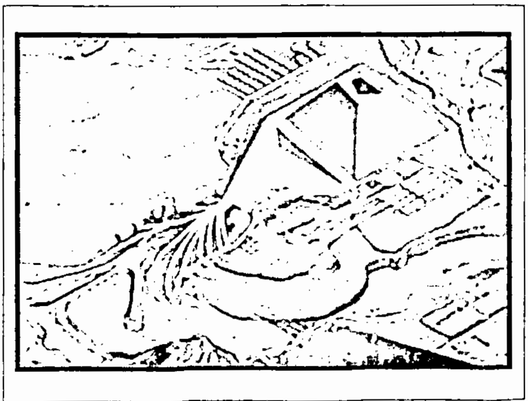

دریائے نیل کے کنارے واقع اہرام کی مثلث شکل کے بارے میں ماہرین کہتے ہیں کہ جو کوئی چیز بھی مثلث شکل کے حصار میں آئے گی اس پر مقناطیسی لہریں مرکوز ہو جائیں گی جس کی وجہ سے اس کے اندر موجود کوئی چیز گلے سڑے گی نہیں۔ شاید اسی لئے مصر کے فرعونوں نے حنوط شدہ لاشوں کو بوسیدہ ہونے سے ہمیشہ کے لئے بچانے کی خاطر انہیں مثلث کی صورت دی اور دریائے نیل کی قربت ان اہراموں کو اس لئے بھی نصیب ہوئی کہ قدیم مصر کے فرعونوں کی یہ عظیم تہذیب دریائے نیل کے کنارے پروان چڑھی جس کی وجہ سے وہ اناج یا غلہ اگاتے تھے اور پینے کا پانی استعمال کرتے تھے۔

چیز کو نیست و نابود کر کے رکھ دے گا۔ اس مہیب عذاب سے بچنے کے لیئے انھوں نے بالائی مصر کے پہاڑوں پر یہ سنگی اہرام بنائے تھے۔ یہ اہرام گویا ان لوگوں کی وہ پناہ گاہیں تھیں جو انھوں نے اسی الوہی عذاب سے بچنے کے لئے تعمیر کی تھیں۔ ان میں دو عمارتیں باقی عمارتوں سے زیادہ بلند تھیں۔ یہ دونوں چار سو ساعد (ہاتھ) بلند اور اتنی ہی لمبی اور چوڑی تھیں۔ انہیں سنگِ مرمر کی بڑی بڑی سلوں سے تعمیر کیا گیا تھا اور یہ سلیں ایک دوسرے پر اس نفاست سے رکھی اور جوڑی گئی تھیں کہ کہیں ذرا سا بھی خلا یا جوڑ نظر نہیں آتا تھا۔ ان عمارتوں کے اندر طبیعیات کا ہر عجوبہ اور دلکشی تحریر تھی"۔

یو ایس آرمی کی فائلوں میں چین کے "شینسی اہرام" کا فوٹو گراف دبا پڑا ہے۔ اس فوٹو گراف سے جو نیچی پرواز کرتے ہوئے ایک فوجی باربردار طیارے کے ذریعے کھینچا گیا تھا، پتا چلتا ہے کہ چین کے دارالحکومت سیان فو سے جو بیکنگ سے بھی پرانا ایک دیوار بند (فصیل بند) شہر تھا، یہ دیوزاد عمارت کئی روز کی مسافت پر مغرب کی جانب واقع تھی۔

۱۹۱۲ء میں فریڈ میسٹر شروڈر اور اس کا شریک کار آسکر میمان چین کے جنگی سرداروں کو گنیں اور دیگر سامان سپلائی کیا کرتے تھے۔ فریڈ میسٹر کا کہنا ہے کہ جب ہم سیان فو میں تھے تو ہم نے اس اہرام کے بارے میں سنا۔ ایک بدھسٹ پادری نے بتایا کہ وہ اہرام شہر کی مغربی سمت میں واقع ہے۔ ہم اس قدیم کاروانی شاہراہ پر گھوڑوں پر سوار دو روز تک چلتے رہے جو بحیرہ روم سے ہوتی ہوئی بیکنگ میں سے گزر رہی تھی۔ راستے میں ہم اہرام کے بارے میں دریافت کرتے رہے۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ اہرام شمال میں اب صرف ایک دن کی مسافت پر تھا۔

اگلی سہ پہر کو فریڈ اور اس کے ساتھی کو اہرام نظر آ گیا۔ وہ تقریباً ایک ہزار فٹ بلند تھا اور اس کی اساس (Base) پندرہ سو فٹ میں پھیلی ہوئی تھی۔ فریڈ نے بتایا۔ "اس طرح سے وہ مصر کے عظیم اہرام سے بھی بڑا الگ رہا تھا"۔ اہرام کے چاروں اطراف کی قطب نما کے ذریعے سمت بندی کی گئی تھی۔ بعد میں جب فریڈ اور اس کا ساتھی لاما راہبوں کی ایک خانقاہ میں گئے تو انہیں بتایا گیا کہ یہ اہرام کم از کم چھ ہزار سال پرانا تھا۔

۱۹۳۰ء میں جب ایک عسکری طالع آزما (Soldier of Fortune) فرینک اسٹیفن نے بھی مشرقی ممالک میں آوارہ گردی کے دوران میں شینسی اہرام کے بارے میں سنا "شینسی اہرام شاید دنیا کی سب بڑی انسانی ہاتھوں سے تعمیر کی گئی عمارت ہے۔ اس نے بتایا۔ فریڈ اور میمان نے اس کی بلندی ایک ہزار فٹ بتائی ہے جب کہ میرے اندازے کے مطابق اس کی بلندی بارہ سو فٹ سے ہرگز کم نہیں ہے اہرام کی ہر چہار جانب مختلف رنگ کیا ہوا ہے۔ مشرق کی طرف سبز، جنوب میں سرخ، مغرب میں سیاہ اور شمالی جانب سفید۔ اہرام کی چوٹی ہموار اور عریاں ہے اور اس پر زرد رنگ چمک رہا ہے"۔

اسٹیفن کو شینسی کی تعمیر کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ "اس کی بیرونی دیوار عام سے پتھروں کی بنی ہوئی ہے جب کہ اصل عمارت گوندھی ہوئی مٹی سے تعمیر کی گئی ہے۔ یہ چینیوں کے ہاں کا خاص طرزِ تعمیر ہے وہ لوگ عام مٹی میں چونا اور چکنی مٹی ملایا کرتے تھے۔ جلد ہی یہ ملغوبہ سیمنٹ کی طرح

سخت ہو جاتا ہے۔ حالانکہ یہ اہرام بڑی مہارت سے بنایا گیا ہے تاہم اس میں ٹوٹ پھوٹ کے آثار نظر آنے لگے ہیں پتھر اور ملبہ بکھرا پڑا ہے اور دیوار میں جگہ جگہ سوراخ اور دراڑیں پڑ چکی ہیں۔

اسٹیفن کی رپورٹ کے مطابق شینسی کے علاقے میں مسطح چوٹی والے سات اہرام تھے "بڑے والے کے قریب ایک ہموار چوٹی والا اہرام تھا جو فضا میں پانچ سو فٹ تک بلند تھا"۔ اس نے بتایا۔

اہرامِ مصر کی ساخت ہر لحاظ سے نپی تلی ہے جو جنوبی زاویئے پر رکھ کر اس قدر صحت و درستی اور باریک بینی سے بنائے گئے کہ آج کے ماہرین کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے کیونکہ اس کی تعمیر تقریباً ساڑھے تیرہ ایکڑ رقبے پر محیط ہے، پھر بھی پیمائش میں بال برابر فرق نہیں اور یہ ۶۵،۳۴،۰۰۰ مربع گز پر تعمیر ہیں۔ ان کے معماران کو جیومیٹری اور ٹریگنومیٹری کے علوم پر مکمل عبور تھا۔ یہ اہرام سرزمینِ مصر کے مرکز پر واقع ہیں اور قدیم دنیا کے مرکز پر بھی مگر سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کرۂ ارض میں آج کی دنیا کی زمینی سطح کے مرکز پر بھی ہیں۔

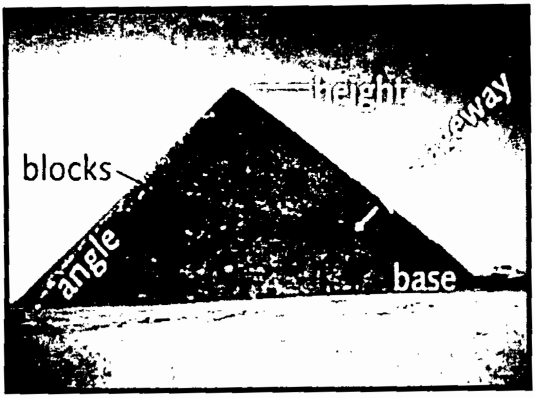

"دوسرے اہرام سے تقریباً ایک میل پر ایک اور اہرام تھا ان سے کئی میل دور چار اور اہرام تھے جو ٹھیک شمال جنوبی سمتوں میں ایستادہ تھے۔

ان اہراموں نے اسٹیفن کے ذہن کو الجھا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے مقامی لوگوں سے ان کے بارے میں بہت پوچھا مگر کوئی بھی شخص کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکا۔ مقامی لوگ اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ انہیں کس نے تعمیر کیا تھا۔ اسٹیفن کا بیان تھا۔ "بس ہر ایک کی زبان پر یہی بات تھی کہ جیسے یہ اہرام ہمیشہ سے ہی یہیں تھے۔ یو ایس آرمی کی طرف سے ایک فوٹو گراف ۱۹۴۷ء میں جاری کیا گیا تھا اور اخبارات میں شائع ہوا تھا۔ یہ فوٹو دیکھ کر مجھے وہ دن یاد آگئے جب میں چین کے میدانوں میں اور پہاڑوں پر آوارہ گردی کر رہا تھا۔ مجھے ہمیشہ اس بات پر حیرت رہی کہ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے یہ حیرت انگیز اہرام تعمیر کئے تھے اور یہ بھی کم حیران کن بات نہیں تھی کہ آخر شینسی کے میدانوں میں انہیں کیوں تعمیر کیا گیا تھا۔

ہاں جب چین کے گرد پھیلا ہوا بمبو کرٹین (سخت پابندی)(Bamboo Curtain) ہٹے گا تو شاید سائنس داں شینسی کے ان اہراموں کے بارے میں کچھ جان سکیں۔ ۱۹۳۷ء میں ماؤزے تنگ کا لانگ مارچ صوبہ شینسی کے شمالی شہر یمن (Yeman) میں ختم ہو گیا تھا۔ اسٹیفن نے بتایا۔ "یہ علاقہ ۱۹۴۷ء تک چینی کمیونسٹوں کے قبضے میں رہا۔ اس وقت وہ پورے چین پر اپنا تسلط قائم کر چکے

تھے۔ اس کے بعد سے چین کے بارے میں خبروں پر سخت پابندی رہی۔ شاید چند برسوں بعد ہی کوئی مہم شینسی کے لئے ترتیب پا سکے اور ان اہراموں کے اسرار جان سکے۔

شینسی کے اہراموں کے معمار جو لوگ بھی تھے وہ وسطی ایشیا تک جا پہنچے تھے اور شاید انہی لوگوں نے بامیان کے مجسمے تراشے تھے جن کے بارے میں ہم ابھی تک بہت کم جان سکے ہیں۔ یہ مجسمے ان گنت صدیوں سے قدرتی آفات اور طوفان کا بڑی کامیابی سے مقابلہ کرتے رہے ہیں۔ اپنی کتاب "پوشیدہ عقائد" (Secret Doctrine) میں میڈم بلاوٹسکی (Madame Blavatsky) لکھتی ہے:

"بامیان وسطی ایشیا میں کابل اور بلخ کے درمیان کوہ بابا کے قدموں میں جو ہندوکش سلسلہ کا ایک بلند پہاڑ ہے اور سطح سمندر سے ۸۵۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے، ایک چھوٹا سا خستہ حال اور اجاڑ سا قصبہ ہے۔ پرانے زمانے میں بامیان قدیم شہر جول جول (Djooljool) کا ایک حصہ تھا جسے تیرھویں صدی عیسوی میں چنگیز خان نے مکمل طور تاخت و تاراج کر دیا تھا"۔

"پوری وادی دیو پیکر چٹانوں سے گھری ہوئی ہے جن میں کچھ مصنوعی کچھ قدرتی غاروں اور کھوہوں کا جال سا بچھا ہوا ہے۔ یہ غار کسی زمانے میں بدھ راہبوں اور بھکشوؤں کا مسکن تھے۔ ان غاروں کے سامنے پانچ عظیم الجثہ مجسمے ہیں جو بدھا کے بتائے جاتے ہیں اور انہیں اس صدی میں دریافت یا دوبارہ دریافت کیا گیا ہے کیونکہ مشہور چینی سیاح ہیون سانگ کے سفر نامے میں ان کا تذکرہ موجود ہے کہ جب وہ ساتویں صدی میں بامیان آیا تھا تو اس نے بدھا کے یہ مجسمے دیکھے تھے"۔

میڈم بلاوٹسکی نے بامیان کے ان مجسموں کا دوسری یادگاروں سے موازنہ کیا ہے اس طرح وہ لکھتی ہے۔ "بامیان کا سب سے بڑا مجسمہ ۱۷۳ فٹ بلند ہے جو موجودہ دور کے نیویارک میں ایستادہ مجسمۂ آزادی سے ستر فٹ زیادہ بلند ہے"۔ موازنے ہی کی خاطر میں بتانا چاہوں گا کہ جنوبی ڈیکوٹا کے نیشنل میموریل ماؤنٹ رشمور میں تراشے گئے مختلف صدور کے مجسموں کی پیشانی سے ٹھوڑی تک پیائش ساٹھ فٹ ہے۔ بامیان میں یہ مجسمے کس نے ایستادہ کئے؟ شاید یہ وہی معمار تھے جنھوں نے قدیم ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اہراموں کا جال بچھایا تھا۔ "پراناز" ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں سے ایک قدیم کتاب ہے۔ ڈاکٹر روزن برگ نے بتایا۔ "ان کتابوں کے مطالعہ سے ہندوستان میں بیسیوں اہراموں کی موجودگی کا پتا چلتا ہے جو قبل از تاریخ کے تعمیر شدہ تھے۔ یہ عمارتیں اس قدر پرانی ہیں کہ اب ریت کے ڈھیر میں بدل چکی ہیں یا وحشیوں کے ہاتھوں تباہ ہو چکی ہیں یا انہیں گرا کر قدیم شہر اور قصبے تعمیر کئے گئے ہیں۔ ہمارے اپنے ملک میں پرجوش ماہرینِ بشریات (Anthropol-ogists) نے الینوائے میں کے ہوکیا ماؤنڈس اسٹیٹ پارک کولنس ول (Cahokia Mounds State Park, Collinsville,Illinois) میں بھاری بھر کم اہرام کے اسرار جاننے کے لیئے اس کی کھدائی شروع کر دی ہے۔ مٹی کا یہ حیرت انگیز اہرام سینٹ لوئس (لوئی) کے زیریں علاقے میں چند منٹ کے فاصلے پر واقع ہے۔ ایک سو فٹ اونچا ایک سو فٹ لمبا اور ایک سو فٹ چوڑا کے ہوکیا،

کا یہ اہرام اساس(Base) میں مصر کے عظیم اہرام سے بھی بڑا ہے۔

ماہرین کا اندازہ ہے کہ اہرام کے مقام تک اکیس ملین کیوبک فٹ مٹی لانے میں معماروں کو دو سو پچاس سال لگے تھے اس مقصد کے لیئے انھوں نے چقماق یا سخت پتھروں والے اوزار اور ٹوکریاں استعمال کی تھیں۔ حالانکہ کے ہوکیا اہرام امریکہ کی سب سے بڑی قبل از تاریخ عمارت ہے تاہم اسے حالیہ کھدائی شروع ہونے سے پہلے تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔

"ہم نے کبھی اس کے بارے میں سوچا ہی نہیں"۔ کولنس ول کے ایک تاجر نے اہرام کے بارے میں اس شہر کے لوگوں کے رویے کے بارے میں بتایا۔ "یہ ہمیشہ سے ہی یہاں موجود ہے اور ہم اس پر کھیلتے کودتے چھوٹے سے بڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے لئے تو یہ بس ایک پر لطف سی جھاڑیوں اور گھاس سے ڈھکی ہوئی پہاڑی ہے"۔

یہ اہرام علاقے میں پھیلے وسیع کھنڈرات کا ایک حصہ ہے۔ سینٹ لوئی کی واشنگٹن یونیورسٹی کے ماہر بشریات ڈاکٹر نیلسن ریڈ کو جو اس کھدائی میں شریک تھے یقین ہے کہ "یہ انڈینز کی گمشدہ تہذیب کا ایک حصہ ہے جس میں قربان گاہیں، سورج دیوتا، اہرام، عظیم دیوار اور انسانی قربانی کی علامتیں اب تک موجود ہیں"۔ موجودہ علم کے مطابق کے ہوکیا ڈھائی لاکھ انڈینوں کا گھر تھا۔ اس طرح سے یہ ہماری سرحدوں پر سینکڑوں برسوں تک کے ہوکیوں کی سب بڑی آبادی رہی ہے۔ ۷۰۰ عیسوی میں مستقل آبادی کے لئے یہ مقام شاید آوارہ گرد انڈینوں نے پسند کیا تھا جو یہاں مچھلی اور دیگر جانوروں کے شکار کے لیئے آیا کرتے تھے۔ ان کے بعد آنے والی نسلوں نے پھر یہاں کی زرخیز زمین پر غلہ اگایا اور یوں ایک زرعی معاشرہ کی بنیاد ڈالی۔ پھر کسی دور میں ان لوگوں نے دوسرے قبائل سے تجارتی روابط قائم کر لیئے جو بڑھتے بڑھتے راکی ماؤنٹین سے بڑھ کر مشرقی ساحلوں تک پہنچ گئے۔ اس کے بھی بعد کے ادوار میں کے ہوکین نے اپنے شہر سے تقریباً ایک ہزار میل دور تک کے رقبے میں اپنی چھوٹی چھوٹی بستیاں قائم کر لیں۔ یہ بستیاں انھوں نے جارجیا، مس سی پی، کنساس، وسکانسن، ارکنساس اور منی سوٹا کے علاقوں میں آباد کی تھیں۔ سلطنت روما کی بیرونی چوکیوں کی طرح یہ کالونیاں تجارت اور دوسرے قبائل پر قبضہ برقرار رکھنے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ ماہر بشریات کا دعویٰ ہے کہ ہوکینس نے تقریباً پانچ سو سال تک بڑے کروفر سے حکومت کی تھی۔

پھر اس شہر کو زوال کیوں آگیا؟ ماہر بشریات کا خیال ہے کہ کولمبس کے اسپین سے روانہ ہونے سے سو سال پہلے کے ہوکین سلطنت کو زوال آنا شروع ہو گیا تھا۔ شاید آب وہوا بدل گئی ہو، شاید قحط سالی نے ڈھائی لاکھ کی آبادی کے شہر پر حکومت کرنے والے حکمراں کے لئے مسائل اور مشکلات پیدا کر دی ہوں، شاید جنگلی بھینسوں کے طوفانی غول کا رخ اس طرف مڑ گیا ہو اور انھوں نے راہ میں آنے والی ہر چیز کو تہس نہس کر کے رکھ دیا ہو۔ ۱۷۰۰ عیسوی میں جب فرانسیسی مہم جو اس علاقے میں آئے تو اس علاقے کے انڈینز نے انہیں بتایا کہ کے ہوکین کو عظیم روح(Great Spirit) نے تباہ کر دیا تھا۔

اس ضمن میں مجھے یقینِ واثق ہے کہ یہ دیو پیکر اہرام ہی کے ہوکین سلطنت کے زوال وانحطاط کا باعث بنا تھا۔ اہرام کی تعمیر کی خاطر اکیس ملین کیوبک فٹ مٹی لانے کے لئے قبیلے کے مضبوط جسموں والے آدمیوں کی ضرورت تھی۔ اپنے دس سے بیس فی صد صحت مند مردوں کو اہرام کی تعمیر میں لگانے کا نتیجہ یہی نکل سکتا تھا کہ ان کی افرادی قوت کمزور پڑ جاتی اور یقیناً ایسا ہی ہوا تھا اور دوسرے قبائل کے جنگجو گروہ جو تباہی و بربادی پھیلانے اور لوٹ مار کرنے کی تاک میں رہتے تھے کہ کے ہوکین کے اس طرح کمزور ہو جانے والے دفاع کو توڑنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور شہر کو تاخت و تاراج کر کے رکھ دیا تھا۔

الینوائے (Illinois) سے قطع نظر ہمیں ولیز، مونٹانا کی مختصر آبادی کے قریب اہراموں کا ایک اور دلچسپ سلسلہ دیکھنے کو ملا۔ یہ چھوٹے چھوٹے پراسرار اہراموں (Mini-Pyramids) کی ایک زنجیر تھی جو اس آبادی کے شمال میں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی اہرام تین فٹ سے زیادہ بلند نہیں تھا۔ "دی مونٹانا ہسٹوریکل سوسائٹی کے مطابق یہ ننھے اہرام گڈریوں کے کسی نامعلوم گروہ کی کارستانی تھی۔ پویانوپ، واشنگٹن کے ایس ڈی بف میئر نے چند سال قبل خود جا کر ان ننھے اہراموں کا مشاہدہ کیا اور سوسائٹی کے نظریات کو رد کر دیا۔

بف میئر نے "دی فیٹ" میگزین کو لکھے گئے ایک خط میں دعویٰ کیا کہ یہ اہرام شمال مغربی جنوب مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ بنائے گئے تھے۔ "ان کی سمتوں اور محلِ وقوع کو دیکھ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان اہراموں کی تعمیر محض وقت گزاری کا عمل نہیں تھا۔ ان کے مشاہدے سے پتا چلتا ہے کہ انہیں ہزاروں سال پہلے تعمیر کیا گیا تھا اور ان کی تعمیر میں سائنسی اصولوں کے قدیم نظام کو سامنے رکھا گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ماہرِ بشریات کی تحقیق و تفتیش کے لیئے ان میں بے حد دلچسپ اور کارآمد مواد پوشیدہ ہے"۔

"بف میئر نے اپنی رپورٹ میں یہ نہیں بتایا کہ یہ ننھے اہرام پتھروں سے تعمیر کئے گئے تھے یا مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ چونکہ میں خود اس جگہ تک نہیں جا سکا ہوں اس لئے میں بھی مزید تفصیلات مہیا کرنے سے قاصر ہوں"۔ ڈاکٹر روزن نے کہا "مجھے یقین ہے کہ دنیا ایسے گمشدہ اہراموں سے بھری پڑی ہے۔ یہ سلسلہ ہزاروں برسوں پر محیط ہے۔ ان صدیوں میں ارضی ساخت میں تبدیلی، خراب موسم، اور قدرتی نشوونما نے یقیناً ان اہراموں کی صورتیں بدل کر رکھ دی ہیں"۔

مونٹانا کی ساج برش (مرواجیسے پودے) کنٹری کے ننھے اہراموں کے مزید تذکرے سے قبل ہمیں ذرا ایک نظر ایریزونا میں جیلا بینڈ (Gila Bend) کے قریب بینڈراک ریزروائیر (Pained Rock Reservoir) کے اہرامی ٹیلے پر بھی ڈال لینی چاہئے۔ یہ ننھا اہرام یونیورسٹی آف ایریزونا کے ماہرِ بشریات نے ۱۹۵۹ء میں دریافت کیا تھا۔ ان کا نظریہ ہے کہ اس مسطح چوٹی والی عمارت کو قدیم انڈین اپنی مذہبی رسومات کے لئے استعمال کیا کرتے تھے۔

ایریزونا کے اس اہرام کی تاریخ کے ہوکیا اہرام کی طرح ۹۰۰ سے ۱۱۵۰ عیسوی ہی بتائی گئی ہے۔

اس بات کے بھی اشارے ملے ہیں کہ اس ننھے اہرام میں جنوب مغربی انڈینز نے میکسیکن کلینڈر کی کئی بار توسیع کی تھی۔ اس دور کے رواج کے مطابق ان اہراموں میں ہر باون سال بعد توسیع کی جاتی تھی۔ ایک ماہرِ آثارِ قدیم نے بتایا۔ "ان کے کلینڈر کے باون سال جدید کلینڈر کے سو سال کے برابر ہوتے تھے"۔

اگر ننھے (منی) اہراموں کا وجود تھا تو امید کی جا سکتی تھی کہ ان میں سے کسی اہرام کے اندر بشریات کی کسی گمشدہ کوٹھری میں کوئی ننھی سی ممی (Miniature Mummy) بھی مل سکتی تھی اور ۱۹۳۲ء میں ہماری یہ امید پوری ہو گئی جب کیسپر وائیومنگ (Casper, Wyoming) کے مغرب میں پچاس میل دور واقع سان پیڈرو کے پہاڑوں میں ہمیں ایک ایسی ہی ممی مل گئی۔ اس علاقے میں سونے کے دو متلاشیوں نے ایک گھاٹی میں پتھر کی ایک دیوار دیکھی تو حیران رہ گئے۔ تاریخ سے کچھ پتا نہیں چلتا کہ یہ دیوار انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی تھی یا قدرتی صناعی تھی۔ بس اتنا معلوم ہو سکا کہ اس میں سنگِ خارا (Granite) استعمال کیا گیا تھا۔ ان دونوں متلاشیوں کو دیوار کے پتھروں میں سونے کی جھلک نظر آئی انھوں نے ایک مقام منتخب کیا اور ڈائنامائٹ کی مدد سے اس حصہ کو اڑا دیا۔ گرد و غبار صاف ہوا تو دونوں مہم جو حیرت زدہ رہ گئے ان کے سامنے پتھروں میں ایک بڑا سا شگاف تھا جس کی بلندی اور چوڑائی چار فٹ اور گہرائی تقریباً پندرہ فٹ تھی۔ اس شگاف، غار یا زمین دوز حجرے میں ایک چودہ انچ لمبے انسان کی ممی زدہ لاش رکھی ہوئی تھی۔ دونوں آدمی سونے کو بھول گئے انھوں نے اس ممی کو ایک کمبل میں لپیٹا اور ہر ممکن تیزی سے کیسپر لوٹ آئے۔ اس چھوٹی سی ممی نے شہر میں سنسنی پھیلا دی۔ ممی اپنے پیر سمیٹے ہوئے بیٹھی ہوئی تھی اس کے دونوں ہاتھ سینے پر لپٹے ہوئے تھے۔ بندر جیسے خاکستری چہرے پر ایک آنکھ بند تھی۔ ایکس ریز سے ظاہر ہوا کہ اس کے منہ میں پورے دانتوں کا سیٹ موجود ہے۔ ایکس ریز میں اس کی چھوٹی سی کھوپڑی صحیح سلامت، ریڑھ کی ہڈی اور جسم کی ایک مکمل ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ "یہ جو کچھ بھی ہے مگر فریبِ نظر ہر گز نہیں ہے"۔ ایک قانون داں نے بتایا۔ یہ مخلوق مکمل طور پر ایک چھوٹا سا آدمی ہی ہے۔ اس چودہ انچ لمبی ممی کا وزن بارہ اونس کے قریب تھا۔ "اس کی تنگ پیشانی' چوڑے نتھنوں والے چپٹے ناک' چوڑے منہ اور

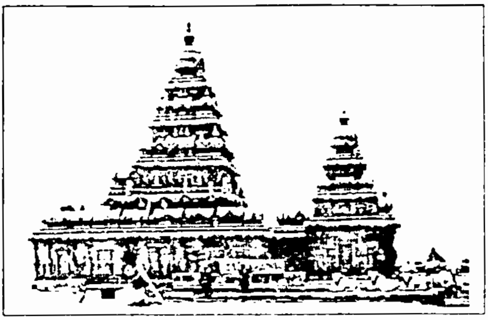

بھارت میں مدارس کے قریب مملی پورم میں واقع چٹانوں کو کاٹ کر بنائے جانے والے یہ ہندو مندر اہرام کی بہترین مثال ہیں اور ساتھ ہی درلوڑی طرزِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ بھی۔ انھیں پالاو بادشاہ نارا سم ہور من دوئم (۶۸۰ء - ۷۲۰ء) نے تعمیر کروایا تھا۔ اس کے ستون پالاوا طرز کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان مندروں کی صورت اہرام سے ملتی جلتی ہے اس لئے ماہرین آثارِ قدیمہ کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان میں بھی اہرام کی رسم موجود رہی ہے۔

پتلے پتلے ہونٹوں پر جھکی ہوئی تھی۔ "اس کی ایک آنکھ بند تھی جیسے وہ کسی کو آنکھ مار رہا ہو"۔ ایک شاہد نے بتایا۔ "اور ہونٹ یوں پھیلے ہوئے تھے جیسے شرارت سے مسکرا رہا ہو"۔ سائنس دانوں نے اس کا مشاہدہ کیا اور حیرت سے سر ہلاتے ہوئے دور ہٹ گئے۔ "یہ ایک عجوبہ ہے"۔ ماہر حیاتیات کے ایک گروپ نے رپورٹ دی۔ ایسا لگتا ہے کہ "جب اس کی موت واقع ہوئی تھی تو وہ تقریباً پینسٹھ سال کا تھا"۔

"ڈاکٹر ہنری شپیرو (Dr.Henry Shapiro) جو اس وقت امریکن میوزیم آف نیچرل ہسٹری" این تھروپولوجی ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ (Head) تھا، اس ممی کو دیکھ کر الجھن میں پڑ گیا۔ "ایکس ریز چھوٹی چھوٹی ہڈیوں کا ایک مکمل انسانی ڈھانچہ ظاہر کر رہی ہیں"۔ اس نے کہا۔ "ڈھانچے پر عجیب و غریب ساخت کی خشک کھال منڈھی ہوئی ہے۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ یہ ممی کتنی صدیوں پرانی ہے"۔

بوسٹن میوزیم کے مصری شاخ (Egyptian Department) کے مہتمم (Curator) نے بھی اس ممی کا مشاہدہ کیا اور کہا کہ یہ بالکل ان مصری ممیوں کی طرح تھی جنھیں بغیر کسی چیز میں لپیٹے کھلی ہوا میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ ششدر سائنس دانوں نے اس علاقہ پر جہاں یہ ممی دریافت ہوئی تھی بہت کم توجہ دی۔ اس ممی کے مقبرے کا احاطہ شاید کسی بڑے اہرام کا حصہ رہا ہو۔ یا اس خطہ زمین کی مناسبت سے یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ ان دونوں مہم جویوں نے انجانے میں شاید کسی ایسے ننھے اہرام ہی کو ڈائنامائٹ سے اڑا دیا تھا جس کے نقوش قدرتی نشو و نما اور ارضی ساخت میں تبدیلی نے مدہم کر دیئے ہوں۔ ایک ہزار برسوں میں تو کسی بھی خطہ زمین کی ظاہری ساخت میں تبدیلی آجاتی ہے۔

ایک اور سائنس دان ڈاکٹر ہنری فیئر فیلڈ نے اس ننھی ممی کے معائنے کے بعد ایک حیرت انگیز بیان جاری کیا اس نے کہا کہ "یہ چھوٹا سا آدمی اس دور میں اس براعظم پر آوارہ گردی کر رہا تھا جب پلائیوسین دور (Peliocene age) میں طبقات الارض میں گھمبیر تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور راکی ماؤنٹینس (Rocky Mountains) بن رہے تھے۔ اس نظریہ کے مطابق یہ شخص ان عظیم تبدیلیوں کے دوران سنگ خارا کے اس غار میں پھنس کر رہ گیا تھا"۔

الاسکا میں اہراموں کی موجودگی کی افواہ جولائی ۱۹۶۲ء میں "فیٹ" میگزین کے شمارے میں ایک خط کی صورت میں شائع ہوئیں۔ جیکسن مونٹانا کی ایک خاتون مرسیڈس بی میڈرس نے لکھا

"میں نے سنا ہے کہ الاسکا میں کیچی کن (Ketchikan) کے قریب ایک بہت قدیم گاؤں واقع ہے مجھے یقین تھا کہ یہ خبر سننے والی میں واحد فرد تھی۔ یہ جگہ ایک مہم جو نے جو چٹانوں سے پھسلتا ہوا نیچے آگرا تھا، دریافت کی تھی۔ بعد میں جب اس نے دیکھا تو وہ انسانی ہاتھوں سے بنایا ہوا ایک اہرام نکلا اس وادی میں انسانی ہاتھوں سے بنائی ہوئی نہریں بھی دریافت ہوئی ہیں جو بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں۔ میں اس جگہ سے واقف ہوں جہاں یہ کھنڈرات موجود ہیں"۔

میں خود اس جگہ گئی جہاں مجھے پتا چلا کہ وادی میں ہل چلاتے ہوئے ایک کسان نے سب سے پہلے

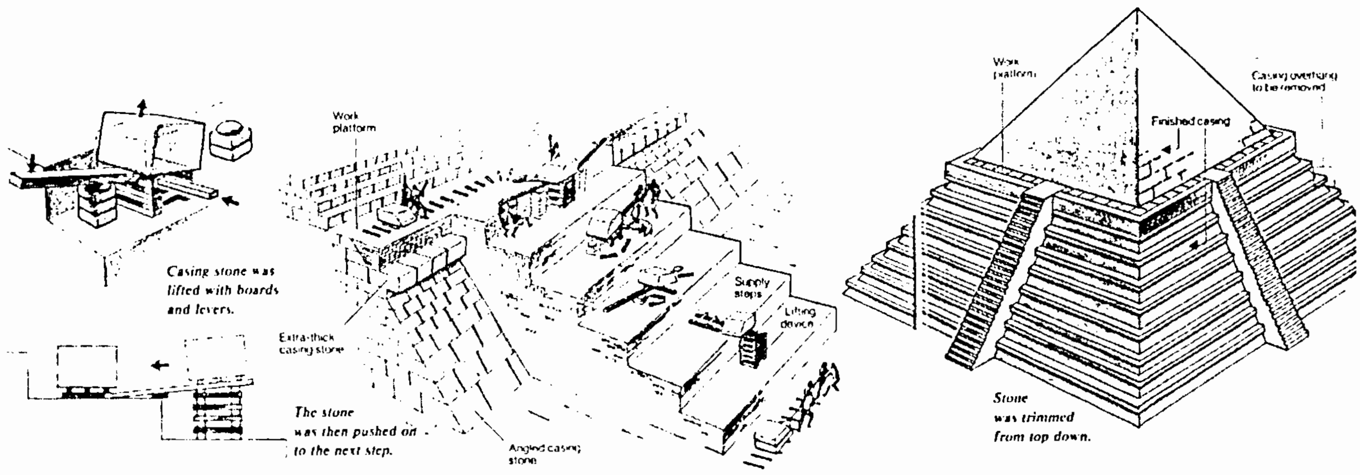

یونانی مورخ ہیروڈوٹس نے پانچویں صدی قبل مسیح میں تخمینہ لگایا تھا کہ اہرام مصر بنانے کے لئے ۵۰ ٹن کے بھاری بھر کم پتھروں کو اوپر پہنچانے کے لئے اس کے ساتھ سیڑھیاں بنا کر لیور کے ذریعے ہر ایک پتھر کو باری باری اوپر پہنچایا گیا ہوگا کئی برس سے ماہرین مصریات ہیروڈوٹس کی اس بات کو محض افسانہ قرار دے رہے تھے۔ مگر حال ہی میں کی گئی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ ہیروڈوٹس درست تھا کہ معماروں نے نیچے سے ڈھلوان بنا کر آہستہ آہستہ سیڑھیاں بناتے ہوئے اہرام کی جسامت بڑھانی شروع کی اور یوں با آسانی اوپری منزل پر بھاری پتھر نصب کئے گئے۔ بعد ازاں اس کے درمیان کی جگہ کو مزید پتھروں سے بھر کر اس میں اس خوبی سے مسالہ لگایا گیا کہ جسے دیکھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

ان کھنڈرات کو دیکھا تھا۔ پرانے کھنڈرات میں گمشدہ اہراموں کی موجودگی کو لوک داستانوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ بعض اوقات کوئی مہم جو ان داستانوں کا تعاقب کرتا ہوا انہیں سچ بھی ثابت کر دیتا ہے۔ کالج سے نو فارغ شدہ مائیکل پائی سل نے بھی یہی کیا اور ۱۹۵۰ء کے دوران میکسیکو کے علاقے میں بیسیوں حیرت انگیز چیزیں دریافت کر لیں۔ مائیکل میکسیکو میں چھٹیاں گزار رہا تھا کہ اس نے کنتانا رو (Quintana Roo) کے نقشوں پر جو برطانوی ہنڈوراس (Honduras) کے شمال میں میکسیکو کی سرحدی پٹی میں واقع ہے' خالی جگہ دیکھی تو بڑی الجھن میں پڑ گیا۔ مائیکل نے دیکھا کہ اس ساحلی پٹی پر ایک ایک دن کی مسافت پر کئی قصبے ہیں۔ اس نے کنتانا رو جانے کا فیصلہ کر لیا جو امریکہ کی سب سے زیادہ وحشیانہ ساحلی پٹی ہے۔

جنگلات کی وحشتنا کی کا پوری طرح ادراک کئے بغیر اس نے میکسیکو سٹی سے ایک بس پکڑی۔ جزیرہ کوزومل (Cozumel) تک ایک طیارہ چارٹر کیا پھر خلیج میکسیکو پار کرنے کے لیے ایک ماہی گیر کی کشتی میں لفٹ لی۔

ماہی گیر نے مائیکل کو ساحل کے قریب ایک انڈین خاندان کے جھونپڑے کے قریب اتار دیا اور وعدہ کیا کہ وہ اس کے لئے خوراک وغیرہ لے کر چند روز بعد لوٹ آئے گا۔ ایک ہی ہفتے بعد مائیکل کو احساس ہو گیا کہ وہ اس ویران ساحل پر پھنس کر رہ گیا ہے۔ انڈینوں نے اسے بتایا کہ کشتی شاید مہینوں تک واپس نہ آئے۔ انہوں نے مائیکل کو اس کی خوش خوراکی کا احساس بھی دلایا ہمارے ہاں پہلے ہی خوراک کی کمی ہے۔ ایک انڈین نے اس سے کہا۔ ''کہیں اور جاؤ''۔

مائیکل اب یہ بھی جان گیا تھا کہ نقشے میں دکھائے گئے قصبوں کا کہیں وجود نہیں تھا یہ نقاط محض نقشہ ساز کے ذہن کی اختراع تھے۔ اب اسے قریب ترین قصبے تک جو تقریباً دو سو میل دور تھا جانے کے لیے محض اپنی قسمت پر بھروسہ کرنا تھا۔ اس نے اپنے سینڈل باندھے۔ تھیلا کاندھے پر لٹکایا اور خطرناک جنگلوں میں گھس گیا۔ ہفتوں پر محیط اس سفر کے دوران اسے باقی انڈینوں، ڈاکوؤں، خنجر بدست کارکنوں اور جنگل کی قدرتی آفات کا سامنا کرنا پڑا اس نے یہ بھی دیکھا کہ جنگل کی وسعتوں میں جگہ جگہ مایان کے کھنڈرات بکھرے ہوئے تھے جن میں سے کئی ایک بے شمار اہرام بھی موجود تھے۔ وہ کئی پوشیدہ گزر گاہوں سے گزرا اور گمشدہ قصبوں کا سراغ لگایا۔ ایک جگہ سے اسے سبز یشب (Jade Jewelery) کے زیورات بھی ملے۔ اس کے اس سفر کی داستان ''کنتانا رو کی گمشدہ دنیا'' (The Lost World of Quintana Roo) نامی کتاب میں موجود ہے۔ مائیکل کے ان نئے اہراموں کی دریافت کے علاوہ میکسیکو میں، میکسیکو شہر سے باہر دوسرے کھنڈرات کے علاوہ سورج اور چاند کے اہرام بھی ہیں۔ سورج کے اہرام کی پیمائش ۶۱ x ۲۱۷ فٹ ہے اور اس کی اساس (Base) مصر کے شی اوپس اہرام سے بھی بڑی ہے۔ مسطح چوٹی والے یہ دونوں اہرام ٹھیک شمالاً جنوباً تعمیر کئے گئے ہیں۔ اگر اس وادی میں شمالاً جنوباً خط کھینچا جائے تو یقیناً وہ ان دونوں اہراموں کے مرکز سے گزرے گا۔

روزن برگ کا کہنا ہے کہ جب کورٹز(Cortez) میکسیکو پہنچا تو اسے ہر جگہ اہرام نظر آئے تھے۔ اسپین کے بادشاہ چارلس پنجم کے نام اپنے خط میں کورٹز نے لکھا تھا کہ صرف چولولا(Cholula) میکسیکو میں وہ اب تک چار سو کے قریب اہرام دریافت کر چکا ہے۔

ڈاکٹر روزن برگ نے میکسیکو اور مصر کے اہراموں میں پائی جانے والی یکسانیت کی نشان دہی کی ہے "ان اہراموں کا محلِ وقوع ایک جیسا ہے اور شہروں کی جانب ان کی سمت بندی میں بڑی درستگی پائی جاتی ہے"۔ اس نے بتایا کہ ان کے مرکز سے گزرنے والے خط گویا فلکیاتی وسطانیے ہیں۔ ان کے گریڈ۔ درجے اور زاویوں میں بھی بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ مصر اور میکسیکو میں دریافت ہونے والے سب سے بڑے اہرام سورج دیوتا کے نام معنون ہیں۔ دریائے نیل کی ایک وادی "موت کی وادی" (Valley of the Dead) کے نام سے مشہور ہے اس طرح میکسیکو میں "موت کی گلی" (Street of the Dead) نامی مقام موجود ہے۔ ان کی اندرونی ترتیب اور داخلی دروازے بھی تقریباً ایک جیسے ہیں۔ ان تمام باتوں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے مصریوں اور میکسیکنز نے ان اہراموں کی تعمیر کے یکساں منصوبوں پر عمل کیا تھا۔

جنوبی امریکہ میں خزانوں سے بھرے اہراموں کی افواہوں نے دنیا بھر کے مہم جویوں اور خزانوں کے متلاشیوں کو برازیلین ماٹو گروسو (Brazilian Mato Grosso) کے ویران جنگلوں کی خاک چھاننے پر مجبور کر دیا تھا۔ آج بھی لوگ اس علاقے میں گمشدہ شہروں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں اور کرنل ایف ایچ فاسیٹ کے سے انجام سے دوچار ہو جاتے ہیں جو ۱۹۲۵ء میں ایک مہم لے کر نکلا تھا اور آج تک لاپتا ہے۔ فاسیٹ ایک صوفی منش، خواب زدہ مہم جو تھا جس کا پورا گروپ کوئی نشان چھوڑے بغیر ہمیشہ کے لئے ان جنگلوں میں غائب ہو گیا تھا اور اب اس کے انجام کے بارے میں بھی داستانیں ہی رہ گئی ہیں۔

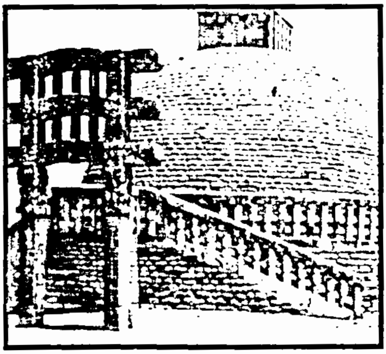

مہاتما بدھ کے اس اسٹوپا کو اشوک اعظم کے دور میں سانچی میں تعمیر کیا گیا تھا جو اہرام کی بہترین شکل ہے اور ساتھ ہی اس بات کا ثبوت بھی ہیں کہ قدیم تہذیبوں کے مابین ثقافتی روابط تھے۔

انگریز مہم جو سیزر کے شہر (The city of the caesars) کی تلاش میں برسوں تک سرگرداں رہے جو اسی علاقے کے اندرونی حصوں میں کہیں بتایا جاتا تھا۔ "اس شہر کی گلیاں چاندی کی اور عمارتوں کی چھتیں سونے کی بنی ہوئی ہیں" کرنل فاسیٹ نے اخباری نمائندوں کو بتایا تھا۔ "وہ تو ایک جادو نگری ہے جو باہر کی دنیا کے صرف چند منتخب افراد ہی کو نظر آتی ہے۔ ناپسندیدہ کو وہ بالکل دکھائی نہیں دیتی۔ آج کے جدید دور میں بھی سیزر کے شہر کی تلاش میں جانے والے لوگ پراسرار طور پر غائب ہو جاتے ہیں۔" فاسیٹ نے

آخری خط میں جو جنگلات میں واقع ڈیڈہارس کیمپ کا ایک ہرکارہ لے کر آیا تھا'لکھا تھا"تمہیں ناکامی کا خوف نہیں ہونا چاہئے" یہ خط ۲۹/ مئی ۱۹۲۵ء کو لکھا گیا تھا۔

رے لیون(Ray Levin) نے جو ایک عسکری طالع آزما اور خزانوں کا متلاشی تھا کئی مہینے فاسیٹ کے افسانوی شہروں کی تلاش میں گزار دیئے۔"مجھے ان شہروں کے وجود پر پورا یقین ہے"اس نے کہا تھا۔" فاسیٹ اس چیز کی تلاش میں تھا جسے انڈینز" پتھروں کا موٹا مینار" کے نام سے پکارتے تھے۔اور میرے خیال میں یہ اہرام ہی ہے۔اس کی چوٹی سے ایک ایسی روشنی نکلتی تھی جو کبھی ماند نہیں پڑتی تھی۔انڈینز اس مقام کے بارے میں بڑے وہمی تھے اور اسے آسیب زدہ سمجھتے تھے۔"

بد قسمتی سے رے لیون کے پاس خوراک اور فنڈ ختم ہو گئے۔"شاید میں پھر کسی دن یہاں آؤں۔"اس نے بڑی حسرت سے کہا۔ان جنگلات میں وسیع کھنڈرات بکھرے ہوئے ہیں جو میں نے خود دیکھے ہیں۔مگر قدیم پتھروں کو کھنگالنے سے تمھارا پیٹ تو نہیں بھر سکتا تا۔ولٹ شائر انگلینڈ میں سل بری ہل(Silbury Hill) کی بلندی ۱۷۰فٹ ہے اور اس کی اساس پانچ ایکڑ رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔نامعلوم معماروں نے اسے چار ہزار سال قبل تعمیر کیا تھا اور دس لاکھ ٹن مٹی لا کر استعمال کی تھی۔"سل بری انگلینڈ کے مخروطی چوٹیوں والے ٹیلوں یا مٹی کے اہراموں میں سے ایک ہے"ڈاکٹر روزن برگ نے بتایا۔" آئرلینڈ میں بھی پرانی قبروں پر ایسی ہی مخروطی چوٹیاں بنائی گئی تھیں۔ابتدائی دور میں امریکا جانے والے لوگوں کو اوہائیو میں اسی قسم کی قبریں ملی تھیں۔اس سے پتا چلتا ہے کہ اہرام نما قبروں کا سلسلہ بڑا وسیع اور قدیم ہے۔"ایک حالیہ دریافت کے نتیجے میں فرانس بھی اہراموں کی سرزمین بن گیا ہے۔ فرانس کے جنوب میں ایک چھوٹی سی اہرام نما عمارت دریافت ہوئی جس کے بارے میں اندازہ ہے کہ اسے بارہویں یا تیرہویں صدی میں صلیبی جنگوں سے لوٹتے ہوئے ٹمپلر کے سرداروں نے بنوایا تھا۔یہ ایک وسیع گڑھے میں بنائی گئی ہے اور اس کی دیواروں پر علم نجوم و فلکیات کی علامتیں بنی ہوئی ہیں۔

☆

دنیائے قدیم کے عجائبات

پچھلی صدی کی چند حیرت انگیز خواتین میں ایک خاتون میڈم ہیلن پی بلاوٹسکی گزری ہے جو ہمیشہ سے ماورائی علوم کی تاریخ میں متنازعہ شخصیت کی حامل رہی ہے "تھیوسوفیکل سوسائٹی" کی بانی میڈم بلاوٹسکی کا دعویٰ تھا کہ انہیں "آقائے دانش" (Master of wisdom) کی رہنمائی حاصل تھی۔ مستقبل کے بارے میں اس کی پیشین گوئیاں حیرت انگیز حد تک درست ثابت ہوئیں۔ وہ ایک پرجوش اوکلسٹ (Occulist) ماورائی یا سری علوم کی ماہر تھی اور خود کو جادوگرنی اور ساحرہ کہا کرتی تھی۔ جن لوگوں کو اس کی کتابیں پڑھنے کا موقع نہیں ملا وہ یقیناً ماورائی علوم پر لکھی جانے والی اہم تحریروں سے محروم رہے ہیں۔ میں اس کی تھیوسوفیکل سوسائٹی کا رکن نہ ہوتے ہوئے بھی اس بات پر بڑا فخر کیا کرتا تھا کہ اس کی کتاب "The Secret Doctrine" کے پہلے ایڈیشن کی ایک جلد میرے پاس تھی۔

وہ روسی یوکرین کے ایک گمنام گاؤں میں اکتیس جولائی ۱۸۳۱ء کو پیدا ہوئی تو اس کا نام ہیلن پیٹرونیوون ہان رکھا گیا تھا۔ اس نے بعد میں اپنے پیروکاروں کو بتایا تھا کہ جب وہ دس برس کی تھی تبھی سے "آقاؤں" نے اس سے باتیں کرنا شروع کردی تھیں۔ اس وقت اس نے اپنی ایک چچی کو بتایا "دنیا کے تمام علوم سے واقفیت رکھنے والے دانش مند افراد ہمیشہ سے موجود رہے ہیں۔ قدرت کی تمام قوتیں (Forces of Nature) ہمیشہ سے ان کی محکوم ہیں۔ وہ صرف ان افراد کے سامنے آتے اور گفتگو کرتے ہیں جنہیں وہ ان باتوں کا اہل سمجھتے ہیں۔ انہیں دیکھنے کے قابل صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو ان پر ایمان لے آتے ہیں"۔

اس زمانے میں روس میں والدین کو اختیار تھا کہ وہ اپنی بچیوں کی جہاں چاہیں شادی کردیں۔ چنانچہ ہیلن ہان جب سترہ سال کی ہوئی تو والدین نے اس کی شادی جنرل بلاوٹسکی سے کردی۔ وہ ایک معمر مگر سیاسی طور پر طاقتور آدمی تھا اور زار کی فوجوں کا کمانڈر تھا۔ زبردستی کی اس شادی نے نوجوان ہیلن کے جذبات کو مجروح کر کے رکھ دیا۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ تین ہفتوں سے بھی کم مدت تک رہی اور پھر ہمیشہ کے لئے روس چھوڑ دیا۔ اس کے بعد اس نے تین دہائیوں (تیس سال) تک اسرار اور دانش کی تلاش میں دنیا بھر کا سفر کیا۔ اس کا ہنی مون یقیناً اس کے لئے ایک خوفناک تجربہ رہا تھا کیونکہ اس کے بعد کے برسوں میں وہ ہمیشہ جنسی افعال کی سخت مخالف رہی۔ "محبت ایک خوفناک خواب ہے ایک شیطانی سپنا"۔ اس نے اپنی ڈائری میں لکھا۔ "ایک عورت کو سچی خوشی

صرف مافوق الفطرت قوتیں حاصل کرنے ہی سے مل سکتی ہے"۔
دنیا کے گرد اس کے سفر کی داستان بھی ایک چیستاں سے کم نہیں ہے۔ اس کے پیروکاروں کو یقین ہے کہ میڈم بلاوٹسکی نے دنیا کے تقریباً ہر علاقے کا سفر کیا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق مصر میں عظیم اہرام کے کوئنس چیمبر (The Queen's Chambers) میں اس نے مرحومین کی روحوں سے ہم کلام ہونے کے لئے ایک محفلِ کشف کا اہتمام کیا تھا۔ اس نے بعض ایسی رسمیں ادا کی تھیں اور قدیم جنتر منتر پڑھے تھے جن کے زور سے وہ صدیوں کے مردہ مصری راہبوں کی روحوں کو بیدار کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ بعد کی دنیا گردی کے دوران وہ ہندوستان پہنچی اور ایشیائی جادوگروں کی مہارت کی گرویدہ ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے مردانہ بھیس بدلا اور تبت کے لاماؤں کی خانقاہوں میں پہنچ گئی۔ ۱۸۷۴ء میں جب وہ تینتالیس (۴۳) سال کی تھی تو اس نے تھیوسوفیکل سوسائٹی قائم کی۔ اس نے ایسے لوگوں کا ایک گروہ تیار کیا جو انسانوں کی ان کی صحیح روحانی فطرت کی طرف "رہنمائی" کرتا تھا۔
حال ہی میں سوئٹزرلینڈ کے ایک عالمی شہرت یافتہ مصنف ایرک وان ڈینی کن (Eric von Danikan) نے جو بیسٹ سیلنگ "Chariot of the Gods" کے علاوہ اور بھی بہت سے کتابوں کا خالق ہے، جنوبی امریکہ میں ایک بے حد طویل زیرِ زمین سرنگ کی موجودگی کی خبر دی ہے۔ وان ڈینی کن کا دعویٰ ہے کہ اس زیرِ زمین غار میں بے شمار پراسرار چیزیں، چرمی طومار (Scrolls) اور کئی عجیب و غریب آلات موجود ہیں۔ وان ڈینی کن کے اس متنازعہ دعویٰ سے ایک سو سال پہلے میڈم بلاوٹسکی نے بھی اسی قسم کی رپورٹ دی تھی اور کہا تھا کہ اسی طرح کے علم و دانش کے خزانے دنیا کی نظروں سے پوشیدہ زیرِ زمین غاروں میں دفن ہیں۔
میڈم بلاوٹسکی کی "The Secret Doctrine" ایک حیرت انگیز کتاب ہے۔ اس نے اس کتاب میں قدیم سرنگوں، زیرِ زمین غاروں اور گپھاؤں اور لائبریریوں کا تذکرہ کیا ہے جن کی حفاظت "آقا" کرتے ہیں۔ اس کی موت کے چند برسوں بعد ۱۸۹۱ء میں شائع ہونے والی کتاب میں پوشیدہ علمی خزانے کے بارے میں پورا ایک باب تحریر ہے۔
"اس کے علاوہ تبت کے لاماؤں کی ہر بڑی اور خوش حال خانقاہ میں زیرِ زمین گپھائیں ہیں اور غار نما لائبریریاں ہیں جنہیں چٹانیں کاٹ کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ انہی پہاڑوں میں گونپا اور لاکھانگ بھی واقع ہیں۔ مغربی سیدام (Tsaydom) سے دور کون لین (Kuen-len) کے دوروں میں ایسے کئی خفیہ مقامات ہیں۔ آلٹائن ٹیگ (Altyn Tag) کے پشتے کے ساتھ ساتھ جہاں آج تک کسی یورپین کے قدم نہیں پہنچ سکے ہیں، گہری کھائی میں گم ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہاں بہت سارے چھوٹے چھوٹے مکانات بنے ہوئے ہیں۔ یہ خانقاہ کے بجائے ایک ڈیرہ ہی ہے جس میں ایک خستہ حال مندر بھی ہے جس کی دیکھ بھال ڈیرے میں رہنے والا ایک بوڑھا لاما کرتا ہے۔ وہاں کے زائرین کا کہنا ہے کہ زیرِ زمین لائبریری اور ہال نما کمروں میں اتنی بڑی تعداد میں کتابیں موجود ہیں کہ پورے

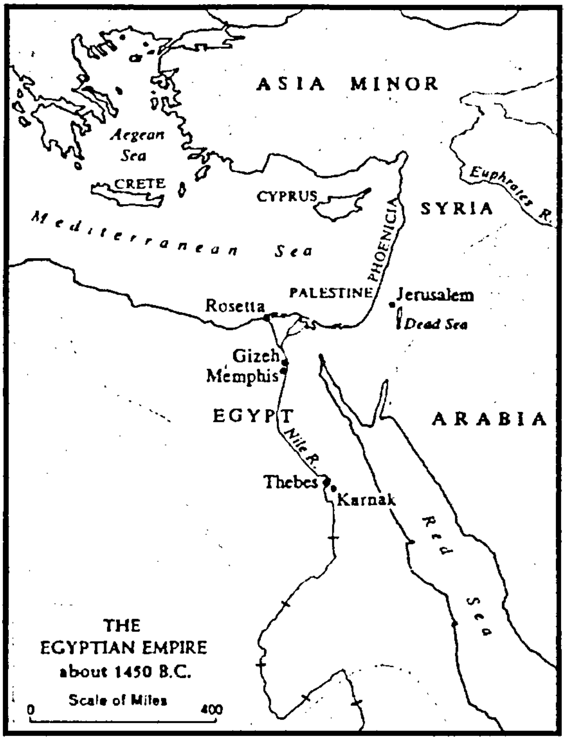

مصری سلطنت کی بنیاد تقریباً ۱۴۵۰ قبل مسیح میں پڑی، جسے استحکام فرعون تھتہ موس اوّل، ملکہ ہت شیپ ست، رعمیس دوئم اور مصری نپولین تھتہ موس سوئم کے عہدِ حکومت میں ملا۔ اس دور میں انہوں نے مصر کے ساتھ ملحق دیگر خطے بھی فتح کئے۔ تھتہ موس سوئم فرعون جس کا عہدِ سلطنت ۱۵۰۰ قبل مسیح ہے خاص طور پر بہت پر جوش جنرل تھا جس نے مغربی ایشیا کے بہت سے شہر فتح کئے اور اس کی ڈپلومیسی اتنی کامیاب تھی کہ اس نے دیگر ممالک کے ساتھ معاشی و دفاعی معاہدے کئے جس سے مصری سلطنت کو مزید استحکام حاصل ہوا۔

برٹش میوزیم میں بھی نہیں سما سکتیں۔

قدیم حوالوں سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ترکستان کے وسط میں موجود بے آب و گیاہ تامین (Tamin) نامی خطہ جو اب محض ایک بیابان ہے، کسی زمانے میں خوش حال اور زندگی سے بھرپور شہروں کا علاقہ تھا۔ اس وسیع بیابان یا صحرا میں موجود چھوٹے چھوٹے شاداب نخلستان اس کی مجموعی شادابی اور خوش حالی کی داستان سنا رہے ہیں۔ یہیں ریت کے ٹیلوں کے نیچے ایک وسیع شہر دفن ہے جس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا مگر منگول اور بدھ قوم کے افراد اب بھی اس کی زیارت کے لئے وہاں جاتے ہیں۔ اس دور کے حالات کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ اس زیرِ زمین شہر کی وسیع عمارتوں کی عریض راہ داریاں ٹائلوں اور سلنڈروں سے مزین ہوں گی"۔

میڈم بلاوٹسکی کی شائع ہونے والی پہلی کتاب جو بلاشبہ قابلِ ذکر ہے "Isis Unveiled" تھی۔ مصر میں قیام کے دوران میں میڈم بلاوٹسکی نے اہراموں، قدیم تہذیبوں اور گیزا (Giza) کی تعمیرات میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا حالانکہ وہ لکھتے وقت کچھ بھٹک جاتی ہے تاہم اہراموں اور قدیم مصر کی تہذیبوں کو سمجھنے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔ وہ لکھتی ہے۔

"مصر کو یہ علم کہاں سے ملا؟ ایسی تہذیب کا ادراک و انکشاف اس پر کیسے ہوا جس کی باقیات و

کھنڈرات آج بھی ماہرینِ آثارِ قدیمہ اور دیگر سائنس دانوں کو ششدر کئے دے رہے ہیں ؟ افسو
میموں کے لب خاموش ہیں اور معمہ کشائی سے قاصر ہیں۔ اسفنکس (Sphinx) کی بے زبانی
ایڈی پس کے مسئلہ کی طرح چیستاں بنی ہوئی ہے۔

مصر نے دوسروں کو جو کچھ سکھایا وہ یقیناً اس نے اپنے سامی النسل پڑوسیوں سے نظریات
دریافت وایجادات کے بین الاقوامی تبادلے سے حاصل نہیں کیا تھا اور نہ ہی کسی اور ملک یا نسل
اسے ایسا کرنے کی تحریک ملی تھی۔ ایک تازہ مضمون کے مصنف نے لکھا "جتنا ہم مصریوں
بارے میں زیادہ جانتے جارہے ہیں اتنے ہی حیرت انگیز انکشافات ان کے بارے میں ہوتے جار
ہیں"۔ یہ علوم وفنون مصر نے کس سے سیکھے کیا یہ راز ان کے ساتھ ہی دفن ہو گیا ہے ؟ اس
(مصر نے) کبھی دنیا میں اپنے ہرکارے اس مقصد کے لئے نہیں بھیجے کہ وہ ان سے یہ سب کچھ سیکھ
آئیں بلکہ یوں ہوا کہ پڑوسی اقوام کے عقلمند افراد یہاں آئے اور بہت کچھ سیکھ کر گئے۔ باقی دنیا
الگ تھلگ رہ کر یوں یہ حیرت انگیز عجائبات تخلیق کر دیئے جیسے جادو کی چھڑی گھمادی ہو۔ "کر
بات سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا" اس مصنف نے آگے جاکر لکھا "کہ اس دور کی دوسری اقوام
ترقی میں ایسا کمال حاصل کیا ہو۔ تاریخ گواہ ہے کہ مصر علوم وفنون میں اس دور کی تمام ہم عصر اقو
سے کہیں آگے تھا"۔

"کیا اس نظریہ کو اس حقیقت سے بھی تقویت نہیں ملتی کہ ہم ابھی کچھ عرصے پہلے تک قد
ہندوستان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے کہ ان دونوں قوموں انڈیا اور مصر میں بڑی مماثلہ
تھی ؟ کہ اقوامِ عالم کے گروہ میں ان کا شمار قدیم ترین قوموں میں ہوتا تھا اور یہ کہ مشرقی ایتھوپیا
(حبشی) عظیم معمار، بالغ لوگوں کی حیثیت سے ہندوستان آئے تھے، وہاں کی تہذیب وتمدن ا
ساتھ لائے تھے اور شاید مصر کی غیر آباد سرزمین پر اپنی بستیاں بسائی تھیں" ؟

"میکنزم" یوسب سیلورٹی (Eusebe Salvertie) کہتا ہے "قدیم لوگوں کے ہاتھوں ا
کمال تک پہنچ چکا تھا کہ ہم جدید دور والے لوگ ابھی اس سے کوسوں دور ہیں۔ ہمارے ذہنوں میں
بار یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا ایجادات میں ہم ان سے آگے نکل گئے اور جواب ہمیشہ نفی میں ملتا ہے
ہمارے معمار اور میکانکس کو جدید ترین ایجادات وآلات اور سائنس کی اس قدر ترقی کے بعد آج
پتھر کی وسیع چوکیوں (اساس) پر عظیم الشان یک سنگی (ایک ہی پتھر سے تراشے ہوئے) ستو
کھڑے کرنے میں بے شمار دقتوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب کہ ان مصریوں نے چالیس
صدیاں پہلے اپنی ہر مقدس ومذہبی عمارت کے سامنے ایسے بے شمار ستون کھڑے کر دیئے تھے۔

"ہم تاریخ میں بہت پیچھے کی طرف جھانکیں تو ہمیں مینس (Menes) بادشاہ کا دور نظر
ہے۔ مینس ان قدیم ترین بادشاہوں میں سے ایک ہے جس کے بارے میں ہم کچھ جانتے ہیں یا ج
کے بارے میں قدیم انسانی تاریخ ہمیں کچھ بتاتی ہے۔ یہیں ہمیں ایسے ثبوت ملتے ہیں کہ اس دور
مصری علم آبی سکونیات (Hydrostatics) اور آبی انجینئرنگ-Hydraulic Engineer

ing) کے بارے میں ہم سے کہیں زیادہ جانتے تھے۔ دریائے نیل کا راستہ بدلنے یا اس کی تین بڑی شاخوں کا راستہ بدلنے اور اسے میمفس (Memphis) تک پہنچانے کا کام اس بادشاہ کے دور میں سر انجام دیا گیا تھا جو ہمیں تاریخِ انسانی کی گہرائی میں اسی طرح نظر آتا ہے جیسے فضائے بسیط میں کوئی ستارہ ٹمٹمارہا ہو۔ مینس (Menes) کو اس کام کے سلسلے میں ان تمام رکاوٹوں اور قوتوں کا بڑا درست اندازہ تھا جس کا اسے سامنا کرنا تھا چنانچہ اس نے ایک ایسا چٹانی پشتہ تعمیر کروایا جس کی بلندی اور وسیع پشتہ بندی نے دریا کا رخ مشرق کی جانب موڑ دیا اور اس وقت سے آج تک دریائے نیل اسی سمت بہہ رہا ہے"۔ ہیروڈوٹس (Herodotus) نے جھیل موئرس (Lake Moeris) کے بارے میں ایک بڑا شاعرانہ مگر درست بیان چھوڑا ہے۔ یہ جھیل اس فرعون کے نام سے منسوب ہے جس نے پانی کے اس مصنوعی ذخیرے کو یہ صورت عطا کی تھی۔ تاریخ دانوں کے مطابق جھیل کا محیط چار سو پچاس میل اور گہرائی تین سو فٹ تھی۔ دریائے نیل سے نکالی گئی نہروں کا پانی اور سالانہ سیلاب کے پانی کا کچھ حصہ اس میں ذخیرہ کیا جاتا تھا اور اس سے چاروں طرف میلوں میں پھیلی ہوئی زمین سیراب کی جاتی تھی۔ اس مقصد کے لئے یہاں بے شمار سیلابی دروازے، بند، لاکس اور مناسب میکنزم بڑی مہارت سے بنائے گئے تھے۔ بہت بعد کے دور میں رومیوں نے بھی مصری طرز کے آبی نظام کو اپنے ہاں رائج کیا مگر ہمارے اس دور میں علم آبی سکونیات (Science of Hydrostat-ics) اور دیگر سائنسی علوم میں ترقی کی وجہ سے ہم جان گئے ہیں کہ ان کے نظام میں کئی خامیاں تھیں مثال کے طور پر اگر وہ ہائیڈرو اسٹیٹکس کے عظیم قانون سے واقف بھی تھے تو بھی انہیں جدید انجینئرنگ کے واٹر ٹائٹ جوائنٹس (Water tight Joints) کے بارے میں کچھ بھی پتا نہیں تھا۔ اس سلسلے میں ان کی بے علمی ثابت کرنے کے لئے یہی ایک بات کافی ہے کہ انہوں نے پانی کی ترسیل کے لئے بڑی بڑی آب زیریں (Aquaducts) تعمیر کی تھیں جب کہ اگر وہ زیرِ زمین فولادی پائپ استعمال کرتے تو بہت کم محنت

اہرامِ مصر کے اندر اس طرح کے نقش اور مصوری آپ کو جگہ جگہ نظر آئے گی جس سے مصریوں کے طرزِ حیات کے بارے میں روشنی پڑتی ہے۔ یہ ہلکی ابھر واں منبت کاری تی فرعون کے اہرام سے دریافت ہوئی، جس میں جہاز بنانے کے مصری ہنر کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس تصویر میں موجود سر اور ٹانگوں اور جسم کے سامنے والے حصے کو خصوصی طور پر دکھایا گیا ہے، جو مصری آرٹ کی بنیادی خصوصیت ہے جو آپ کو ہر نقش اور مصوری میں نظر آئے گی۔ اتنی نفاست سے کی گئی مصوری سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مصری پینٹنگ اور مجسمہ سازی میں عبور رکھتے تھے اور اپنے مختلف دیوی دیوتاؤں کی تصاویر بہت باریک بینی اور مہارت سے بناتے تھے۔

اور سرمایہ خرچ ہوتا۔ تاہم مصریوں کا نہری اور آبی ترسیل کا مصنوعی نظام بڑے اعلیٰ درجے کا تھا۔ نہر سوئز کی تعمیر میں لیسپس (Lesseps) نے جن انجینئروں کو مقرر کیا تھا انہوں نے یہ فن رومیوں سے سیکھا تھا جنہوں نے اپنے دور میں مصریوں سے اکتسابِ ہنر کیا تھا۔ اس وقت تمسخرانہ طور پر یہ لکھا جاتا تھا کہ اگر تعمیر میں اب بھی کوئی خامی ہے تو پھر ان انجینئروں کو مصر کے عجائب گھر کا دورہ کرنا چاہیئے تاہم انجینئر زبقول پروفیسر کارپینٹر "اس طویل اور بدصورت گڑھے" کو نہر سوئز کی صورت میں ڈھالنے میں کامیاب ہو گئے اور یہ علاقہ جو کسی زمانے میں جہازوں کے لیے کیچڑ کا جال (Mud Trap) سمجھا جاتا تھا جہازرانی کے قابل ہو گیا۔

دریائے نیل کے ساتھ آنے والی سیلابی مٹی نے پچھلی تیس صدیوں کے دوران میں ڈیلٹا کی صورت ہی بدل کر رکھ دی ہے اور یہ مسلسل سمندر کی طرف بڑھتی ہوئی خدیو (Khedive) کی حدوں میں اضافے کا باعث بن رہی ہے۔ قدیم زمانے میں اس دریا کا خاص دہانہ پیلوشین (Pelu-sian) کہلاتا تھا اور یہ نہر جو ایک بادشاہ نے نکالی تھی نہر نچو (The Canal of Necho) سوئز سے ہوتی اس شاخ میں جاگرتی تھی۔ ایکٹیئم (Actium) کے مقام پر انٹونی اور قلوپطرہ کی شکست کے بعد یہ تجویز پیش کی گئی کہ ان کے بحری بیڑے کا بچا کھچا حصہ اس نہر کے راستے بحرِ احمر (Red Sea) میں نکل جائے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور کے انجینئروں نے اس نہر کو کس قدر گہرا بنالیا تھا۔ کولوریڈو اور ایریزونا کے آبادکاروں نے حال ہی میں اپنے آب پاشی کے نظام کے ذریعے بنجر زمین کا بہت بڑا حصہ شاداب کھیتوں میں بدل دیا ہے۔ ایسے بہترین آب پاشی کے نظام کی اختراع پر انہیں بڑی داد و تحسین ملی ہے۔ مگر قاہرہ کے بالائی علاقے میں پانچ سو میل دور ایسا ہی ایک صحرائی علاقہ تھا جسے ان لوگوں نے بقول پروفیسر کارپینٹر "زمین کے زرخیز ترین خطے" میں بدل دیا تھا۔ پروفیسر لکھتا ہے "ہزاروں برس پہلے دریائے نیل سے نکالی جانے والی تازہ پانی کی ان نہروں نے نہ صرف اس صحرا کو گلزار بنایا ہے بلکہ ڈیلٹا کے بھی ایک وسیع علاقے کو سیراب کر رہی ہے۔ ڈیلٹا کے علاقے میں نہروں کا یہ جال مصری بادشاہوں کی یادگار ہے۔

اب اگر پھر فنِ تعمیر کی طرف لوٹ آئیں تو ایسی ایسی عجوبۂ روزگار عمارتیں نظر آتی ہیں کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔ فیلو (The Temple of Philoe) ابو سمبل (Abu Simbel) ڈینڈیرا (Dendera) یڈفو (Edfu) اور کرناک (Karnak) کے منادر کا حوالہ دیتے ہوئے پروفیسر کارپینٹر کہتا ہے "یہ عالی شان اور خوبصورت عمارتیں، یہ دیوپیکر اہرام اور منادر اپنے اندر ایسا حسن اور وسعت لئے ہوئے ہیں کہ ہزاروں برس گزر جانے کے بعد بھی ان کی سحر انگیزی میں ذرا کمی نہیں آئی ہے"۔ کارپینٹر متحیر ہے کہ "وہ لوگ فنِ تعمیر کے کمال کی آخری حدوں کو چھو رہے تھے۔ پتھر کی سلوں کو انہوں نے ایک دوسرے پر اس قدر حیرت انگیز نفاست اور مہارت سے چنا تھا کہ چاقو کی بلیڈ بھی ان کی دراڑوں میں نہیں جا پاتی ہے"۔ اپنی اس شوقیہ زیارتِ آثارِ قدیمہ کے دوران میں اس نے ایسی استعجاب انگیز نشانیاں دیکھیں کہ اگر مقدس پوپ بھی انہیں دیکھ لیں تو بہت کچھ

سیکھ سکتے ہیں۔ وہ مصر کی کسی کتاب "Book of the Dead" کی بات کرتے ہیں جو ان قدیم یادگاروں پر کندہ ہے اور جس سے ''روح کی دائمیت'' پر ان کے پختہ اعتقاد کا پتا چلتا ہے۔ ''یہ بڑی قابلِ ذکر بات ہے''۔ پروفیسر کہتا ہے ''کہ نہ صرف ان کا یہ اعتقاد بلکہ قدیم مصری دور کی جس زبان میں اس کا اظہار کیا گیا ہے اس سے مذہب عیسوی کی پیش گوئی کا تاثر ملتا ہے۔ کیونکہ اس "Book of the Dead" میں روزِ قیامت کے بارے میں جو محاورے اور جملے ملتے ہیں وہی ہمیں عہد نامہ جدید (New Testament) میں بھی نظر آتے ہیں''۔ اس کا اندازہ ہے کہ ان یادگاروں پر یہ تصویری تحریر (Hierogram) دوہزار سال قبل از مسیح میں کندہ کی گئی تھی۔

بنسن (Bunsen) کے مطابق جس کے بارے میں خیال ہے کہ اس کی شماریات اور پیائش بالکل درست ہیں، شی اوپس کے عظیم اہرام میں آٹھ کروڑ اکیاسی لاکھ گیارہ ہزار فٹ تعمیراتی سامان جس کا وزن تریسٹھ لاکھ سولہ ہزار ٹن تھا' استعمال کیا گیا تھا۔ چوکور پتھروں کا اتنی بڑی تعداد میں مہیا کرنا اور انہیں استعمال کرنا مصر کے قدیم پتھر کے کان کنوں کی بے مثال مہارت کا ثبوت ہے۔ اس عظیم اہرام کا ذکر کرتے ہوئے کینرک (Kenrik) لکھتا ہے ''ان سنگی سلوں کے جوڑ بہ مشکل نظر آتے ہیں۔ ان جوڑوں میں اتنی گنجائش بھی نہیں ہے کہ چاندی کے ورق بھی گھسائے جا سکیں اور جو سیمنٹ انہوں نے استعمال کی ہے اس کی پکڑ کی قوت اس قدر قوی ہے کہ کئی صدیاں گزر جانے اور بے شمار خوفناک طوفانوں کا سامنا کرنے کے بعد بھی بیرونی دیوار میں چنے ہوئے شکستہ پتھر اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں کیا اس دورِ جدید میں کوئی ایسا معمار (Architect) یا کیمیاداں (Chemist) ہے جو قدیم مصری تعمیرات میں استعمال ہونے والے اس ناقابلِ شکست سیمنٹ کو دوبارہ دریافت کر سکے''؟

بنسن (Bunsen) لکھتا ہے۔ ''قدیم مصریوں کی کان کنی اور سنگ تراشی میں اعلیٰ مہارت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کانوں سے اور چٹانوں سے پتھر کی بڑی بڑی سلیں نکالیں اور پھر انہیں چار ستونوں اور دیو قامت مجسموں میں ڈھال دیا۔ ان ستونوں کی اونچائی نوے فٹ اور مجسموں کی چالیس فٹ تھی اور یہ سب صرف ایک ایک پتھر سے تراشے گئے تھے۔ ایسے مجسموں اور ستونوں کی تعداد بے شمار ہے۔ ان یادگاروں کی تخلیق کے لئے انہوں نے چٹانوں کو دھماکے سے نہیں اڑایا تھا بلکہ ایک انتہائی سائنسی طریقہ اختیار کیا تھا۔ لوہے کا فانا یا میخ استعمال کرنے کے بجائے کیونکہ اس سے تو پتھر بری طرح ٹوٹ سکتا تھا، انہوں نے چٹانی پتھر میں تقریباً ایک سو فٹ لمبا کھانچا بنایا پھر اس کھانچے میں سوکھی لکڑی کے بے شمار خانے یا میخیں گھسیڑ دیں۔ اس کے بعد انہوں نے کھانچے میں پانی ڈالنا شروع کیا۔ سوکھی لکڑیاں پانی کی وجہ سے پھولنے لگیں اور پھر پوری قوت سے اس طرح تڑخیں کہ اس بھاری پتھر کو یوں کاٹ دیا جیسے ہیرے کی کنی شیشے کی سلیٹ کو کاٹ دیتی ہے۔ اس انداز میں انہوں نے پتھر کی بھاری بھاری سلیں بنائی تھیں اور انہیں استعمال کیا تھا۔

جدید جغرافیہ داں اور ماہرینِ ارضیات کا اندازہ ہے کہ ان یک سنگی ستونوں اور مجسموں کو بہت دور سے لایا گیا تھا مگر کیسے لایا گیا تھا یہ سوچ کر ان کے دماغ چکرا جاتے ہیں۔ پرانے نسخوں سے پتا چلتا ہے کہ یہ کام انہوں نے نقل پذیر پٹریوں (Portable Rails) کے ذریعے کیا تھا۔ یہ پٹریاں جانوروں کی ہوا بھری ہوئی کھالوں پر رکھی جاتی تھیں۔ ان کھالوں کو وہ اس طرح نا قابلِ تباہ بنا لیتے تھے جیسے وہ ممی بنایا کرتے تھے۔ ہوا سے بھرے ہوئے یہ کشن پٹریوں کو ریت میں دھنس جانے سے روکتے تھے۔ مینیتھو (Manetho) نے بھی ان کا تذکرہ کیا ہے اور کہا ہے کہ انہیں ایسے خاص انداز میں بنایا جاتا تھا کہ وہ صدیوں کی شکست و ریخت بھی برداشت کر سکتی تھیں۔

سائنس کے کسی بھی جدید قوانین کے ذریعے دریائے نیل کی وادی میں بکھرے ان سینکڑوں اہراموں کی تاریخِ تعمیر کا پتا لگانا ممکن ہے مگر ہیروڈوٹس کا کہنا ہے کہ ہر آنے والا بادشاہ اپنے دورِ حکومت کی عظمت کی یادگار اور اپنے مدفن کے طور پر ایک اہرام کھڑا کر جایا کرتا تھا۔ مگر ہیروڈوٹس نے ہمیں سب کچھ نہیں بتایا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اہرام کی تعمیر کا مقصد ہرگز وہ نہیں تھا جو اس نے دنیا کو بتایا تھا۔ اگر یہ بات اس کے مذہبی اصولوں کے منافی نہ ہوتی تو وہ اپنے بیان میں اس بات کا ضرور اضافہ کرتا کہ جہاں یہ اہرام بیرونی طور پر فطرت کے تخلیقی اصولوں کی نشان دہی کرتے ہیں اور جیومیٹری، ریاضی، علمِ نجوم اور علم ہیئت و افلاک کا مظہر ہیں وہاں اندرونی طور پر ایسے عالی شان منادر ہیں جن کی تاریک راہ داریوں اور کمروں میں پراسرار رسمیں ادا کی جاتی تھیں اور جن کی دیواروں نے شاہی خاندان کے افراد کی روشناسی کے مناظر بھی دیکھے تھے۔ سنگِ سماق کا وہ عظیم ٹب جسے اسکاٹ لینڈ کے شاہی نجومی پروفیسر پیازی اسمتھ (Piazzi Smyth) نے محض ایک "حقیر غلہ داں" کا نام دیا تھا، بپتسمہ دینے والے پانی کا ٹب تھا جس میں شاہی خاندان کا نومولود غوطہ لگا کر حیاتِ نو پا لیتا تھا اور آئندہ بادشاہی کی اعلیٰ صفات کا حامل ہو جاتا تھا۔

تاہم ہیروڈوٹس نے ہمیں درست طور پر یہ ضرور بتا دیا ہے کہ پتھر کے ان بھاری بھر کم بلاکوں میں سے ایک بلاک کی نقل و حمل میں کس قدر محنت صرف ہوتی تھی۔ اس کی لمبائی بتیس فٹ چوڑائی اکیس فٹ اور اونچائی بارہ فٹ تھی۔ اس کے اندازے کے مطابق اس بلاک کا وزن تین سو ٹن سے کچھ زیادہ ہی تھا اور اس ایک بلاک کو سین (Syene) سے ڈیلٹا اور پھر دریائے نیل تک لانے کے لئے دو ہزار آدمیوں کو تین سال لگے تھے۔ گلیڈن (Gliddon) نے اپنی کتاب 'Ancient Egypt" میں پلینی (Pliny) کی زبانی ایک بیان نقل کیا ہے کہ کس طرح بطلیموس فلاڈیلفس (Ptolemaeus Philadelphus) الیگزینڈریا (اسکندریہ) میں ایک دیو قامت چہار پہلو سنگی ستون لایا تھا اور اسے ایستادہ کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ دریائے نیل سے اس جگہ تک جہاں وہ ستون پڑا ہوا تھا ایک نہر کھودی گئی۔ دو کشتیاں جن میں اس یک سنگی ستون کے وزن کے تناسب سے ایک ایک کیوبک فٹ کے پتھر بھر دیئے گئے تھے اس نہر کے پانی کی سطح کے نیچے ڈبو دی گئیں۔ یک سنگی ستون کے دونوں سرے نہر کے دونوں کناروں پر ٹکے ہوئے تھے اور کشتیاں ٹھیک اس کے نیچے پانی

ابرام مصر میں مدفون خزانوں کو لوٹنے کا سلسلہ صدیوں سے جاری تھا جہاں سے قزاق اور لٹیرے دیواریں توڑ توڑ کر قیمتی نوادرات لے جاتے رہے جن میں دیگر اقوام کے فاتح لوگوں نے بھی ان خزانوں کو تہ و بالا کیا اس لئے جب ماہرینِ آثار قدیمہ نے مصر کے اہراموں پر باضابطہ تحقیق شروع کی تو انہیں تمام اہرام متاثرہ نظر آئے جہاں سے خزانے چرانے کے ساتھ ساتھ وہاں پر بنائی گئی تصویروں اور مجسموں کو بھی تہ و بالا کیا گیا۔ توتح آمن واحد فرعون تھا جو زمانے کی دست برد سے محفوظ رہا۔ تصویر میں آپ ماہرین آثار قدیمہ کارٹر لور کلینڈر کو توتح آمن کے تابوتی پتھر کو حیرت و استعجاب سے دیکھتے ہوئے ملاحظہ کر رہے ہیں جو ۱۹۲۴ء میں دریافت ہوا۔

کے اندر تھیں۔ پھر ایک ایک کر کے کشتیوں میں بھرے ہوئے پتھر نکالے گئے اور کشتیاں سطح پر آتی گئیں یہاں تک کہ ستون ان دونوں کشتیوں پر آگیا اور پھر آسانی سے ان کشتیوں کو تیرا کر دریا تک لے آیا گیا۔

ڈریسڈن یا برلن کے عجائب گھر کے مصری حصے میں ایک تصویر ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک مزدور کمر پر ریت سے بھری ہوئی ٹوکری اٹھائے ایک اہرام پر چڑھ رہا ہے۔ اس بات سے ماہرِ مصریات نے اندازہ لگایا ہے کہ شاید اہرام میں استعمال ہونے والے بڑے بڑے بلاک کیمیائی طور پر اسی جگہ بنائے گئے ہوں۔ موجودہ زمانے کے چند انجینئروں کا خیال ہے کہ پورٹ لینڈ سیمنٹ ہی جس میں سلیکٹ (Silicate) کا چونا اور ایلومینا (Alumina) شامل ہیں، وہ ناقابلِ شکست سیمنٹ ہے جس سے قدیم مصریوں نے اپنے اہرام تعمیر کئے تھے۔ اس کے بر خلاف پروفیسر کارپینٹر کو یقین ہے کہ ان اہراموں کو اپنے گرینائٹ کیسنگ کے ساتھ تعمیر کرنے میں وہ مادہ استعمال کیا گیا ہے جسے ماہرِ ارضیات نیومولیتک لائم اسٹون (Nummu-litic Limestone) کہتے ہیں۔ یہ قدیم چاک سے کسی قدر نئی چیز ہے اور اسے نیومولائٹس (Nummulites) نامی جانوروں کے سخت چھلکوں (Shells) سے بنایا جاتا ہے۔ یہ چھلکے ایک شلنگ کے سکے کے برابر ہوتے ہیں۔ بہر حال یہ ایک نزاعی سوال ہے جسے شاید کبھی حل کیا جا سکے مگر ہیروڈوٹس اور پلینی سے لے کر اس حیرت زدہ انجینئر تک جو ان عظیم الشان یادگاروں کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا، کوئی بھی یہ نہ بتا سکا کہ بھاری بھر کم تعمیراتی سامان کس طرح اس جگہ تک لایا گیا اور ماضیٔ بعید میں دفن ان عظیم شہنشاہوں نے کس طرح یہ عجوبہ روزگار عمارتیں تعمیر کیں۔ بنسن کے خیال کے مطابق مصر کی قدیم تاریخ بیس ہزار سال پرانی ہے۔ لیکن اگر ہم اس سلسلے میں جدید اسناد پر انحصار کریں تو پھر قیاس و گمان کے سوا ہمارے پاس کچھ نہ رہ جائے گا۔ یہ مجاز لوگ نہ ہمیں یہ بتا سکتے

ہیں کہ یہ اہرام کیسے تعمیر ہوئے اور کس بادشاہ کے دورِ حکومت میں سب سے پہلا اہرام تعمیر کیا گیا تھا۔ ان سوالوں کے جواب میں وہ بھی قیاس ہی کا سہارا لیتے ہیں۔

پروفیسر اسمتھ نے اس عظیم اہرام کے بارے میں ریاضی کی زبان میں جو بیان دیا ہے وہ اب تک کے بیانوں میں زیادہ قرینِ قیاس سمجھا جاتا ہے مگر اس عظیم الشان تعمیر کا علم ہیئت سے تعلق ظاہر کرنے کے بعد وہ قدیم مصریوں کے علوم کو ناقابلِ ذکر قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ شاہی دیوان (King's Chamber) میں رکھے ہوئے سنگِ سماق کا ٹب دنیا کے دو ترقی یافتہ ترین ممالک یعنی انگلینڈ اور امریکہ کے نزدیک محض پیائش کی ایک اکائی ہے۔ "Books of Hermes" میں سے ایک کتاب میں بیان کیا گیا ہے کہ بے شمار اہرام سمندر کے کنارے ایستادہ تھے اور غصے میں بھری مگر بے بس لہریں ان کی بنیادوں سے سر پھوڑتی رہتی تھیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ملک میں خاصی جغرافیائی تبدیلیاں آچکی ہیں اور یہ بھی کہ ہم نے ان دراصل ''غلے کے گوداموں'' کو خواہ مخواہ ''ساحرانہ نجوم کی رصد گاہیں'' اور ''شاہی مدفن'' سمجھ رکھا ہے اور یہ محض چند ہزار سال پہلے کی بات ہے اور ماہر مصریات کے بقول ازمنہ قدیم کی حیرت انگیز داستانیں نہیں ہیں۔

ایک مشہور فرانسیسی ماہر آثارِ قدیمہ ڈاکٹر ریبولڈ (Dr Rebold) اپنے قارئین کو ۵۰۰۰ سال قبلِ مسیح کے تمدن کی جھلک دکھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس زمانے میں تیس یا چالیس کالج ایسے تھے جہاں راہب سرّی علوم (Occult Sciences) اور عملی جادوگری سیکھتے تھے۔

دسمبر ۱۸۷۵ء کے "National Quarterly Review" کے ایک شمارے میں ایک صاحب رقم طراز ہیں کہ ''حال ہی میں کارتھیج کے کھنڈرات کی کھدائی کرنے سے ایک ایسی تہذیب کا پتا چلا ہے جو اپنی نفاست اور عیش کوشی میں قدیم روم کو بھی بہت پیچھے چھوڑ گئی تھی۔ آگے جا کر وہ لکھتا ہے کہ "Delenda est Carthage" یعنی قومِ کارتھیج جو دنیا کی محبوب تھی اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ اپنے سے کہیں بڑی اور طاقت ور قوم کو تباہ کرنے والی تھی کیونکہ وہ قوم دنیا پر صرف ہتھیاروں کے زور پر حکمرانی کرتی تھی جب کہ کارتھیج قوم انسانوں کی ایک بہترین نمائندہ نسل تھی جو عظیم سلطنت روما سے بھی صدیوں پہلے تہذیب و تمدن، علوم فنون اور ذہانت و فطانت میں نسل انسانی کی رہنمائی کی دعوے دار تھی۔ یہ ایپئن (Appian) کے مطابق ۱۲۳۴ قبل مسیح میں یا ٹرائے (Troy) کی فتح سے پچاس سال قبل کا کارتھیج تھا وہ کارتھیج نہیں جس کے بارے میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ چار صدیوں بعد ڈیڈو (Dido) نے تعمیر کیا تھا۔

یہاں ہمارے سامنے ایک اور مثال ہے جس سے ستاروں کے مدار کے اصول کی سچائی ثابت ہوتی ہے۔ ڈریپر (Draper) کے دعوے کی تائید کہ قدیم مصری علوم فلکیات میں اعلیٰ درجے کا ادراک رکھتے تھے اس دلچسپ حقیقت سے بھی ہوتی ہے جو مسٹر جے ایم پیبلس (Mr.J.M.Pee-bles) نے ماہرِ فلکیات پروفیسر او ایم مچل (Prof.O.M.Mitchel) کے فلاڈلفیا میں دیئے گئے ایک لیکچر کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ ۱۷۲۲ قبل مسیح میں دریافت شدہ ایک ممی کے کفن پر جو اس

وقت برٹش میوزیم میں موجود ہے، منطقۃ البروج (Zodiac) کا ایک ایسا نقشہ بنا ہوا ہے جس میں موسم خزاں کے اعتدال شب وروز والے دن (Autumnal Equinox) آسمان پہ سیاروں کے مقام کی بڑی درست نشان دہی کی گئی ہے۔ پروفیسر مچل نے اپنے طور پر تخمینہ لگایا کہ ان خاص اوقات میں ہمارے نظامِ شمسی کے ستارے اور سیارے کس مقام پر تھے "اور نتیجہ"۔ مسٹر چیلس نے کہا "میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سات اکتوبر ۱۷۲۲ قبل مسیح میں چاند اور دوسرے سیارے ٹھیک اسی مقام پر تھے جہاں برٹش میوزیم میں رکھی ممی کے کفن پر بنے ہوئے نقشہ میں دکھائے گئے تھے۔

پروفیسر جون فسکی (John Fiske) ڈاکٹر ڈریپر کی "History of the Intellectual Development of Europe" پر شدید تنقید کرتے ہوئے ان کے گردشِ مدار کے اصول کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ہمیں نہ ان کی ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم اور نہ ان باتوں پر یقین کرنے کی کوئی منطقی وجہ ہے"۔ وہ اس فصیح وبلیغ اور فکر انگیز کتاب کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتا ہے کہ "اس پوری کتاب میں سوائے فالتو افسانوی باتوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس میں نہ صرف یونان کی بہترین تہذیب وتمدن کو مصر کا رہینِ منت بتایا گیا ہے بلکہ یورپ کے خرچے پر غیر یورپی تہذیب کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے"۔

ہمارے خیال میں تو یہ "فالتو باتیں" وہ ہیں جنہیں عظیم یونانی تاریخ داں خود، براہِ راست درست تسلیم کر چکے ہیں۔ پروفیسر فسکی کو ایک بار پھر ہیروڈوٹس کو پڑھنا چاہیئے بہت فائدہ ہوگا۔ یہ بابائے تاریخ ایک سے زائد بار تسلیم کر چکا ہے کہ یونان اپنی اعلیٰ تہذیب و تمدن وعلوم وفنون غرض ہر معاملے میں مصر کا احسان مند ہے اور جہاں تک پروفیسر فسکی کی اس بات کا تعلق ہے کہ ان کی ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم یعنی قوموں کی تاریخی گردش تو ہمارا مشورہ ہے کہ وہ ذرا ماضی

> قدیم مصر جغرافیائی طور پر دو حصوں بالائی اور زیریں مصر میں منقسم تھا اور اس کی بقا کا تمام تر انحصار دریائے نیل پر تھا۔ اسی کے کنارے کنارے مصر کے فرعونوں کی سلطنت ابھر کر سامنے آئی اور یہیں پر اہرامِ مصر (فرعونوں کے مقابر) بنائے گئے۔ مصر دریائے نیل کا تحفہ ہے۔ یہ بات حضرت یوسف کے زمانے میں بھی صحیح تھی اور آج بھی صحیح ہے۔ نیل کا پانی مصریوں کے لئے آبِ بقا سے کم نہیں ہے۔ کیونکہ اس خطے میں بارش نہیں ہوتی اور لوگوں کی زندگی کا دارومدار اسی دریا پر ہے۔ وہ اسی دریا کا پانی پیتے ہیں۔ یہی دریا ان کی زمینوں کو زرخیز بناتا ہے اور آب پاشی کے لئے پانی فراہم کرتا ہے اور ان کی نقل وحرکت کے لئے سب سے آسان ذریعہ بھی یہی ہے۔

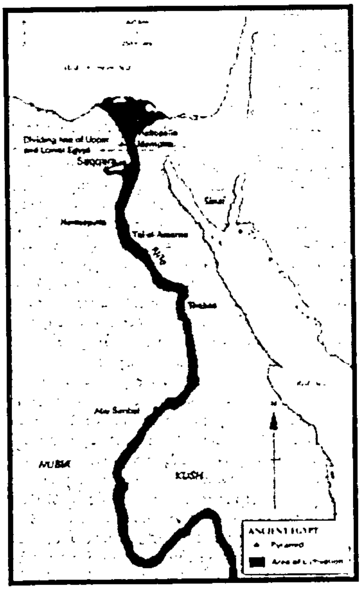

میں جھانکے تو پتا چل جائے کہ بے شمار عالی شان اقوام اپنا دور پورا کر چکی ہیں یعنی ان کی تاریخی گردش اپنی انتہا کا مزہ چکھ چکی ہیں۔

ذرا اس دور کے مصر کا اس کے آرٹ، سائنس اور مذہب میں کمال، اس کے شوکت و جلال کے مظہر شہروں اور یادگاروں اور اس کی پر ہجوم، پر شکوہ آبادیوں کے ساتھ آج کے مصر کا موازنہ کریں جہاں اب اجنبی آباد ہیں، جس کے عظیم الشان کھنڈرات میں چمگادڑوں اور سانپوں کا بسیرا ہے اور جہاں اب اس شان و شوکت کے وارث چند قبطی (Copts) آباد ہیں اور دیکھیں کہ کیا تاریخ اپنے آپ کو نہیں دہرا رہی ہے اور گردشِ ایام کار فرما نہیں ہے۔

قطع نظر مسٹر فسکی کی تردید کے گلیڈن کہتا ہے "ماہرین لسانیات، ماہرینِ فلکیات، کیمیادانوں، مصوروں، معماروں اور ماہرینِ طب کو تحریر و زبان و بیان کا نقطہ آغاز، شمسی حرکات و ماہ و سال کی تدوین، تانبے کی چھینی سے گرینائٹ (سنگِ خارا) کو کاٹنے اور تانبے کی تلوار میں لچک پیدا کرنے، شیشے میں قوس قزح کے رنگ پیدا کرنے، سرخ چمکدار سنگ خارا کے نو سو ٹن وزنی بلاک کو خشکی اور تری سے کسی بھی فاصلے تک لے جانے، بے مثال نفاست اور درستی کے ساتھ ایسی گول اور نوک دار محرابیں تعمیر کرنے جن پر آج تک کوئی سبقت نہ لے جا سکا ہو اور جو روم (Rome) کے "کلوایکا میگنا" (Cloaca Magna) سے بھی دو ہزار سال قبل بنائی گئی تھیں، ڈورینس "Dorians" (یونانی طرزِ تعمیر) کے منصہ شہود پر آنے سے ایک ہزار سال قبل ڈورک ستون (Doric Co-lumn) تراشنے، لافانی اور انمٹ رنگوں سے مزین فریسکو (استرکار) مصوری، علمی طور پر علم تشریح الاعضاء (اناٹومی) اور وقت سے نبرد آزما اہراموں کی تعمیر کا ہنر سیکھنے کے لئے مصر یاترا ضرور کرنی چاہیے۔

مصر کی ان عالی شان یادگاروں، قدیم مقابر اور عمارتوں میں ہر ہنر مند چار ہزار سال پہلے اپنے ہنر کو اوج کمال پر دیکھ سکتا ہے اور چاہے وہ کسی رتھ یا بگھی کا دولاب ساز (پہیہ چلانے والا) ہو، گندھی ہوئی ڈوری سے ٹانکا دیتا ہوا جفت ساز (موچی) ہو، آج تک بہترین مانے جانے والے ہو بہو چاقو سے چمڑا کاٹنے والا ہو، اپنی دستی شٹل پھینکتا ہوا جولاہا ہو، آج تک انتہائی کار آمد سمجھی جانے والی دھونکنی دھونکنے والا قلعی گر ہو یا ساڑھے چار ہزار سال پہلے تصویری تحریر کو کندہ کرنے والا ہو، یہ سب اور ان سے بھی کہیں زیادہ حیرت انگیز شہادتیں ہیں جو (جدید دنیا پر) قدیم مصر کی برتری کا ثبوت ہیں۔

"سچ ہے" مسٹر پیبلس نے کہا۔ "رامسین (Ramsean) کے منادر اور مقابر یونانی ہیروڈوٹس کے لئے بھی اتنے ہی حیرت انگیز تھے جتنے آج وہ ہمارے لئے ہیں"۔

"لیکن اس کے باوجود وقت کا بے رحم ہاتھ ان تعمیرات پر اپنا نشان چھوڑے بغیر نہ رہ سکا اور ان میں سے بعض یادگاریں جو اگر "The Book of Hermes" میں مذکور نہ ہوتیں تو ہمیں ان کا پتا تک نہ چلتا، ہمیشہ کے لئے وقت کی تاریکیوں میں گم ہو گئیں۔ ایک کے بعد ایک بادشاہ، ایک کے بعد ایک خاندان، آنے والی نسلوں کی آنکھوں کے سامنے اپنے اپنے شوکت و جلال کا تماشہ دکھا کر

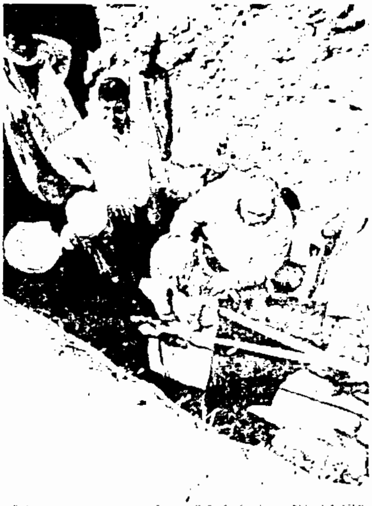

ایک صدی سے اسکالرز، ماہرینِ آثار قدیمہ اور سیاح اس جستجو میں لگے رہے کہ کہیں سے کوئی لکسر (Luxor) کے مندر کا سراغ مل جائے جو دریائے نیل میں قدیم زمانے میں آنے والے سیلاب کی وجہ سے نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ لاکھوں عشروں سے زیادہ لوگ لکسر کے اندرونی مندر کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ کسی کو ذرا سا سان و گمان نہیں تھا کہ ان کے قدموں سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر لکسر کا یہ عظیم مندر دفن ہے جس میں مدفون ۲۰ قیمتی مجسمے لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہے اور پھر قسمت نے یاوری کی، بلکہ یوں کہہ لیں کہ معجزہ ہوا کہ ماہرینِ آثار قدیمہ کو جنوری ۱۹۸۹ء میں لکسر کے مندر کا سراغ مل گیا اور صرف تین فٹ کے فاصلے پر قیمتی مجسمہ مل گیا۔ یہ ڈرامائی دریافت شکاگو یونیورسٹی کے ماہر مصریات لینی بیل نے کی اور فرعون آمن حوتپ کا سنگی مجسمہ ڈھونڈ نکالا جس کا اقتدار چودھویں صدی قبل مسیح میں اپنے عروج پر تھا یہ مجسمہ آٹھ فٹ اونچا ہے۔

جاتے گئے اور دنیا ان کی پر شکوہ داستانوں سے معمور ہو گئی۔

ان معلوم بادشاہوں اور ان کی عظیم یادگاروں پر اسی طرح تاریکی اور فراموشی کا پردہ پڑا رہتا اگر ہمارے مستند تاریخ دانوں کا پہلا تاریخ داں ہیروڈوٹس دنیا کے ایک عجوبہ ''عظیم بھول بھلیاں'' (The Great Labyrinth) آنے والی نسلوں کے سامنے نہ لے آتا۔ بائبل کی عرصہ دراز سے تسلیم شدہ تقویم (Chronology) نے ذہنوں کو اس قدر تنگ کر دیا ہے کہ نہ صرف پادری حضرات بلکہ ہمارے دور کے آزاد خیال سائنس داں بھی دنیا کے مختلف حصوں میں دریافت شدہ قبل از تاریخ کے باقیات کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح خوف زدہ ہو جاتے ہیں جیسے چھ ہزار سال پہلے، جو مذہبی طور پر دنیا کی عمر تسلیم کی گئی ہے، کی کسی چیز کو قابلِ توجہ سمجھا تو ان کا ایمان (اگر ہے تو) جاتا رہے گا۔

ہیروڈوٹس کو یہ ''بھول بھلیاں'' کھنڈرات کی صورت میں ملی تھیں مگر اس کے مشاہدے نے سے ششدر کر دیا اور وہ تسلیم کئے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کے معمار اعلیٰ ترین مہارتوں اور ذہانتوں کے مالک تھے۔ وہ اسے اہراموں سے بھی زیادہ عجوبہ روزگار سمجھتا تھا۔ ماہر مصریات کے علاوہ فرانسیسی اور پروشین علماء نے بھی جب اس کا مشاہدہ کیا تو اسے اعلیٰ درجے کی باقیات تسلیم کیا اور اس کے بارے میں اس قدیم تاریخ داں کے بیان کی تصدیق کر دی۔ ہیروڈوٹس کا کہنا ہے کہ اسے اس ''بھول بھلیاں'' میں تین ہزار کمرے ملے تھے جن میں سے آدھے زیرِ زمین اور آدھے سطح زمین پر تھے۔ 'اوپر والے کمروں میں'' وہ لکھتا ہے ''میں خود گھوما ہوں اور انہیں اچھی طرح دیکھا ہے مگر زیرِ زمین لمروں میں (جو ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے بقول ابھی تک موجود ہیں) عمارت کے نگرانوں نے مجھے

اجازت نہیں دی کیونکہ وہاں نہ صرف ان بادشاہوں کے مدفن تھے جنہوں نے یہ "بھول بھلیاں" تعمیر کروائی تھیں بلکہ ان کے مقدس مگرمچھ بھی تھے۔ میں نے اوپر کے چیمبروں کا خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے اور انہیں انسانی تعمیرات کے فنِ کمال پر پایا تھا"۔

رالنسن (Rawlinson) کے ترجمے میں ہیروڈوٹس کا بیان ہے کہ "جب میں مکانوں کی راہداریوں اور صحنوں میں بل کھاتی روشوں پر سے گزرا تو میرا دل تعریف و تحسین کے جذبات سے لبریز تھا۔ میں صحنوں سے کمروں میں، کمروں سے دالانوں اور برآمدوں میں اور پھر مکانوں میں اور پھر ایسے دالانوں میں پہنچا جو شاید پہلے کسی نے نہیں دیکھے تھے۔ چھتیں بھی دیواروں کی طرح پتھروں کی بنی ہوئی تھیں اور دونوں پر نہایت عمدہ اور خوشنما تصویریں کندہ تھیں۔ ہر صحن سفید پتھر کے ستونوں سے گھرا ہوا تھا جن پر صورتیں تراشی ہوئی تھیں۔ "بھول بھلیاں" کے ایک کونے پر چالیس فیدم (چھ فٹ) اونچا اہرام تھا جس پر تصاویری نقش و نگار کندہ تھے۔ اہرام کے اندر جانے کا راستہ ایک وسیع زیرِ زمین راہداری نما تھا۔

ہیروڈوٹس کے مشاہدے کے وقت اگر "بھول بھلیاں" ایسی تھیں تو قدیم تھیبس (Thebes) کیسا ہوگا جسے سامے ٹیکس (Psammeticus) کے دورِ حکومت سے بہت پہلے تباہ کر دیا گیا تھا۔ ٹرائے (Troy) کی تباہی کے پانچ سو تین برس بعد وہاں اسی کی حکمرانی تھی۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ اس کے دورِ حکومت میں ممفس (Memphis) وہاں کا دارالحکومت تھا جب کہ عالی شان تھیبس محض کھنڈرات تھا۔ اب ہم لوگ جو آج ان کھنڈرات کو جو ہمارے زمانے سے صدیوں پہلے ہی کھنڈرات چلے آرہے ہیں، دیکھ کر حیران و ششدر رہ جاتے ہیں تو ان لوگوں کا کیا حال ہوا ہوگا، جنہوں نے تھیبس کو اس پر شکوہ عروج کے زمانے میں دیکھا تھا؟ کرناک (Karnak) مندر، محل، کھنڈرات یا ماہرینِ آثارِ قدیمہ اسے جو بھی نام دیتے ہیں اب اس دور کی واحد نمائندہ رہ گئی ہے 'یکہ و تنہا کھڑی ہے۔ یہ عمارت اس عالی شان سلطنت کی نشانی ہے جسے وقت نے گزرتی صدیوں کی دھول میں فراموش کر دیا ہے مگر جو اب بھی اپنے قدیم دور کے علوم و فنون کا بے مثال مظہر ہے۔ وہ شخص جو اسے دیکھ کر اس قوم کی ذہانت اور سطوت کا جس نے اسے پلان کیا اور تعمیر کیا معترف نہیں ہوتا، وہ یقیناً حسِ جلال و جمال سے محروم ہے۔

شیمپولین (Champolion) جس نے اپنی پوری زندگی کھنڈرات کو کھنگالتے ہوئے گزار دی تھی کرناک کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کرتا ہے "ان عمارات کے باقیات نے جس قطعہ زمین کو گھیر اہوا ہے وہ چورس (مربع) ہے اور اس کی ہر سمت کی لمبائی اٹھارہ سو فٹ ہے۔ ان پرُ ہیبت کھنڈرات کو دیکھ کر آدمی کی عقل چکرا کر رہ جاتی ہے۔ ہر ہر مقام پر کاریگری اور صناعی کے اعلیٰ درجے کے آثار موجود ہیں۔ قدیم و جدید زمانے کے لوگ فنِ تعمیر کے اس کمال کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو قدیم مصریوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ یورپ والوں کا غلام گردشوں اور بارہ دریوں کا تصور جسے وہ بہت بلندی پر سمجھتے ہیں کرناک کی ایک سو چالیس زیرِ ستون راہداریوں کے سامنے بڑا بچکانہ اور محض

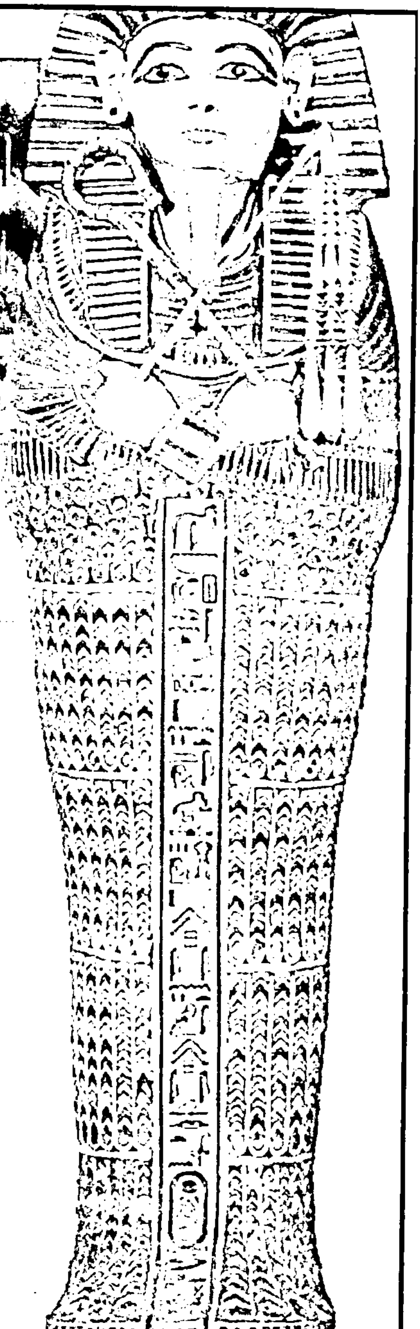

امریکہ کی میڈیکل آرٹسٹ بیٹی بیٹ گیٹلنٹ
نے ماہرِ بشریات کلائیڈ سنو کی مشاورت سے
فرعون توتخ آمن کی کھوپڑی پر پلاسٹر کی مدد
سے اس کے چہرے کو بنالیا۔ یہ دیکھ کر یقیناً آپ
کو حیرت ہوگی کہ اس کا چہرہ توتخ آمن کے
طلائی تابوتی جسم سے ملتا جلتا ہے۔ فرعون توتخ
آمن کی کھوپڑی کی پیائش ان کے ۱۹۲۵ء میں
کئے گئے پوسٹ مارٹم اور ۱۹۷۵ء میں لئے گئے
ایکسریز سے کی گئی۔ چہرے کا پلاسٹر ماڈل سنو کی
دی گئی رپورٹ کی روشنی میں بنایا گیا وہ کہتے ہیں
کہ اس کم عمر بادشاہ کے نقش نیگرو نسل سے
ملتے جلتے ہیں اور اس کی طلائی تابوت سے
مشابہت اس بات کا ثبوت ہے کہ لڑکے توتخ
آمن کا چہرہ یہی ہوگا۔

اس کے قدموں کی دھول لگتا ہے۔ اس کے صرف ایک ہال میں اگر نوٹرے ڈیم کا گرجا گھر (The Cathedral of Notre Dame) کھڑا کر دیا جائے تو نہ صرف وہ اس ہال کی چھت کو نہیں چھو سکے گا بلکہ یوں لگے گا جیسے ہال کے وسط میں اس کی سجاوٹ کے لئے کوئی چھوٹا سا کھلونا رکھ دیا گیا ہو۔

• ۱۸۷۰ء کے ایک انگلش جریدے کے کئی شماروں میں لکھنے والے ایک مصنف نے جو ایک جہاں گرد سیاح کے سے اعتماد سے لکھتا تھا، لکھا ہے۔ ”دالان، ہال، دروازے، لاٹھ، چہار پہلو سنگی ستون، یک سنگی دیوزاد شبیہیں، مجسمے اور اسفنکس کی طویل قطاریں اتنی بڑی تعداد میں کرناک میں موجود ہیں کہ جدید دور کا انسان ان کا تصور بھی نہیں کر سکتا“۔

فرانسیسی سیاح ڈینن (Denon) لکھتا ہے ”دیکھنے کے بعد بھی اس بات پر یقین کرنا بڑا مشکل لگتا ہے کہ ایک ہی مقام پر اتنی بہت ساری عالی شان عمارتیں موجود ہیں ان پر نہ جانے کتنا خرچ آیا ہوگا اور جن کی تعمیر میں انسانوں کو نہ جانے محنت اور استقلال کی کن کن کڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ ان عمارتوں کی تفصیلات پڑھتے ہوئے قاری پر خواب کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جب کہ وہ لوگ جو انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں وہ بھی اپنی بیداری پر شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ اتنے حیران ہو جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ کیا وہ یہ سارا طلسم جیتی جاگتی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس مامن یا مقدس جگہ (Sanctuary) کے محیط میں جھیلیں ہیں، پہاڑ ہیں، بس ان دو چیزوں ہی سے سمجھ لیں کہ وہاں کیا کیا نہ ہوگا۔ پوری وادی اور دریائے نیل کا ڈیلٹا آبشار سے سمندر تک مندروں، محلوں، مقبروں، اہراموں، مٹھوں اور چہار پہلو ستونوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ مجسموں کی حسین تراش کی تعریف سے الفاظ قاصر ہیں۔ فن کاروں نے سنگ سماق، سنگ سیاہ، برشہ اور دھاری دار پتھروں کی تراش خراش میں جو میکانکی کمال دکھایا ہے وہ انتہائی حیرت انگیز ہے۔ تمام ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ جانور اور پودے بالکل مانندِ اصل دکھائی دیتے ہیں اور مصنوعی چیزوں کی بھی بڑی خوبصورتی سے نقاشی کی گئی ہے۔ بری اور بحری جنگیں اور گھریلو مصروفیات کے مناظر بھی جابجا کندہ دکھائی دیتے ہیں۔

ایک انگریز مصنف کہتا ہے ”یہ آثار و یادگاریں جو سیاحوں کے لئے بے انتہا کشش رکھتی ہیں ان کے ذہنوں کو عجیب و غریب خیالات سے بھر دیتی ہیں۔ دیو قامت مجسمے اور پر شکوہ یک سنگی ستون دیکھ کر جو انسانی استعداد سے بعید نظر آتے ہیں اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔ ”یہ انسانی کاریگری ہے تو“ وہ سوچتا ہے ”انساں عظیم ہے خدایا“۔

ڈینڈرا کے مندر کی بات کرتے ہوئے ڈاکٹر رچرڈسن کہتا ہے ”دوشیزاؤں کے مجسمے اس قدر نزاکت، نفاست اور مہارت سے بنائے گئے ہیں کہ صرف گویائی کی کسر رہ گئی ہے۔ ان کے چہروں کے تاثرات اور ملاحت اور جاذبیت کی تعریف الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی“۔

یہاں موجود ہر پتھر تصویری تحریر سے بھرا ہوا ہے اور پتھر جس قدر پرانا ہے اس پر کھدی ہوئی

تحریر اتنی ہی زیادہ خوبصورت ہے۔ کیا اس سے یہ ایک نئی بات ثابت نہیں ہوتی کہ تاریخ نے ان قدماء کی جھلک اس وقت دیکھی تھی جب ان کے تیزی سے زوال کا وقت شروع ہو چکا تھا؟ چہار پہلو ستونوں پر جو تحریر کندہ تھی وہ دو انچ بلکہ کہیں کہیں اس سے بھی زیادہ گہری تھی مگر یہ کھدائی انتہائی کمال کا مظہر تھی۔ اس کی گہرائی کا اندازہ اس حقیقت سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ عرب لڑکے تھوڑے سے پیسوں کی خاطر ان کھدے ہوئے تصویری حروف میں اپنے پنجے گاڑ کر انگلیوں کی گرفت کر کے ان چہار پہلو ستونوں کی چوٹی پر چڑھ جایا کرتے تھے یہ اور اس قسم کے دوسرے کام، جن کی پختگی اور خوبصورتی یکساں طور پر بے مثال تھی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے مصر سے خروج سے پہلے کے زمانے میں سرانجام دیئے گئے تھے اور یہ بات تاریخی طور پر بھی ہر قسم کے شکوک وشبہات سے بالاتر ہے۔ اب تو تمام ماہرینِ آثارِ قدیمہ بھی اس بات پر متفق ہو چکے ہیں کہ ان ہنر مندیوں کے سلسلے میں جس قدر تاریخ میں پیچھے کی طرف چلتے جائیں اسی قدر ان فنون کے کمال اور نفاست میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

ان نظریات کی تردید میں صرف مسٹر فسکی کی انفرادی رائے ہے جو ہمیں یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ "یہ مجسمے جو ان یادگاروں میں ایستادہ ہیں (مصر، ہندوستان اور اسیریا کی) ہنر مندی کی انتہائی ناپختہ شکلیں ہیں"۔

ہمارا یہ فاضل دوست تو اپنی اس دشمنی میں اس سے بھی کہیں زیادہ بڑھ جاتا ہے جب وہ عہدِ پارینہ کے علم وہنر کی تکذیب کرتے ہوئے اس کی مخالفت میں لیوس (Lewis) کی آواز میں آواز ملاتا ہے اور اس کی تائید کرتے ہوئے بڑی حقارت سے لکھتا ہے "عہد رفتہ میں مصری علماء کے علوم و فنون کی جس انداز میں تعریف وتوصیف کی گئی ہے اور یونان کے عظیم فلسفیوں کو ان کا خوشہ چیں بتایا گیا ہے وہ دیوانہ کی بڑ سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور اس سحر کو سر جی سی لیوس (Sir G.C. Lewis) پہلے ہی مکمل طور پر فنا کر چکے ہیں"۔

مصر، ہندوستان بلکہ اسیریا (Assyria) تک (میسوپوٹیمیا ، عراق) کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ دیو پیکر یادگاریں جو ان ممالک کے لئے زمانہ قبل از تاریخ سے باعثِ افتخار وفضیلت چلی آ رہی ہیں اس بات کی گواہ ہیں کہ وہ اس دور کے بربری استبداد کی علامت ہیں جن کا اس دور کے اعلیٰ سماجی شعور سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا جو ابھی تک قائم ودائم ہے"۔

بلاشبہ بڑا عجیب استدلال ہے۔ اگر پبلک عمارات کی بڑائی اور شان وشوکت کو ہماری نسل کے لئے اس "تہذیب وتمدن کی ترقی" کو ناپنے کا ایک پیمانہ سمجھ لیا جائے جو اس کے معماروں نے حاصل کی تھی تو شاید امریکہ کو جو خود کو بجا طور پر آزاد اور ترقی یافتہ کہتا ہے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی عمارات کے قد گھٹا کر صرف ایک منزل تک محدود کر دینا چاہیئے ورنہ پروفیسر فسکی کے نظریئے کے مطابق سن ۷۷ ۸ ۳ عیسوی کے ماہرینِ اثریات "قدیم امریکہ" پر لیوس کا قانون لاگو کر کے قدیم ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو محض ایک وسیع جاگیر یا تعلقہ قرار دے دیں گے جس کی پوری

آبادی بادشاہ (صدر) کے غلاموں کی حیثیت سے زراعت و تعمیرات کے عذاب میں مبتلا تھی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ سفید چمڑی والی آریائی نسلیں مشرقی ایتھوپینس یا سانولی چمڑی والے کاکیشینز کی طرح کبھی پیدائشی "معمار" نہیں رہی ہیں۔ چنانچہ دیو پیکر اور عظیم الشان تعمیرات میں وہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں اور جب انہوں نے یہ عالی شان منادر اور اہرام دیکھے تو ان کے تنگ ذہن میں صرف یہ بات آسکی کہ جابر و ظالم حکمرانوں نے کوڑے کے زور پر اپنی رعایا سے یہ عمارات کھڑی کروائی تھیں۔

عجیب منطق ہے معقولیت کی بات تو یہ ہے کہ ہم لیوس اور گروٹے (Grote) کی شدید تنقید اور منافقانہ فتوے سے صرف نظر کرتے ہوئے ایمانداری سے اس بات کو تسلیم کر لیں کہ ہم ان اقوام کہن کے بارے میں ابھی بہت ہی کم جان سکے ہیں اور جب تک ہم ان قدیم حکماء و علماء کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان کے آثار صنادید کا مطالعہ نہیں کریں گے مستقبل میں بھی ان کے بارے میں کچھ زیادہ جاننے کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ ہم ابھی تک اتنا ہی جان سکے ہیں جتنا کہ کسی مبتدی کو جاننے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ تاہم جو کچھ بھی ہم ابھی تک اپنے مشاہدے سے اخذ کر سکے ہیں، ہمارے اس یقین کے لئے کافی ہے کہ حالانکہ انیسویں صدی میں ہونے اور سائنس اور آرٹس میں اپنی تمام تر برتری کے دعووں کے باوجود ہم ہرگز اس قابل نہیں ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم اس دور میں مصر، ہندوستان یا اسیریا جیسی عظیم الشان عمارتیں نہیں کھڑے کر سکتے۔ بلکہ کم از کم ہم اس "گمشدہ فن" (Lost Art) کو دوبارہ دریافت کرنے کے قابل نہیں ہو سکتے ہیں جو مصری قدماء کا سرمایہ افتخار تھا۔ اس کے علاوہ سر گارڈنر ولکنسن کھدائی کے بعد دریافت شدہ اس قدیم خزینہ کے بارے میں پرزور الفاظ میں کہتے ہیں کہ "عہد رفتہ کے طرز زندگی اور بربری رسم و رواج کی کوئی علامت نہیں مل سکی ہے بس اس دور کی ایک ایسی تہذیب کا پتا چل سکا ہے جو برسوں تک دنیا پر غالب رہی تھی"۔

اب تک یہ مسئلہ اثریات (Archaeology) اور ارضیات (Geology) کے لئے بھی متنازعہ ہی رہا ہے جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ جتنا زیادہ پیچھے تک انسان کی باقیات کا پتا چلتا جائے گا اتنا ہی ان کے وحشی اور غیر مہذب ہونے کی علامتیں نظر آتی جائیں گی۔ یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ غاروں نے جو تحقیقی مواقع ماہرینِ ارضیات کو مہیا کئے تھے وہ اس کی حدوں کے قریب پہنچ گئے ہیں اور کچھ پتا نہیں کہ جب ماہرینِ ارضیات اپنے حالیہ تجربات کی بنیاد پر ان آباؤ اجداد کی باقیات کی جنہیں وہ غاروں کے مکین کہتے ہیں، تہہ تک پہنچیں تو ان کے نظریات یکسر طور پر بدل کر رہ جائیں۔

☆

گیزا کے عظیم اہرام

گیزا کی سطح مرتفع کی سیر کے لئے آنے والے سیاحوں کو عام طور پر مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پتھروں کے انبار اور ملبے کے ڈھیر دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ کہیں ان کی ساری محنت غارت تو نہیں ہوئی۔ بلاشبہ بے محابہ گزرتی صدیوں نے اس عظیم اہرام کی شوکت و سطوت کو بری طرح مجروح کر دیا ہے تاہم ملبے کا اتنا عظیم الشان ڈھیر بھی کافی متاثر کن ہے۔ ریتیلی سطح پر بکھرا ہوا یہ عظیم اہرام اپنی وسعت' وزن اور پیمائش سے آنے والوں کو ششدر کر کے رکھ دیتا ہے۔ ''یہ ہمارے آباؤاجداد کی بے مثال بہادری اور قوت ارادی کا ایک بھاری بھر کم مظہر ہے''۔ دو عرب گائیڈز کی مدد سے سیاح اہرام کی چوٹی پر پہنچتے ہیں ان میں سے ایک گائیڈ انھیں اوپر کھینچتا ہے تو دوسرا دھکیلتا ہے اور اس طرح وہ اوپر پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اوپر پہنچ کر آپ خود کو تیئس مربع فٹ کے سنگی چبوترے پر کھڑا ہوا پاتے ہیں۔ چوٹی کا حصہ شاید اس وجہ سے مسطح ہے کہ پوری عمارت کا سنگی تاج یا تو ان پر کبھی رکھا ہی نہیں گیا یا پھر کسی دور میں اسے ہٹا دیا گیا۔ اہرام سے اتر آنے کے بعد دوسرا نمبر اس کے اندرونی حصے کی سیر کا آتا ہے۔ بے شمار سرنگوں اور راہ داریوں میں اب حفاظتی جنگلے لگا دیئے گئے ہیں اور بجلی کے قمقمے جگمگا رہے ہیں۔ بعض ڈھلان دار راہداریوں میں قدمچے بھی تراش دیئے گئے ہیں۔ ''ایک زمانہ تھا جب آپ کو اہرام کے اندر کی سیر کے لیئے آنے سے پہلے بھاری رقم کا بیمہ کروانا پڑتا تھا'' ایک ماہر مصریات نے کہا ''مگر آج تو حفاظتی جنگلوں اور بجلی کے قمقموں کی وجہ سے یہاں کی سیر بڑی دلچسپ اور خوشگوار ہو گئی ہے۔'' جب یہ عظیم اہرام مکمل ہوا ہو گا تو اسکے معماروں نے اس عمارت کو چاروں طرف سے بہترین پالش شدہ چونے کے پتھروں سے ڈھانپ دیا تھا۔ چونے کے پتھر کی یہ سلیں ایک سو انچ تک چوڑی تھیں اور جب یہ غلافی دیوار ہٹا دی گئی اور اسکی سلیں قاہرہ میں ایک مسجد کی تعمیر کے لئے لے جائی گئیں تو اہرام کا بنیادی حسن ماند پڑ گیا۔ سر فلنڈرس پیٹری (Pe-trie) ایک ماہر مصریات نے مصر میں ''برٹش اسکول آف آرکیالوجی'' کی بنیاد رکھی۔ اس نے اہرام کی غلافی دیواروں میں استعمال ہونے والی سلوں کی پیمائش کی تھی اور اسے حیرت انگیز تعمیراتی فن کاری قرار دیا تھا۔ ''یہ سلیں اپنے جوڑ پر ایک انچ کا گیارہ سو پچاسویں حصہ جتنا چوڑا خلاء بنا رہی تھیں اور یہ بات جدید پیمائشی ماہرین کے لئے بھی انتہائی حیران کن تھی''۔ پیٹری نے اہرام کی دوسری حیرت انگیز باتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ''کنگس چیمبر کے اندر گلابی سنگِ خارا کے بلاکوں کو بڑی مہارت سے چنا

گیا ہے ان میں سے بعض جوڑ ایک انچ کا دس ہزارواں حصہ ہیں جو انسانی بال کی چوڑائی سے ذرا ہی زیادہ ہے۔ ''لوگ اکثر حیرت سے سوچتے ہیں کہ کیا اس عظیم اہرام کی تعمیر کا کوئی 'بلیو پرنٹ' بھی تھا۔ بلاشبہ اتنی بڑی عمارت کی تعمیر سے قبل کوئی نہ کوئی منصوبہ بندی تو ضرور کی گئی ہوگی۔ صرف ایک نقشہ جس میں آزمائشی راہ داریوں کا ایک خاکہ سا بنا ہوا ہے اہرام کے قریب ایک چٹان پر کھدا ہوا ملا ہے۔ یہ کھدائی شاید معمار کارکنوں نے ایک دوسرے میں الجھی ہوئی سرنگوں اور راہ داریوں کے مکمل نظام کی رہبری کے لئے کی تھی۔ ماہرین مصریات کو یقین ہے کہ اس عمارت کی تعمیر سے قبل اس کے پورے اندرونی نظام کو چٹانوں پر کاٹ لیا گیا تھا۔ مصر کی Book of the Dead میں ایک معیاری اہرام کی تعمیر کے لئے ہدایات درج ہیں۔ یہ کتاب یقیناً زمانہء قدیم میں لکھی گئی تھی ''ممی'' "Mummy" کے مصنف سر ای اے ویلس بج کا بیان ہے کہ Book of the Dead کا چونسٹھواں باب تقریباً چار ہزار دو سو پچاس قبل مسیح 4250 B.C میں ہی ھسیپٹی He-sep-ti کے دورِ حکومت میں دریافت ہوا تھا۔ اہرام کی تکمیل کے بعد اس کا واحد داخلی دروازہ شمالی سمت میں بنیاد سے تقریباً پچاس فٹ کی بلندی پر تھا۔ بہت سارے مصنفین محسوس کرتے ہیں کہ اس تعمیر کی پیائش میں سائنسی تکنیک کار فرما ہے' ان کا دعویٰ ہے کہ یہ دروازہ اہرام کی ڈھلان کے وسط سے ۲۲ء۱۰۲۸۶ انچ کے فاصلے پر ہے جو آفاقی قانونِ ربط کی نفی کرتا ہے۔ ایک ماہرِ اہرامیات کا کہنا ہے کہ البتہ یہ مادی اور غیر مادی چیزوں کے ربط کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ دروازہ ایک سرنگ میں کھلتا ہے جسے ''نشیبی راہ داری'' (Descending Passageway) کا نام دیا گیا ہے اس کی پیائش بھی داخلی دروازے جتنی ہی ہے یعنی ساڑھے سینتالیس فٹ ضرب ساڑھے اکتالیس فٹ۔ یہ نشیبی راہ داری ۲۶ ڈگری ۱۸ فٹ ۷ء۱۹ انچ کے زاویئے پر ۳۴۷ فٹ لمبی ہے۔ یہ اترائی اچانک ہی ختم ہو جاتی ہے اور پھر افقی سمت میں تین فٹ تک چلی جاتی ہے۔ اس نشیبی راہ داری کا خاتمہ The Pit پر ہوتا ہے جو ۴۶ فٹ ایک انچ لمبا' ستائیس فٹ ایک انچ چوڑا ایک تاریک اور مرطوب غار ہے اور جس کی گہرائی ایک فٹ سے چودہ فٹ تک ہے۔ ''پٹ کی چھت مکمل مسطح ہے'' ایک گائڈ نے سیاحوں کو بتایا ''جب کوئی سیاح نشیبی راہ داری میں اترتا ہے تو ۱۰۰ا انچ کا سفر کر کے وہ ایک کھلی جگہ آجاتا ہے جہاں سے اوپر جانے والی راہ داری Ascending Passage way شروع ہو جاتی ہے یہ راستہ نشیبی راہداری سے ۲۶ ڈگری ۱۸ فٹ ۷ انچ کے زاویئے پر الگ ہو جاتا ہے اور ۱۲۸ فٹ ۱۰ انچ بعد گرینڈ گیلری (The Grand Gallery) میں جا نکلتا ہے۔ گرینڈ گیلری میں آنے والے لوگوں کو اس گڑھے کی وجہ سے بڑا چوکنا رہنا پڑتا ہے جسے "The Well" (کنویں) کا نام دیا گیا ہے۔ آپ کمرے میں صرف ۳۳ انچ اندر آئیں گے تو آپ کو ایک چوکور گڑھا نظر آئے گا اس ''ویل'' کے ذریعے سیاح نشیبی راہداری کی چھت پر آجاتے ہیں اس پورے سفر میں سپاٹ دیواریں ہیں جن میں صرف ایک طاق ہے جسے "The Grotto" کا نام دیا گیا ہے۔ گرینڈ گیلری کا فرش اسینڈنگ پیسج کے زاویئے پر ہی بنا ہوا ہے جس کا حسن قابلِ دید ہے۔ یہ کمرہ ۲۸ فٹ بلند ہے

جس کے نیچے کی چوڑائی زیادہ سے زیادہ سات فٹ ہے اس کی دیواریں انتہائی پولشڈ لائم اسٹون کی بنی ہوئی ہیں گیلری سے ۱۵۹ فٹ چل کر سیاح "عظیم قدمچہ" Great step تک پہنچتا ہے یہ سرخ لائم اسٹون کا ایک لمباچوڑا بلاک ہے جو فرش سے ٹھیک ۳ فٹ اوپر اٹھا ہوا ہے یہ قدمچہ ۶۱ا انچ لمبا ہے۔ گریٹ اسٹیپ کے اختتام پر ایک پتھر کی دیوار ہے جس کی تہہ میں ایک چھوٹی سی سرنگ ہے جو صرف ۱۴۱ انچ لمبی ہے پورے اہرام میں یہ سب سے زیادہ تنگ راہداری ہے۔ یہ راستہ ۱۵۲ انچ دور جاکر ذیلی کمرے (Ante-chamber) میں نکلتا ہے۔ یہ ذیلی کمرہ ۱۴۹ انچ دور سے Granite leaf شروع ہو جاتا ہے یہ لیف بھاری سنگ خارا کی دہری سل ہے جو فرش سے ۱۴۳ انچ اوپر لٹکی ہوئی ہے اس لیف کے کنارے پر ۵x۵ انچ کا ایک اور پتھر ہے جس کی شکل گھوڑے کے نعل جیسی ہے ماہرین اہرامیات کے خیال کے مطابق یہ نعل ایک پیرامڈ انچ جتنی موٹی ہے۔ اس چھوٹے سے سنگی نعل کا نام "The Boss" ہے۔ کئی ماہرین کا خیال ہے کہ دی بوس کی یہاں موجودگی پیمائش کی اس اکائی کی طرف اشارہ کرتی ہے جو اس اہرام کی تعمیر میں استعمال کی گئی ہے۔ بعض کو یقین ہے کہ یہ نعل قدیم مقدس ہیبر یو نمبر کیوبٹ کی علامت ہے۔ پیرامڈ انچ برطانوی معیاری انچ سے ذرا سا بڑا ہے۔ یہ اکائی سب سے پہلے پیازی اسمتھ نے پیش کی تھی۔ اسمتھ کا یہ دعویٰ تھا کہ پیرامڈ انچ کی بنیاد زمین کے گردشی محور پر رکھی گئی تھی' جو زمین کے ایک قطب سے دوسرے قطب تک کا فاصلہ ہے۔ اس وقت یہ فاصلہ تقریباً ۷۸۹۹ء۳ برطانوی میل یا ۵۰۰'۵۰۰'۵۰۰ انچ تھا۔ پیرامڈ انچ کے حساب سے یہ فاصلہ ۵۰۰'۰۰۰'۰۰۰ انچ بنتا تھا۔

مگر ان سب باتوں کا مقصد کیا ہے؟ آخر ہر شخص پیمائش کے پیچھے کیوں پڑا ہوا تھا؟

"پیمائش کی صحیح اکائی کا پتا لگانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے افسانوی سونے کے شہر city of gold کا دریافت کرلینا۔" ڈاکٹر روزن برگ نے کہا۔ "ماہرین کا کہنا ہے کہ پیرامڈ انچ دنیا کی مکمل ترین پیمائش کی اکائی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ اس وجہ سے اتنا درست ہے کہ یہ دنیا کے قطبی محور

مصریوں کے ہاں بڑوں کی مانند بچوں کو بھی حنوط کرنے کا رواج تھا۔ ان دو مصری بچوں کی عمر صرف دو یا تین سال تھی جو قاہرہ سے جنوب مغرب کی جانب ۳۰ کلو میٹر کے فاصلے پر موجود بہاریہ اوسس نامی مقام پر سے ملیں۔ ان حنوط شدہ لاشوں کو لینن کے کپڑے میں لپیٹا گیا ہے اور یہ بھی چور اچکوں کی دسترس سے محفوظ رہیں۔ یہ ممیاں مصر میں تہذیب کے عروج سے بھی پہلے دور کی ہیں جس سے قدیم مصر کی اوائلی زندگی کے نئے باب کھل گئے ہیں۔

کی گردش کا ایک حصہ ہے Earth's polar axis of rotation یہ ایک خط مستقیم ہے:
زمین پر ایک قطب سے دوسرے قطب تک چلا جاتا ہے۔"

اہرامِ عظیم کی ریاضیاتی سچائیوں کو ماننے والے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ میٹرک نظامِ پیائش (Metric System of measurement) میں خامی ہے "میٹر اس خط نصف النہار کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے جو پیرس پر سے گزرتا ہے" ڈاکٹر روزن برگ نے کہا۔ "اور چونکہ خط نصف النہ (Meridian line) نے زمین کو گھیرا ہوا ہے جو گول ہے چنانچہ میٹرک نظام کی بنیاد ایک دائرہ۔ اور ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ ایک قوس کے مقابلے میں خطِ مستقیم زیادہ درست اور قابلِ اعتب ہے"۔

دیوان شاہی (King's Chamber) میں جانے کے لئے ایک سیاح کو پہلے ذیلی کمر (Ante-Chamber) میں سے گزرنا پڑتا ہے اس کمرے کے جنوبی سرے پر ۱۰۱٫۷ انچ لم ایک چھوٹی سی راہ داری ہے۔ یہ سرنگ سیدھی دیوان شاہی میں جا نکلتی ہے جو اس اہرام کا حسیں ترین کمرہ ہے۔

دیوان شاہی کی لمبائی ۳۴ فٹ ۴ انچ یعنی کل ۴۱۲ انچ، چوڑائی ۱۷ فٹ ۲ انچ (۲۰۶ انچ) ا اونچائی ۱۹ فٹ دو انچ (۲۳۰) انچ ہے اس دیوان کی دیواروں میں گلابی رنگ کے ایک سو گرینائٹ پتھ استعمال ہوئے ہیں جنہیں بہترین پالش سے چمکایا گیا ہے۔ کمرے میں ہوا کا انتظام دو ۹ مربع ا چوڑے شافٹ سے کیا گیا ہے جو بیرونی دنیا میں کھلتے ہیں۔

دیوان شاہی کی سجاوٹ محض مشہورِ زمانہ شاہی صندوق "King's Coffer" سے کی گئی ہے یہ ایک کھلا بغیر ڈھکن کا صندوق ہے جسے گلابی رنگ کے صرف ایک سنگ خارا سے تراشا گیا ہے۔ اا کی پالش بھی قابلِ دید ہے۔ پہلے اسے بادشاہ کا تابوت ہی سمجھا گیا تھا مگر آج اس بات میں شبہ پیدا ہو گ ہے اور کوئی بھی دیوان شاہی میں اس کی موجودگی کا سبب یقینی طور پر نہیں بتا سکتا۔

یہ صندوق یا تابوت ساڑھے سات فٹ لمبا تین فٹ تین انچ چوڑا اور تین فٹ پانچ انچ گہرا ہے اس کے گلابی گرینائٹ کے کنارے چھ انچ موٹے ہیں "کیا یہ صندوق دیوتا سمان بادشاہ کی تدفین ۔ لئے بنایا گیا تھا؟" روزن برگ نے سوال کیا۔ "یا اس صندوق کا کوئی اور علامتی مفہوم ہے؟ اگر آپ کو کنس چیمبر میں جانا یاد ہو تو وہاں آپ نے ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی ہو گی۔ کیا اس کا کوئی خاص مقص ہے یا پھر ہم نصف سچائیوں کا تعاقب کر رہے ہیں جب آپ اہرام کی بات کرتے ہیں تو ذہن میں۔ شمار سوالات پیدا ہوتے ہیں مگر جواب چند ایک ہی کے ملتے ہیں"۔

کوئنس چیمبر میں جانا ایک دلچسپ تجربہ ہے اس چونے کے پتھر سے بنے ہوئے کمرے میں کوئی فرنیچر ہے اور نہ ہی سجاوٹ کی کوئی اور چیز ہے۔ اس کے اندر بھی سیاح کو یہاں کی روایتی سرنگوا میں سے ایک سرنگ کے ذریعے داخل ہونا پڑتا ہے۔ ملکہ کا یہ کمرہ اٹھارہ فٹ دس انچ (۲۲۶ انچ) ا سترہ فٹ ایک انچ (۲۰۵ انچ) چوڑا اور پہلی سطح پر اس کی دیواریں پندرہ فٹ چار انچ (۱۸۴ انچ) او

معروف ماہر آثار قدیمہ زاہی ہواس نے کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ انہیں اہرام مصر میں نوکری ملے گی اور یہاں پر کام کرتے ہوئے انہیں ۲۰ برس سے زائد کا عرصہ لگ جائے گا۔ چار سال قبل انہوں نے اچانک غزہ کی پٹی پر واقع مصر کی اوائلی زندگی کے مقابر بہاریہ اوسس ڈھونڈ نکالے۔ اس وقت وہ مدفون خانے میں بیٹھے دیواروں پر نقش کی گئی مصوری کو انتہائی اشتیاق سے دیکھ رہے ہیں جس میں سامنے کی دیوار پر آپ کو مصری دیوتاؤں اور دیویوں اسس، اوسرس، ہورس اور انوبس وغیرہ کی تصاویر نظر آ رہی ہیں۔

ہیں۔ اس کمرے کی محرابی یا نوکیلی چھت کی زیادہ سے زیادہ بلندی بیس فٹ پانچ انچ ہے۔ کمرے کی مشرقی دیوار میں ایک غیر معمولی طاق بنا ہوا ہے جسے "Great Niche" کہا جاتا ہے۔

سطح مرتفع گیزا کی سیر کے لئے آنے والے ابتدائی دور کے سیاحوں کو بڑے خوفناک خطرات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ انتہائی دہشت ناک ماحول میں انہوں نے بڑے قابلِ ذکر مشاہدات کئے۔ سر ولیم ایم ایف پیٹری (۱۹۴۲ء۔ ۱۸۵۳ء) نے انگلینڈ کے سب سے بڑے ماہرِ مصریات کی حیثیت سے ایک طویل اور باعزّت زندگی گزاری ہے۔ برطانیہ کے قدیم یک سنگی ستونوں کے مطالعے نے ان کے تجسس کو ہوا دی اور وہ مصر چلے آئے جہاں عظیم اہرام کی پیائش میں انہوں نے دو سال گزار دیئے۔ "پیٹری بڑا غیر معمولی آدمی تھا۔ ڈاکٹر روزن برگ نے کہا "اس کی زندگی کا عرصہ پچھلی صدی کے وسط سے وکٹورین دور سے ہوتا ہوا دوسری جنگِ عظیم تک پھیلا ہوا ہے۔ اسے جدید سائنسی آثارات (Archaeology) کا باوا آدم کہا جاتا ہے"۔

۱۸۷۰ء والی دہائی میں عظیم اہرام کی پیائش کے بارے میں بے شمار نظریات گردش کر رہے تھے۔ ان میں سے چند ایک کا خیال تھا کہ اہرام کی تعمیر میں آفاقی دانش کار فرما ہے۔ کچھ لوگوں کا نظریہ تھا کہ اہرام کی صورت میں ریاضی کے پیغامات درج ہیں گویا کہ سنگی زبان میں مستقبل کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ پیٹری ان تمام نظریات کی موجودگی میں کچھ الجھ کر رہ گیا خاص طور پر اہرام کی پیائش سے متعلق باتوں نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ "پیٹری کے آنے تک" روزن برگ نے کہا "یہ نظریات انفرادی پیائش کی بنیاد پر قائم کئے گئے تھے۔ مگر پیٹری کی مہارت نے گیزا کے اہرام کا انتہائی درست طول و عرض وغیرہ پیش کیا جسے بعد میں پورے مصر میں تسلیم کر لیا گیا"۔

پیٹری نے ۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۲ء تک کا عرصہ گیزا میں گزارا اس نے اپنے ان تجربات کو "The Pyramids of Giza" نامی کتاب میں رقم کیا جسے ایک سائنسی کام سمجھا جاتا ہے اس کے علاوہ اس کا ایک اور قابلِ ذکر کام "Ten Years Digging in Egypt" نامی کتاب ہے جو پڑھنے والوں کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتی ہے۔ یہ کتاب ریلی جئس ٹریکٹ سوسائٹی لندن نے ۱۸۹۳ء میں شائع کی تھی۔

پیٹری نے اس کتاب کا آغاز اپنے سفر کی تیاریوں کے بیان سے شروع کیا ہے: "۱۸۸۰ء کے

آخر میں مصر روانہ ہونے سے بہت عرصہ قبل سے ہی میں نے اس مہم کی تیاری شروع کر دی تھی۔ دو برس کے عرصے میں پیمائشی آلات، زاویہ پیما، رسی کی سیڑھیاں اور اس کام کے لئے دوسری ضروری چیزیں نہ صرف جمع کر لی گئی تھیں بلکہ انہیں آزما بھی لیا گیا تھا۔ یورپی ملک سے قطعی مختلف حالات میں کام شروع کرنے اور مصر میں ضروری اشیاء کی نایابی کے پیش نظر میں نے کچھ زیادہ ہی تیاریاں کر لی تھیں مگر بعد کے تجربے نے ثابت کیا کہ اس سے کہیں کم بوجھ ڈھونے سے یعنی اتنی بہت ساری چیزیں ساتھ لے جانے کے بغیر بھی کام چل سکتا تھا۔

مصر پہنچنے کے بعد سب سے پہلا مسئلہ وہاں قیام کا تھا۔ اس زمانے میں اہرام کے قرب وجوار میں پر تعیش یا آرام دہ ہوٹل بالکل نہیں تھے۔ اگر کسی کو وہاں ٹھہرنے کی ضرورت پیش آجاتی تو یا تو کسی قدیم مقبرے کو اپنا مسکن بنانا پڑتا تھا یا کسی قریبی عرب گاؤں میں بندوبست کرنا پڑتا تھا۔ مجھ سے پہلے ایک انگریز انجینئر ایک مقبرے میں قیام پذیر تھا اس نے وہاں دروازے اور شٹر بھی لگا رکھے تھے اسے دیکھ کر میرا دل خوش ہو گیا اور میں نے وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ مقبرے سے میری مراد اس کا نچلا قبر والا حصہ نہیں بلکہ اوپر والا حصہ ہے جہاں قدیم مصری اپنے آباؤ اجداد کی ضیافتیں کیا کرتے تھے۔ اس اوپر والے حصے میں تین کمرے تھے۔ کفایت شعار مصریوں نے ان کی دیواریں پتلے پتھروں سے بنائی تھیں اس لئے ایک دیوار میں دروازہ بنالیا تھا۔ یہ وسطی کمرہ تھا اس کی ایک دیوار کو کاٹ کر ایک کھڑکی بنائی گئی جو میری خواب گاہ میں کھلتی تھی اور دوسری کھڑکی ایک اسٹور روم میں نکلتی تھی۔ میں نے دو سال کا ایک بڑا عرصہ اسی جگہ گزارا اور جب کبھی مجھے ضرورتاً کسی بے حد ہوادار مکان یا سرد خیموں میں وقت گزارنا پڑتا تو جی چاہتا کہ بھاگ کر اسی مقبرے میں چلا جاؤں۔ سردیا گرم موسموں میں چٹانوں میں تراشے ہوئے کمرے سے زیادہ آرام دہ کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ موسم سرمایوں لگتا جیسے کمرے میں آگ جل رہی ہو اور سخت گرمیوں میں یہ کمرہ خاصا سرد رہتا تھا۔

مصر میں زیادہ تر وقت میں نے ملازموں کے بغیر ہی گزارا۔ ڈبوں میں محفوظ خوراک اور پیٹرول کے اسٹور کی سہولت نے ملازموں کی وقت بے وقت دخل اندازی سے مجھے محفوظ رکھا ہوا تھا۔ کام میں معاونت کے لئے میرے ساتھ ایک بے حد ذہین آدمی علی جیری تھا۔ اس کا ایک بھتیجا اور ایک خادم رات کے وقت چوکیداری کے لئے برابر والے مقبرے میں رہتے تھے۔ اس طرح تہذیب وتمدن کی پابندیوں سے آزاد مجھے پہلی بار زندگی گزارنے کا وقت ملا تھا جو خاصا دلچسپ اور پر لطف ثابت ہو رہا تھا۔

میرا ابتدائی مقصد اہرام سے متعلق ان تمام نظریات کا جائزہ لینا تھا جو ناکافی معلومات کے باوجود بھی موضوعِ بحث بنے ہوئے تھے۔ اگر یہ سارے یا ان میں چند ایک نظریات درست بھی تھے تو مختلف لوگوں کے ذہنوں میں بڑے مشکل سوالات گردش کر رہے تھے۔ پہلی بات تو یہی طے ہونا باقی تھی کہ یہ نظریات حقیقت سے کس قدر قریب ہیں اور اگر یہ حقائق سے بعید تھے تو پھر ان پر مذاکرات فضول ہی تھے۔ حقائق کی کسوٹی پر پورا اترنے کے بعد ان کی فوق الفطرت کا تعین کرنا

ضروری تھا۔ ان میں سب سے زیادہ اہم اور تقریباً تمام نظریات میں مرکزی اہمیت کا حامل سوال اہرام کی درست پیمائش سے متعلق تھا۔ اب تک کی درست ترین پیمائشوں میں بھی کئی کئی فٹ کا فرق تھا۔ بعض نظریات جنہیں درست سمجھا جاتا تھا ان میں اہرام کی تعمیرات سے متعلق اختلافات تھے مجموعی طور پر کہا جا سکتا تھا کہ ایک طرح سے ہم اہرام کی تعمیر، اس کی اندرونی اور بیرونی پیمائش سے بالکل ہی بے خبر تھے۔

اگر یہاں "درستگی" کے بارے میں ذرا سی وضاحت کر دی جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ ہم اکثر سنتے ہیں کہ فلاں چیز بالکل درست ہے۔ اب اگر میں کسی کاریگر سے پوچھوں کہ کیا اس کی تعمیرات کی پیمائش بالکل درست ہے تو وہ غصہ سے اپنا فٹ رول نچائے گا اور دعویٰ کرے گا کہ ناپ لو اور اگر آپ اس سے یہ پوچھیں کہ کیا اس کا فٹ رول درست ہے تو یقیناً وہ آپ کو مخبوط الحواس سمجھے گا۔ ایک مقصد کے لئے جو بات درست ہو سکتی ہے وہی دوسرے کے لئے نادرست بھی ٹھہر سکتی تھی۔ بچے ریت پر قلعے بناتے ہیں اور انہیں خاصے درست بناتے ہیں مگر اس کے آگے باغ بناتے وقت وہ گڑبڑا جاتے ہیں۔ ان کے باغ میں اور ایک ٹینس کورٹ کی سیدھ میں بڑا فرق ہو سکتا ہے۔ جب کسی مکان کی تعمیر کا نقشہ بنایا جاتا ہے تو خاص طور پر اس کے چورس اور سیدھ میں بڑا دھیان رکھا جاتا ہے اسی طرح سے ایک پر دوسری اینٹ چننے اور دیواروں کے جوڑ کی سیدھ میں مختلف احتیاط اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔

سنہری پانی سے آرائش وزیبائش: یہ مرد حنوط شدہ لاش کا ماسک ہے، جس میں عتاب کے تاج کی تصویر کندہ ہے، اسکے سر پر سورج رکھا ہوا ہے۔ یہ نقش بہاریہ لوسں سے نکالا گیا ہے، جس پر وقت نے کوئی اثر نہیں چھوڑا اور اس وقت بھی اس کے رنگ تازہ ہیں۔

اسی طرح کسی پل کے حصوں کو جوڑتے وقت درستگی کا زیادہ دھیان رکھا جاتا ہے اور ایک ایک فرلانگ کے فولادی حصوں کو ان کی جگہ پر فٹ بٹھانا اس سے زیادہ درستگی کا متقاضی ہے۔ ایک اور مثال دوربین بنانے والے کی ہے وہ اپنی دوربین کے دائروں اور شیشوں کی پالش میں جس درستگی کا اہتمام کرتا ہے ایک انجینئر اپنے کام میں اس درستگی کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ یوں سمجھ لیں کہ درستگی کی بھی اتنی ہی قسمیں ہیں جتنی کہ صفائی کی ہیں۔ ایک فٹ پاتھ کی صفائی اور کسی لیبارٹری میں کیمیائی اجزاء کی صفائی کے فرق کو آپ بھی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ چنانچہ "قطعی درستگی" کا وجود ہی ناپید ہے۔ کسی کام میں جب ہم درستگی کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا

ہے کہ اس میں جو نادرستگی (Inaccuracy) ہے وہ قطعی غیر اہم ہے۔ اگر ہم قدیم مصریوں کے درستگی کے معیار کو جانچنا چاہیں تو اس کام میں ہماری غلطیاں ان کی غلطیوں کے مقابلے میں قطعی غیر اہم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اگر وہ ایک انچ کے سوویں حصے تک چلے گئے ہیں تو ہمیں ان کے معیار کو جانچنے کے لئے ہزارویں حصے تک جانا پڑے گا۔ چنانچہ اس سلسلے میں جو سب سے پہلا کام تھا وہ یہ تھا کہ گیزا کی پہاڑی کی مکمل تثلیث بندی کر لی جائے۔ مثلثیات (Triangulation) (طویل فاصلے کی صحیح پیمائش کرنے یا کوئی مخصوص مقام یا جگہ معلوم کرنے کا طریقہ ہے جس میں طے کردہ لمبائی کے قاعدے پر مثلثوں کا سلسلہ بنا کر علم مثلثیات کی رو سے نامعلوم فاصلے یا جگہ کا تعین کیا جاتا ہے) اس میں وہ مقامات بھی شامل تھے جن میں تینوں اہرام، منادر اور ان سے متعلقہ دیواریں بھی آجاتی تھیں۔ اس کام کے لئے میں نے اپنا بہترین اور جدید ترین زاویہ پیما استعمال کیا جس میں زاویئے کی سیکنڈز تک پڑھی جا سکتی تھیں۔ میں نے یہ کام اتنی بار اور اس عرق ریزی سے کیا کہ اگر ایک مقام کی پیمائش پر مجھے پورا دن بھی لگ جاتا تو بھی دریغ نہ کرتا اور پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد ہی کام ختم ہونے کا اعلان کرتا۔

میں نے ان مشاہدات اور پیمائشوں کو کئی کئی بار چیک کیا ضرورت پڑنے پر گھٹایا بڑھایا اور پوری کوشش کی کہ کسی بھی مقام کی پیمائش میں ایک چوتھائی انچ کا فرق بھی نہ رہنے پائے۔ میں نے پیمائش کے لئے یہ نقاط اپنی مرضی سے پہاڑی کے مناسب مقامات پر لگائے تھے۔ اس طرح میں نے اس علاقے کی بیرونی پیمائش کا کام مکمل کر لیا۔

دوسرے مرحلے کے لئے میں نے پروفیسر ماس پیرو (Maspero) سے قدیم اہرام کے تعمیراتی مقامات اور ان کی بیرونی دیوار کو تلاش کرنے کی اجازت لے لی۔ بعض مقامات تو بڑی آسانی سے مل گئے مگر کئی ایک کے لئے ہمیں سخت محنت کرنی پڑی اور خطرات بھی مول لینے پڑے۔

حفاظتی دیوار کے ان حصول تک پہنچنا جو ابھی تک عظیم اہرام کے ہر جانب ایستادہ تھے جان جوکھوں کا کام تھا۔ ان حصوں کے دونوں جانب بارہ سے بیس فٹ کی گہرائی تک ٹوٹے پھوٹے پتھروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ہم کسی جانب بھی گڑھا کھودتے وہ پتھر اس میں لڑھک آتا اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم ذرا چوڑائی میں کھدائی کریں پھر اس گڑھے کو بڑھاتے ہوئے دیوار کے ڈھیلے ڈھالے بلاکوں تک پہنچ جائیں۔

آخر ہم تینوں جانب کی دیواروں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جو ابھی تک گویا کہ نادریافت شدہ تھیں۔ بس شمالی جانب ہمیں چالیس سال قبل کرنل وائس کا کھدائی کیا ہوا نشان ملا جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ اس جگہ تک پہنچ چکا تھا۔ یہ گڑھے بڑے نازک مقامات تھے۔ عربوں نے یہاں کام کرنے سے بالکل ہی انکار کر دیا تھا چنانچہ مجھے اس کام کے لئے چند نیگرو ملازم رکھنے پڑے۔ ہم بڑی احتیاط سے چوٹ لگاتے تھے کیونکہ خطرہ تھا کہ ڈھیلے بلاک نکل کر کہیں ہمارے سروں پر نہ آپڑیں۔ ایک دفعہ تو میں گویا پتھروں میں دفن ہی ہو گیا تھا کیونکہ جب میں گڑھے سے باہر آیا تو اس وقت کئی ٹن وزنی پتھر

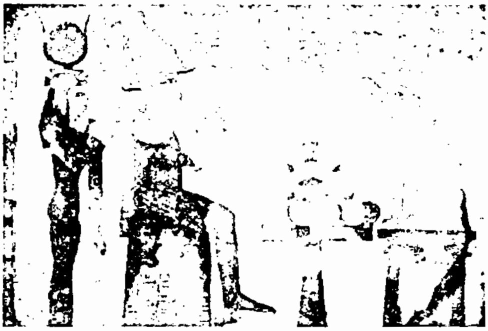

دیوتاؤں کی حاضری: بہاریہ اوسس (Bahariya Oasis) کے اہرام میں مدفون خانے کی دیوار پر نقش کی گئی اس پینٹنگ میں دیوتا اوسرس کو بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے اور اس کے سامنے حنوط کرنے والے دیوتا انوبس بیٹھے ہوئے ہیں جسے موت کا دیوتا بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے تدفینی رسوم ایجاد کیں اور اوسرس کی لاش کو حنوط کرکے ممی بنایا تاکہ بیرونی ہوا اور فضا سے اس کا رابطہ نہ ہو سکے اور اس کی نعش خراب نہ ہو یوں ممی بنانے کا طریقہ ایجاد ہوا۔

لڑھک کر اس میں آگرے تھے۔ تیسرے اہرام کی مشکلات ذرا مختلف نوعیت کی تھیں۔ اس اہرام کے ڈھیلے ڈھالے بلاک ریت کے ٹیلے پر جمے ہوئے تھے۔ چنانچہ جیسے ہی ہم نے ریت کو کھودنا شروع کیا بلاک پھسل کر ہمارے کھودے ہوئے گڑھے میں آگرے۔ مگر یہاں ہم نے ایک ترکیب لڑائی۔ کھدائی کے ساتھ ساتھ ہم گڑھے کی دیوار میں پتھر جماتے جاتے اور یوں اوپر کے پتھر لڑھکنے بند ہو گئے اور ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور تب ہمیں پتا چلا کہ تیسرے اہرام کی حفاظتی دیوار کبھی مکمل نہیں ہو سکی تھی۔

تیسرے اہرام کا مندر تکمیلِ فن کا بہترین نمونہ تھا۔ کمرے کے گرد احاطہ بھی بڑی درست حالت میں تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں قدیم مصری اپنے آنجہانی بادشاہوں کی تدفینی رسوم ادا کیا کرتے تھے۔ اہرام کی چوٹی سے اس کا نظارہ خاصا دلکش تھا۔ راہداری کے آخر میں چند درخت کھڑے تھے اور دائیں جانب ایک پہاڑی تھی جس کے قریب سے ایک اور راستہ میدان کی طرف نکل جاتا تھا۔

اہرام کے اندر کئی پیمائشیں پہلے سے ہی کی ہوئی تھیں جس سے اس کی تعمیر میں چند خامیوں اور غلطیوں کی نشاندہی ہوتی تھی۔ اس لئے یہاں ذرا زیادہ عمیق اور جدید انداز کی پیمائشوں کی ضرورت تھی۔ سو اس کے بجائے کہ دیوار سے دیوار تک ناپ لوں اور معمولی خامیوں کو نظر انداز کر دوں، میں نے اوپر سے نیچے کی طرف ناپنے کے لئے شاقول اور افقی ناپ کے لئے سطحی آلہ استعمال کیا۔ اس طرح مختلف مقامات پر شاقول اور لیولنگ آلے کی مدد سے میں نہ صرف ہر سطح سے کمرے کا حجم یا وسعت معلوم کرنے کے قابل ہو گیا بلکہ یہ بھی جان گیا کہ کس جگہ تعمیراتی خامیاں تھیں چاہے وہ بہت چھوٹی ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی انداز میں ٹھوس یعنی سنگی تابوت جیسی اشیاء کی پیمائش کرنے میں بھی مجھے بڑی مدد ملی۔ ان آلات کی مدد سے ہمیں یہ فائدہ بھی ہوا کہ دنوں کا کام ہم نے گھنٹوں میں کر لیا۔ ایک ڈوری، اسے چپکانے کے لئے موم اور سیدھی پیمائش کے لئے سادہ اسکیل۔ بس یہی میرے آلات تھے۔ میری اس کاوش نے مصر کے عظیم و قدیم معماروں کے کام میں چند حیرت انگیز بے پروائیوں اور بے ڈھنگے پن کو اجاگر کر دیا۔ شی اوپس کے اس عظیم اہرام کی تعمیر بلاشبہ مہارت کا کمال

تھا اس کی خامیاں بس ایسی ہی تھیں کہ انہیں انگوٹھا رکھ کر بھی چھپایا جا سکتا تھا۔ اس کے ایک ایک فرلانگ چورس میں بھی بلا کی درستگی تھی۔ اس کی بیرونی دیواروں میں بھی اسی درجے کی مہارت سے کام لیا گیا تھا۔ اس کے سامنے کا حصہ اس قدر سیدھا اور چورس تھا کہ حالانکہ بلاکوں کے جوڑ دو دو گز سے بھی زیادہ لمبے تھے مگر ان کے جوڑوں میں جو مسالا استعمال کیا گیا تھا وہ انسانی انگوٹھے کے ناخن سے بھی پتلا نظر آتا تھا۔ اہرام کے اندرونی حصے بھی اسی نفاستِ تعمیر کے مظہر تھے۔ داخلی حصوں کے جوڑ بڑی عرق ریزی کے بعد ہی تلاش کئے جا سکتے تھے۔ ملکہ کے دیوان (Queen's Cham-ber) کی دیواروں پر سے صدیوں کا جما نمک کھرچا گیا تو اس کے بلاکوں کے جوڑ بھی کاغذ کی شیٹ سے زیادہ موٹے نہیں ملے۔ یہی عالم شاہی دیوان میں استعمال کئے گئے بلاکوں کے جوڑ کا تھا کہ ایک فرلانگ جتنی لمبائی کے بلاکوں میں بھی تنکے جتنا خلاء نظر نہیں آتا تھا۔

اس قدر عالی شان کام کے ساتھ ساتھ بڑی عجیب و غریب غلطیاں موجود تھیں۔ دیوان شاہی کی وسیع دیوار کو بڑی نفاست سے ہموار کرنے کے بعد اس کے کم چوڑے حصے میں خامی موجود تھی حالانکہ یہ خامی سوداں حصہ ہی تھی لیکن اگر افقی سمت سے اس کا اچھی طرح جائزہ لیا جاتا تو یہ خامی بھی دور کی جا سکتی تھی۔ اسی طرح گرینڈ گیلری کے جوڑوں کو بڑی نفاست سے ملانے کے باوجود بھی اس کی دیواروں کی سطح کسی قدر کھردری رہ گئی تھی۔ ڈیزائن میں کسی حد تک تبدیلی آگئی تھی اور گیلری میں ایک جانب ایک چھجا سا نکلا رہ گیا تھا۔ اینٹی چیمبر کے پتھروں پر بھی پلاستر کا آخری ہاتھ نہیں مارا گیا تھا۔ پوری تعمیر میں سب سے زیادہ خرابی سنگی تابوت میں تھی جو اسی دور کے دیگر تابوتوں کے مقابلے میں بڑا بھدا نظر آرہا تھا۔ اس عجیب خامی کی وجہ یہی نظر آتی تھی کہ اصل معمار جو اپنے فن کا استاد کامل تھا تابوت کے آدھے بن جانے کے بعد اس کی جانب سے بے پرواہ ہو گیا تھا اور اپنے کارندوں پر نگرانی کی نظر نہیں رکھ سکا تھا جو اس کا خاصہ تھی۔ اس کی ذاتی توجہ کی غیر موجودگی میں اس کے تربیت یافتہ کارندے باقی تعمیر میں وہ پہلے جیسا معیار برقرار نہیں رکھ سکے تھے۔ چنانچہ اساس اور اس کے گرد کا کام، ملکہ کے دیوان کی تعمیر، دیوان شاہی کی سنگی ترتیب ان سب پر اصل معمار کی جھلک نظر تھی یہ سب اس کی نگرانی میں تعمیری مراحل سے گزرے تھے مگر جیسے ہی اس کی نظر چوکی اس کے شاگردوں کی خامیاں ابھر کر سامنے آگئیں۔

محض عجلت ہی ان سنگین غلطیوں کی ذمہ دار نہیں ہے جیسے کہ دیوان شاہی میں لیول کی خامی جو کوئی بھی ماہر محض پانچ منٹ کے مشاہدے کے بعد سمجھ سکتا تھا اور دور کر سکتا تھا۔ اس سے یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس قدر بہترین اور باکمال ہنر مند اس دور میں صرف چند ایک ہی تھے جن کے محض چھونے سے ہی یہ فن نقطۂ کمال کو پہنچ جاتا تھا۔ اس دور کی دوسری تعمیرات میں جو بے ڈھنگا پن یا خامیاں نظر آتی ہیں وہ ہمارے اس نظریئے کی تصدیق کرتی ہیں۔ نہ ہی اس زمانے میں ٹریڈ یونین کا کوئی ایسا ضابطہ تھا کہ اپنے ساتھیوں کے کاموں کی خامیاں دور کی جائیں جیسا کہ آج کے دور میں بھی تقریباً ہر میدان اور کاروبار میں یہ بات ناپید ہے۔

دوسرا اہرام خافرا (Khafra) نے بنوایا تھا اس کا نام سب سے پہلے ایک سفید سل کے چھوٹے سے ٹکڑے پر کھدا ہوا پایا گیا جو مجھے مندر میں ملا تھا۔ خافرا کا کام شی اوپس کے کام سے کم تر درجے کا تھا۔ اس اہرام کی لمبائی میں شی اوپس کے مقابلے میں دو گنی خامیاں تھیں یہی حال اس کے زاویوں اور دیگر تعمیرات کا تھا۔ لیکن اس میں موجود سنگی تابوت دوسروں سے کہیں بہتر تھا۔ اس میں خامیاں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں جس سے پتا چلتا تھا کہ اس کی ساخت میں زیادہ قابل اور تجربہ کار ہاتھوں کا دخل تھا۔ تیسرا اہرام مینکورا (Menkaura) کا تھا جو دوسرے اہرام سے بھی گیا گزرا تھا۔ اس کی بیرونی اور اندرونی دونوں تعمیرات خامیوں سے پُر اور کم تر درجے کی تھیں۔ اس کے علاوہ اس کی ساخت میں عجیب انداز میں تبدیلی کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی یعنی بنیادی طور پر یہ ایک چھوٹا اہرام تھا جسے انتہائی بے ڈھنگے پن سے بڑا کرنے کی سعی کی گئی تھی۔ اس کی داخلی راہ داری ویران پڑی تھی، کمرے کو گہرا کر دیا گیا تھا۔ پھر ایک ڈھلان راستہ تھا اور پہلے کمرے کے فرش کی سطح سے بھی زیادہ نیچے ایک اور کمرہ بنایا گیا تھا جس کے گرد گرینائٹ لگے ہوئے تھے۔

کچھ اور بھی باتیں تھیں جو ان اہراموں میں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ اہراموں کی راہ داریوں میں عام طور پر پتھروں کے پلگ لگا کر رکاوٹیں کھڑی کی گئی تھیں جو ان دونوں اہراموں میں مفقود تھیں ان کے داخلی دروازوں کو ٹھوس تعمیر سے بند کیا گیا تھا۔ جب کہ شی اوپس کے عظیم اہرام کے دروازے پر پتھر کا فلیپ ڈور تھا۔

ان اہراموں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ ہر بادشاہ اپنے اپنے اہرام میں زندگی کے دوران میں اضافہ کرتا رہتا تھا یہاں تک کہ اس کی موت واقع ہو جاتی تھی۔ لیکن اس بات کی کوئی ٹھوس شہادت نہیں مل سکی ہے بلکہ یوں لگتا ہے جیسے اہرام کا پورا نقشہ پہلے بنا لیا جاتا تھا اور پھر بہ یک وقت تعمیر شروع کر دی جاتی تھی۔ ان میں رکھے گئے تابوت بھی بادشاہ کی موت کے بعد بادشاہ کی لاش اس میں محفوظ کر کے بعد میں رکھے جاتے تھے۔ مگر دوسرے کئی اہراموں میں اتنے بڑے بڑے تابوت ملے ہیں کہ راہ داریوں کی تنگی کی وجہ سے انہیں باہر سے نہیں لایا جا سکتا تھا چنانچہ غالب خیال یہ ہے کہ انہیں اہرام کے اندر ہی پتھروں کو تراش کر بنایا گیا تھا۔

اہراموں کے جائزے کے بعد عظیم اہرام

ٹکٹکی باندھے حیرت کی تصویر بنا ہوا یہ قدیم ماسک مصر کے اہرام بیمار یہ لوسس سے ملا۔ جب نعش کو حنوط کیا جاتا تو بعد ازاں اسی چہرے کا چینٹ کیا ہوا ماسک لایا جاتا جس پر سونے کا پانی بھی چڑھایا جاتا۔

کے مندر کا ملبہ صاف کیا گیا اور پھر خافرا کے اہرام کی مکمل طور پر پیائش اور منصوبہ بندی کی گئی لیکن شاید اس موضوع کا دلچسپ ترین پہلو یہ ہے کہ یہ کام کیسے کیا گیا؟۔ دوسرے اہرام کے عقب میں کارکنوں کے لئے وسیع بیرکس کا سلسلہ موجود ہے جس میں بہ یک وقت چار ہزار افراد کے لئے رہائشی گنجائش موجود تھی اور شاید اہرام کی تعمیر کے لئے اتنی ہی تعداد میں تربیت یافتہ افراد یعنی مستریوں کی ضرورت بھی تھی۔ ان کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں ایسے مزدوروں کی بھی ضرورت تھی جو پتھر کی بھاری سلوں کو لانے لے جانے کا کام کرتے۔ یہ کام شاید سیلاب کے دوران میں کیا گیا تھا جب زیادہ تر لوگ فارغ تھے اور آبی چھکڑوں کے ذریعے نقل و حمل آسان تھا۔ ہیروڈوٹس کے بیان سے بھی یہ بات ظاہر ہوتی ہے وہ کہتا ہے کہ مزدوروں کی یہ چوکیاں ہر تین ماہ بعد بدل جایا کرتی تھیں اور اس طرح کر کے اس عظیم اہرام کی تعمیر عملی طور پر ممکن تھی۔ مزدوروں کے ساتھ آلات کی بھی ضرورت تھی۔ آلات سے متعلق سوال کا جواب کسی قدر شہادتوں کی روشنی میں حاصل کر لیا گیا ہے اور اس جواب سے موجودہ دور کے انجینئر بھی کسی حد تک متفق ہیں۔ میں نے کئی جگہ یہ دیکھا ہے کہ سخت قسم کے پتھر مثلاً بسالٹ، گرینائٹ اور ڈایورائٹ کو لکڑی کے لٹھوں کی طرح چیرا گیا تھا اور اس کام میں استعمال ہونے والی آری کوئی بلیڈ یا تار نہیں تھی جو سخت پاؤڈر کے ساتھ استعمال کی گئی ہو بلکہ حقیقت میں یہ آری ایسی تھی جس میں کٹائی کے مخصوص مقامات پر ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ یہ آریاں کم از کم دس دس فٹ لمبی تھیں جیسا کہ سنگی تابوت کی لمبائی میں کٹائی سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایک اور عام آلہ یا اوزار جو اس کام میں استعمال کیا گیا تھا میں نے ایسے ہی ایک پتھر کے ڈرل کئے ہوئے سوراخ میں سے ڈرل کا ٹوٹا ہوا حصہ نکالا تھا جو چکردار تھا۔ یہ سرخ گرینائٹ تھا جس کی وجہ سے آلے میں اچھال یا لچک پیدا نہیں ہوتی تھی۔ کرسٹل، کوارٹز یا فیلسپار کو بھی اسی انداز میں بڑی صفائی سے کاٹا جاتا ہے۔

ایک انجینئر نے جو ڈائمنڈ ڈرل کے کام سے واقف تھا مجھے بتایا۔ ”یہ بڑا قابل فخر کام تھا جو انہوں نے کیا جدید ڈرل کا کام تو قدیم مصری کام کے مقابلے میں ایسا ہی ہے جیسے سورج کے سامنے موم بتی روشن کرنا۔ بغیر کسی نشان یا خراش کے اس قدر صفائی سے پتھروں کو کاٹنا اعلیٰ درجے کی مہارت ہے جو اس جدید دور میں بھی قطعی ناپید ہے۔ لیتھ کا کام اس قدر صفائی سے کیا گیا ہے کہ بس ان کی مہارت پر حیرت ہی ہوتی ہے“۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ازمنۂ قدیم کے مصری باشندے مہارت اور قابلیت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

☆

آفاقی فارمولے یا اتفاقات

سطح مرتفع غزہ یا گیزا میں ایستادہ پُر شکوہ و پُر پیچ اہرام قدیم زمانے سے ہی سیاحوں کے دلوں کو مسخر کرتے رہے ہیں۔ اہرام کے معماروں نے پہلے غزہ کی سطح مرتفع کے ایک ایک انچ کو ہموار کیا تھا پھر اپنے کمالِ فن کو سینۂ گیتی پر ثبت کیا تھا۔ یہ سطح مرتفع قاہرہ سے چند میل دور، دریائے نیل سے ایک سو تیس فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اہرام سے دور صحرائے لیبیا کی مغربی پٹی سنہری جھالر کی طرح چمکتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ عظیم اہرام جسے عرفِ عام میں شی اوپس کا اہرام کہا جاتا ہے پتھر کے دو سو ایک، ایک کے بعد دوسرے بلند ہوتے ہوئے متوازی زینوں پر مشتمل ایک چالیس منزلہ بلند عمارت ہے۔ بنیادی طور پر اس کی ساخت اور تکمیل میں سفید چونے کے پتھر کی وسیع بیرونی دیوار یا غلاف بھی شامل ہے۔ کئی لحاظ سے یہ عظیم اہرام قدیم انجینئرنگ کے ایک بے مثال شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی چورس بنیاد ۴/۱۔۱۳ ایکڑ رقبے پر محیط ہے۔ اس کی چاروں بنیادی سمتوں میں سے ہر ایک کی لمبائی ۷۶۰ فٹ ۱۱ انچ ہے جو ڈھائی بلاک کے برابر ہے۔ اس طرح اگر آپ اہرام کی بنیاد کا چکر لگائیں تو تقریباً ۳/۲ میل کا فاصلہ طے کر لیں گے۔

اس اہرام میں نوے ملین (۹ کروڑ) مکعب فٹ پتھر استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی تعمیر میں لگائے گئے کل پتھروں کا اندازہ تیئس لاکھ (۲۳۰۰۰۰۰) کے قریب لگایا گیا ہے جن میں سے ہر پتھر کا وزن دو سے تین ٹن تک کا ہے۔ گویا کہ اہرام میں استعمال شدہ پتھروں سے سالٹ لیک سٹی اوٹا (Salt Lake City Utah) سے نیویارک شہر تک ایک فٹ موٹی اور اٹھارہ فٹ چوڑی شاہراہ بنائی جا سکتی ہے۔ جیومیٹری کے حساب سے یہ عظیم اہرام صحیح معنوں میں ایک ایسا اہرام ہے جس کی بنیاد ایک مکمل مربع ہے اور اس کی چاروں اطراف مساوی مثلثوں کی شکل کی ہیں جو بنیاد سے اوپر اور اندر کی طرف اٹھی ہوئی ہیں۔ اس کے اطراف کی ڈھلان ۱۰ سے ۹ کے تناسب سے ۵ ڈگری ۵۱/۱۴۴۳ء پر رکھی ہوئی ہے۔ بلندی پر جا کر یہ اطراف ایک ایسے نقطے پر ملتی ہیں جو بنیاد کے عین مرکز کی سیدھ میں ہے۔ اس عظیم اہرام کا ایک اور امتیاز اس کی بنیاد کے ساکٹ ہیں یعنی ایسے سوراخوں کا سلسلہ جو بنیاد کی چٹان میں اطراف کے بنیادی پتھروں کو تھامے ہوئے ہیں ان ساکٹوں کی مدد سے ہم اس عمارت کی اصل ساخت کا ٹھیک ٹھیک محیط معلوم کر سکتے ہیں۔

اس عظیم اہرام کا ایک قابلِ ذکر پہلو اس کی حیرت انگیز سمت بندی (Orientation) ہے۔ بنیاد کو ٹھیک شمال جنوب مشرق اور مغرب کی سمت میں اس طرح رکھا گیا ہے کہ پانچ سیکنڈ کی غلطی

بھی دریافت نہیں کی جا سکی۔ یہ دنیا کی انتہائی درست سمتی عمارت ہے۔ "میرا خیال ہے کہ اہرام کی تعمیر کے وقت اس کی سمتوں میں انتہائی احتیاط سے کام لیا گیا تھا" ایک ماہر مصریات نے بتایا۔ "یہ پانچ سیکنڈ کی غلطی بھی اگر ہے تو محض زلزلے یا زمینی خول کے کھسکنے یا ایسی ہی کسی اور وجہ سے رہ گئی ہے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اہرام کے معماروں کے پاس ہماری طرح جدید ترین سمت پیما آلات بھی نہیں تھے چنانچہ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ان کے پاس سمت پیمائی کا جو علم تھا وہ اب داستانِ پارینہ بن چکا ہے"۔

اہرام کے معمار شمسی سال کی طوالت سے بھی واقف تھے اور یہ طوالت ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۸ منٹ اور ۴۹،۷ سیکنڈ تھی۔ اعشاری صورت میں اسے ۳۶۵،۲۴۲۴۲ بھی لکھا جا سکتا ہے۔ "وہ معمار جس کی نگرانی میں اس عظیم اہرام کی تعمیر ہوئی اس عدد سے بڑی اچھی طرح واقف تھا۔" ڈاکٹر گنتھر روزن برگ رقم طراز ہے "بنیاد کی چاروں سمتوں میں سے ہر ایک ۹۱۲۱،۰۵ اہرامی انچ لمبی ہے۔ سر آئزک نیوٹن نے ۲۵ کا عدد دکھا جو مقدس ہیبر یو کیوبٹ (ہاتھ کی لمبائی یا ذراع) میں اہرامی انچوں کے مساوی سمجھا جاتا ہے۔ اس نے بنیادی سمت کی لمبائی کو ۲۵ سے تقسیم کیا تو جواب ۳۶۵،۲۴۲۴۲ آیا جو ٹھیک شمسی سال کے برابر ہے۔

عظیم اہرام سے متعلق ایک اور دلچسپ حقیقت زمین کے کل خشکی کے رقبے کے بارے میں ہے۔ "اس عظیم اہرام کی جگہ (Site) بھی بے مثال ہے۔" ڈاکٹر روزن برگ نے بتایا "پوری زمین پر اس اہرام کے علاوہ کوئی ایسا مقام نہیں ہے جس پر سے خط نصف النہار شمالاً جنوباً اس طرح گزرتا ہو کہ خشکی کا رقبہ سمندری رقبے سے بڑا ہو اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ شرقاً غرباً گزرنے والے متوازی خط کا بھی یہی عالم ہے"۔

ڈاکٹر روزن برگ نے گیزا میں واقع اس عظیم اہرام سے متعلق کئی اور ایسے پہلوؤں کی بھی نشاندہی کی ہے جو سائنسی حقائق پر مبنی ہیں۔ "اہرام کے ابتدائی دور کے محقق ہی اس اعزاز کے پوری طرح مستحق ہیں" روزن برگ نے کہا۔ "مسز فلنڈرس پیٹری، ڈیوڈسن اور پیازی اسمتھ جیسے لوگوں کو بلا مبالغہ یہ کریڈٹ جاتا ہے جن کی کاوشوں کی وجہ سے ہم اس عظیم اہرام کے بارے میں اتنا کچھ جان سکے ہیں۔" ان کی ان تھک کاوشوں کا ماحصل درج ذیل ہے۔

زمین کا قطبی قطر

زمین سے سورج کا فاصلہ ۹۱،۸۳۷،۴۸۴ میل ہے۔

شی اوپس کے عظیم اہرام کی بلندی ۵۸۱۳،۰۱ اہرامی انچ ہے۔

اہرام کی بلندی کا ۲ سے حاصل ضرب ۱۱۶۹۶،۰۲ اہرامی انچ ہے۔

۱۱۶۹۶،۰۲ سے ۹۱،۸۳۷،۴۸۴ کا حاصل تقسیم ہے ۷۹۰۹،۷ جو میلوں میں زمین کا ٹھیک ٹھیک قطبی قطر ہے۔

زمین کاوزن

زمین کاوزن ۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۳ ۷ ۲،۵ اہرامی ٹن ہے۔
شی اوپس کے عظیم اہرام کاوزن ۴ ۳ ۸، ۳ ۷ ۲ ۵ اہرامی ٹن ہے۔
اہرام کے وزن سے زمین کے وزن کو تقسیم کرنے پر پتا چلتا ہے کہ یہ عمارت زمین کے وزن کا دس ہزار کھرب واں حصہ ہے۔

شمسی سال کی طوالت

تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ شمسی سال کی طوالت کا عدد اس عظیم اہرام کی تعمیر میں چھ طریقوں سے پیمائش کے چار مختلف انداز میں ظاہر کیا گیا ہے۔
۔ ملکہ کے دیوان (Queen's Chamber) کی جنوبی اور شمالی دیواروں کی بلندی ٹھیک ۶۲ء ۱۸۲ اہرامی انچ ہے۔ ان کو آپس میں جمع کیا جائے تو ۲۴ء ۳۶۵ بنتا ہے جو ایک انچ مساوی یک دن لینے سے شمسی سال کی لمبائی بنتی ہے۔
ا۔ اہرام کے اینٹی چیمبر (ذیلی ہال) کو پائی Pi سے ضرب کیا گیا۔ اس عدد کو پھر Pi پائی (۱۴۱۵۹ء ۳) سے ضرب کیا گیا تو شمسی سال کی طوالت کا عدد حاصل ہوتا ہے۔ اس میں وہی پیمانہ یعنی ایک انچ برابر ایک دن کے ہے۔
۳۔ عمارت کے ٹھیک مرکز سے بیرونی سطح کے پینتیسویں (35th) لیول تک کی افقی پیائش کی گئی تو ۴۲ء ۳۶۵۲ اہرامی انچ کا عدد ملا اگر دس انچ برابر ایک دن کے سمجھ لیا جائے تو شمسی سال کی لمبائی نکل آتی ہے۔
۴۔ عظیم اہرام کی بنیاد کے محیط کی پیائش کی گئی تو پتا چلا کہ کل رقبہ ۲۰ء ۳۶۵۲۴ اہرامی انچ ہے (۴x۰۵ء ۹۱۳۱) اگر ۱۰۰ اہرامی انچ کو ایک دن کے برابر تسلیم کیا جائے تو ۱۰۰ سے ۲۰ء ۳۶۵۲۴ ہرامی انچ کا عدد ملتا ہے۔ عمارت کی کل بلندی ۰۱ء ۵۸۱۳ ہے جو دائرے کے نصف قطر کے برابر ہے۔ ریاضی کے حساب سے دائرے کا محیط معلوم کرنے کے لئے ۰۲ء ۱۱۶۲۶ حاصل ہوگا اس آخری عدد کو Pi (۱۴۱۵۹ء ۳) سے ضرب کریں تو ۲۰ء ۳۶۵۲۴ حاصل ہوتا ہے جب اس عدد کو ۱۰۰ سے تقسیم کریں گے تو ایک بار پھر شمسی سال کی طوالت کا عدد مل جائے گا جب کہ پیمانہ ۱۰۰ انچ برابر یک دن ہوگا۔

اعتدالِ شب وروز کی تقدیم

ہمارے نظامِ شمسی کے اعتدالِ شب وروز کی تقدیم کے حساب سے ہمارا سیارہ زمین، انتہائی

ضخیم ستارے سورج کے گرد جو خوشۂ پروین کا ایک حصہ ہے (خوشۂ پروین صورت ثور میں ستاروں کا ایک نمایاں گروہ یا گچھا ہے جسے عموماً سات کہا جاتا ہے) ایک چکر ۲۵۸۲۷ء۵ سالوں میں پورا کرتا ہے۔ ابتدائی دور کے ماہرین اہرامیات کا خیال ہے کہ اس عظیم اہرام کے معماران اعداد سے پوری طرح واقف تھے۔ یہ عدد پتھروں کے اس حیرت انگیز شاہکار میں ریاضی کے درست ترین حساب سے چار مقامات پر ظاہر کیا گیا ہے۔

وہ مقامات مندرجہ ذیل ہیں: (ذیل میں ان مقامات کی نشان دہی کی گئی ہے)

ا۔ اہرام کی چورس بنیاد کے دونوں وتروں کا مجموعہ ۱۲۹۱۳ء۷۵ اہرامی انچ ہے۔ اس عدد کو ۲ سے ضرب کرنے سے ۲۵۸۲۷ء۵ حاصل ہوتا ہے۔ اگر ایک انچ برابر ایک سال کے لیا جائے تو یہ عدد ٹھیک اعتدال شب وروز کی تقدیم کے سالوں کے برابر ہے یعنی زمین اتنے برسوں میں سورج کے گرد اپنا چکر مکمل کرتی ہے۔

۲۔ ایوان شاہی (King's Chamber) کے فرش کی سطح اہرام کی متوازی سنگی قطاروں میں سے پچاسویں سطح کے برابر ہے۔ اگر اس سطح سے اہرام کی بیرونی پیائش کی جائے تو ایک بار پھر ہمیں وہی عدد یعنی ۲۵۸۲۷ء۵ اہرامی انچ ملتا ہے۔

۳۔ اہرام کی عظیم گیلری (Grand Gallery) کی پیائش کرنے سے ۸۲۱ء۳۳ اہرامی انچ حاصل ہوتا ہے اس عدد کو اگر Pi (۳ء۱۴۱۵۹) سے ضرب کیا جائے تو حاصل ضرب تقریباً ۲۵۸۲۷ء۵ ہی حاصل ہوتا ہے۔

۴۔ اگر ہم دیوان شاہی کے وسط میں کھڑے ہو کر اس کے فرش کی سطح سے اہرام کی بلندی کی پیائش کریں تو ۴۱۱۰ء۵ اہرامی انچ حاصل ہوتی ہے۔ اگر اس عدد کو دو مرتبہ Pi سے ضرب کیا جائے تو حاصل ضرب ۲۵۸۲۷ء۵ ملتا ہے۔

مکعب کی دوچندی (Doubling the Cube)

ایک اور ریاضی کا فارمولا مکعب کی دوچندی سے متعلق ہے۔ ملکہ کے ایوان کا مکعب رقبہ ٹھیک ایک کروڑ (۱۰،۰۰۰،۰۰۰) مکعب اہرامی انچ ہے اور ایوان شاہی کا مکعب رقبہ ٹھیک اس سے دگنا یعنی دو کروڑ (۲۰،۰۰۰،۰۰۰) مکعب اہرامی انچ ہے۔ اس طرح ایوان شاہی چھوٹے ایوان سے رقبے میں مکمل طور پر دوچند ہے۔

معماروں نے مکعب کی یہ دوچندی اہرام میں اور کئی مقامات پر بھی دیکھی ہے۔ اس کا تعلق ایوانِ شاہی میں رکھے سنگی تابوت سے ہے جس کی بیرونی پیائش اندرونی پیائش سے ٹھیک دوچند ہے۔

زمین سے سورج کا فاصلہ

جدید سائنس نے ہمارے سیارے سے سورج تک فاصلے کی پیائش اکیانوے (۹۱) اور ساڑھے

قدیم مصر کے باشندے مُردے کو حنوط (Mum-my) کر کے اسے مصنوعی طور پر محفوظ کیا کرتے تھے اس سلسلے میں وہ نعش سے تمام آنتیں دل جگر رگیں اور دماغ نکال کر جسم میں ایک قسم کا سوڈا نیٹرون لگاتے تھے۔ بعد ازاں پوری لاش کو لینن کے کپڑے سے لپیٹ دیا جاتا تھا۔

کیانوے (۲/۱-۹۱) ملین میل کے قریب بتائی ہے۔ سائنس دانوں کے یک اور گروپ کا دعویٰ ہے کہ یہ فاصلہ پہلے بتائے ہوئے فاصلے سے مزید یک ملین میل کے لگ بھگ یعنی ساڑھے بانوے (۲/۱-۹۲) سے رانوے (۹۳) ملین میل ہے۔ گویا ابھی تک خلائی دور کے ہمارے سائنس داں اس فاصلے کی بحث میں الجھے ہوئے ہیں جب کہ اس عظیم ہرام میں اس فاصلے کی پیائش بھی موجود ہے۔ سر فلنڈرس پیٹری کے نساب سے یہ فاصلہ دراصل ۹۱،۸۳۷،۴۸۴ میل ہے۔

پیٹری اس عدد تک کیسے پہنچا، اس کا احوال درج ذیل ہے۔

بنیاد کے وتروں کی بلندی کے نصف اور چوڑی عمارت کی بلندی میں ۱ اور ۹ کا تناسب ہے چنانچہ بلندی کو ۱۰ سے ضرب دے کر ۹ کی قوت پر انے سے صورتِ حال یہ بنتی ہے۔ اہرام کی بلندی ۵۸۱۳ء۰۱ کو ۱،۰۰۰،۰۰۰،۰۰ سے ضرب دیا تو حاصل ضرب ہوا ۵۸۱۳،۰۱۰،۰۰۰،۰۰ اہرامی انچ۔ اس کو برطانوی انچوں میں تبدیل کیا یا تو جواب آیا ۵،۸۱۸،۸۲۳،۰۰۰،۰۰۰ برطانوی انچ پھر اسے برطانوی ٹ میں بدلا گیا تو ۴۸۴،۹۰۱،۹۱۷ ۵۰۰ برطانوی فٹ ملے اور جب اس مدد کو برطانوی میلوں میں تبدیل کیا گیا تو جواب ملا ۹۱،۸۳۷،۴۸۴ میل جو سر پیٹری کے مطابق ہماری زمین سے سورج تک کا فاصلہ ہے۔ بشتر ماہر اہرامیات کو یقین ہے کہ زمین سے سورج کا ٹھیک فاصلہ یہی ہے۔

دائرے کی مربعیت
(Squaring the Cicle)

اہرام کی عمارت میں کم از کم بارہ مقامات ایسے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اس کے معمار دائرے ، مربع بنانے کے فنِ ریاضی سے کماحقہٗ واقف تھے۔ کئی ماہرینِ اہرامیات نے ایسی پیائشوں کی شاندہی کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قدیم مصریوں کی اعلیٰ ترین ریاضی سے واقفیت درجۂ کمال پہنچی ہوئی تھی۔ ان مقامات میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

۔ اہرام کے دائیں حصے کا رقبہ بنیاد کے مجموعی رقبے سے وہی مناسبت رکھتا ہے جو ایک اور Pi میں ہے۔ یاد کی نصف لمبائی کو اس سے ضرب کرنے سے فارمولا بنتا ہے ۵۸۱۳ء۰۱x۴۴۶۵ء۵۲ جس کا ں ۲۶،۵۳۹،۲۵۱ء۵ اہرامی مکعب انچ ہوتا ہے۔ اہرام کی بنیاد کا رقبہ اس کی ایک جانب (Side)

کو مربع کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے یعنی ۵ء۱۳۱، ۹x۵ء۱۳۱، ۹ جس کا حاصل ہوا ۱۶۱، ۵، ۷، ۳ ۳
اہرامی انچ۔ اب ان اعداد کو اس فارمولے میں رکھ لیں۔

۳،۱۴۱۵۹ء : : ۱۶۱، ۵، ۷، ۳، ۸۳ : ۵ء۲۵۱، ۲۵، ۵۳۹، ۲۵

اس مساوات کی انتہائی اقدار (Extremes) کو ایک دوسرے سے ضرب دیں اور درم
اقدار (Means) کو آپس میں ضرب دیں تو جواب آتا ہے ۱۶۱، ۵، ۷، ۳، ۸۳۔ جس سے ظاہر ہ
ہے کہ دائرہ چورس ہو گیا۔ یعنی دائرے کا چورس رقبہ معلوم ہو گیا۔

۲۔ عظیم اہرام کا بیرونی بالائی زاویہ ۵۱ ڈگری ۵۱، ۱۴ ء ۳۵ ہے۔ اسے اگر ہم اہرام کی بنیاد کی لم
سے جو ۷۶۳ ء ۸۱ برطانوی فٹ ہے مربوط کر کے مساوات میں استعمال کریں تو ہم آسانی سے اہر
عظیم کی بلندی معلوم کر سکتے ہیں جو ۲۵۲.۷ء ۴۶۸ برطانوی فٹ ہے دوسرے الفاظ میں یوں کہ
سکتا ہے کہ اہرام کی بلندی سے بنیاد کی طرف کی لمبائی میں وہی ربط ہے جو ایک اور پائی Pi میں ہے۔
اس تناسب کو ہم فارمولے کے ذریعے یوں بھی ظاہر کر سکتے ہیں۔

۳ء۱۴۱۵ : ۱ : : ۷۶۳ء۸۱x۲ : ۴۶۸ء۲۵۶۷

اسے حل کرنے سے فوراً ہی یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ۱۵۲۷ء ۶۲ برابر ہے ۱۱۵۲۷ء ۶۲
طرح معماروں نے یہ دائرے کا مربع ثابت کر دیا۔

ریاضی کے دیگر عجوبے

ا۔ دیوان شاہی کا وتری مکعب ۱۶۴۶ء ۵۱۵ اہرامی انچ ہے۔ اس عدد کو اگر ہم ۱۰ سے ضرب کریں
چلتا ہے کہ یہ عدد لمبائی میں چورس کے ایک حصے کے رقبے کے برابر ہے جو اس عمارت کے عمو
زاویہ قائمہ کی لمبائی کے مساوی ہے یعنی ۱۶۴۶ء ۵۱۵۱ اہرامی انچ۔

۲۔ ڈیوڑھی یا پیش کمرہ (Ante chamber) کی لمبائی کو ۵۰ سے ضرب دینے سے اس عمارت
بلندی اہرامی انچوں میں حاصل ہوتی ہے۔ اس کا فارمولا ہے ۱۰ء ۵۸۱۳ + ۵۰x۲۶ء ۱۱۶۔ اگر
اہرام کی بلندی کو ۵۰ سے تقسیم کریں گے تو پیش کمرے کی لمبائی نکل آئے گی۔

۳۔ کوئنز چیمبر (ملکہ کے دیوان) کی شمالی اور جنوبی دیواروں کی لمبائی ۶۲ء ۱۸۲ اہرامی انچ
دیوان کی مشرقی دیوار میں ایک بڑا طاق ہے جس کی پیمائش ۱۸۵ انچ ہے۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے
جب ہم ۲ء ۱۸۲۶ (۱۰x۶۲ء ۱۸۲) کا جذر المربع نکالیں اور پھر اسے طاق کی پیمائش یعنی ۱۸۵
تقسیم کریں تو جواب ۳ء۱۴۱۵۹ آئے گا جو Pi ہے۔

۴۔ دیوان شاہی کا تابوت بھی بڑی دلچسپ چیز ہے اس کی لمبائی جمع چوڑائی برابر ہے Pi ضرب تابو
کی گہرائی۔ ایسے دائرے کے محیط کو جس کا نصف قطر عمارت کی بلندی یعنی ۱۰ء ۵۸۱۳ اہرامی
ہے آدھا کریں اور پھر اسے اہرام کی بلندی سے ضرب کریں تو ایک بار پھر نتیجہ پائی Pi کی صورت

ظاہر ہوگا۔

زمین کی اوسط کثافت

ہمارے سیارے کی کثافت مختلف متعلقہ سائنس دانوں نے مختلف بتائی ہے۔ ماہرین کے مطابق اس متغیر جزو ضربی (Variable Factor) کو حاصل کرنے کے پانچ معیار ہیں۔ ان کے استعمال اس سائنس داں کی مرضی پر منحصر ہیں جو کوئی مسئلہ حل کرنے لگا ہو۔ وہ پانچ معیار یا پیانے جو آج کل مستعمل ہیں، یہ ہیں

Airy	۶٫۵۶۵
Baily	۵٫۶۷۵
Cavandish	۵٫۴۵۰
Reich	۵٫۴۴۰
Royal	۵٫۳۱۶

مندرجہ بالا پانچوں اعداد کی اوسط نکالی جائے تو وہ ۵٫۶۸۹ بنتی ہے۔

ماہرینِ اہرامیات نے پتھر دیوان شاہی میں موجود تابوت کی مکمل پیمائش کی جو ۷۱٬۲۵۰ مکعب انچ آئی۔ جب اس رقم کو ۵۰ کے جذر الکعب کے دسویں حصے سے تقسیم کیا گیا تو جواب ۵٫۷ ملا جو اس اوسط سے جو آج کل ہمارے سائنس داں استعمال کرتے ہیں صرف ہزار کا گیارہواں حصہ (۰٫۰۱۱) کم ہے۔ قدیم مصریوں کے غیر معمولی علوم کی شہادت کے طور پر اس Data کو قبول کرنے سے پہلے ہمیں مارٹن گارڈنر کے اس بیان پر غور کر لینا چاہیے جو اس نے اپنی کتاب "Fads and Fallacies in the Name of Science" میں تحریر کیا ہے یہ کتاب ڈوور پریس نیویارک سے ۱۹۵۷ء میں "In the Name of Science" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اہرامیات کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے گارڈنر نے World Almanac میں شائع

ابدی موت: گھر تو انسان شاید اپنی زندگی تک بناتا ہے مگر مقبرے لافانی زندگی کے لیے بنائے جاتے تھے مصریوں کا زیست بعد از مرگ پر مکمل ایمان تھا اس لیے وہ اپنے مردوں کی لاشیں حنوط کر کے انہیں اہرام میں دفن کیا کرتے تھے۔ یہ تین عظیم اہرام مصر میں غزہ کی پٹی کے ساتھ واقع ہیں جن میں فرعونوں کی حنوط شدہ لاشیں دفن کی گئیں۔

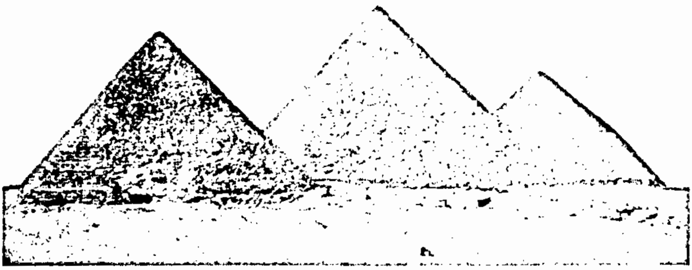

شدہ Washington Monument کے بارے میں حقائق پر ایک نظر ڈالی۔

اس یادگار Monument کی بلندی ۵۵۵ فٹ ۵ انچ ہے اس ڈھانچے کی بنیاد کا رقبہ ۵۵ مربع فٹ ہے اس کی کھڑکیاں بنیاد سے ٹھیک ۵۰۰ فٹ کی بلندی پر ہیں۔ گارڈنر نے بتایا کہ بنیاد کی پیائش کو ۶۰ پر ضرب کرنے سے (۶۰، سال کے بارہ مہینوں کا پانچ گنا عدد ہے) ۳۰۰، ۳ آتا ہے جو اس عمارت کے چوٹی کے پتھر کا پونڈ میں وزن ہے۔ اس نے مزید بتایا کہ لفظ واشنگٹن (Washington) میں دس حروف ہیں (۵ ضرب ۲) اور اگر چوٹی کے پتھر (Capstone) کو بنیاد کے رقبے سے ضرب کر دیا جائے تو جواب ۵۰۰،۱۸۱ آتا ہے جو روشنی کی میل فی سیکنڈ کی رفتار سے بے حد قریب ہے۔

گارڈنر نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ یادگار کا فٹ عام معیاری فٹ سے ذرا کم ہے۔ یادگار کی ایک سمت کا ناپ ۱/۲ ۵۶ یادگاری فٹ ہے اگر اس عدد کو ۳۰۰۰، ۳ پر ضرب کر دیا جائے تو روشنی کی رفتار کا عدد اور زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ پھر گارڈنر نے استہزائیہ انداز میں سوال کیا ہے "کیا یہ بات قابلِ ذکر نہیں ہے کہ یہ یادگار پتھر کے چار پہلو گاؤدم ستون کی مانند ہے جو قدیم مصری تعمیر ہی کا ایک نمونہ ہے"۔ گارڈنر کو تو اس بات پر بھی حیرت ہوتی ہے کہ ڈالر کے نوٹ پر واشنگٹن کے پورٹریٹ کے دوسری جانب عظیم اہرام کی تصویر چھپی ہوئی ہے۔ "اس کے علاوہ" وہ کہتا ہے "ڈالر کے نوٹوں پر دوسری جانب اہرام کی تصویر چھاپنے کے فیصلے کا اعلان سیکریٹری آف ٹریژری (Secretary of Treasury) نے ۱۵/جون ۱۹۳۵ء کو کیا تھا اور یہ دونوں تاریخیں ۵ سے تقسیم ہوتی ہیں اور کیا The Secretary of Treasury کے عہدے میں ٹھیک ۲۵ حروف نہیں ہیں جو ۵ سے پورا پورا تقسیم ہوتے ہیں؟

گارڈنر کا انتباہ کئی ماہرینِ اہرامیات و آثارِ قدیمہ کی ناپسندیدگی کا باعث ہوا ہے۔ اپنی کتاب "Mountains of the Pharaoh" میں برطانوی مصنف اور فلم پروڈیوسر لیونارڈ ٹریل نے اہرام سے متعلق پراسرار نظریات پیش کرنے والوں کے لئے پیرامیڈیاٹ (Pyramid-iot) کا لفظ اختراع کیا ہے۔ تاہم معتقدین اب بھی مصر کی اس قدیم تعمیر کی پیائش سے پیش گوئیوں، مذہبی معانی اور ساحرانہ یا پراسرار رموز کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

معتقدین نے شہادت کے طور پر پیازی اسمتھ کی کتاب "Our Inheritance in the Great Pyramid" کے ایک پیراگراف کی نشان دہی کی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ ان پتھروں سے آنے والے واقعات کی پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔ اسمتھ لکھتا ہے "کینائٹ (Cainite) اور غیر اسرائیلی قوموں بلکہ خود مصریوں نے بھی کبھی اس بات کی طرف دھیان نہیں دیا تھا مگر اس کے باوجود یہ بات بلاتردّد کہی جا سکتی ہے کہ یہ عمارت اپنے عظیم بلکہ مسیحائی مشن کی آئینہ دار ہے۔ اہرام سے کم قدیم یادگاروں میں پائی جانے والی تحریری زبانوں، ہیروغلافی (تصویری خط) یا عامیانہ زبان میں کندہ معلومات کے برخلاف جدید دور میں مستعمل ریاضی اور طبیعیاتی سائنس کی مدد سے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس عمارت کے طول، عرض اور زاویوں میں ٹھیک پیائش کے

فرعون اخناتن جس نے تمام روایتی خداؤں پر پابندی لگا دی تھی اور صرف واحد "سورج خدا" کی پرستش کا تصور دیا تھا۔ دیگر خداؤں کے تصور کو ختم کرکے اس نے واحد خدا کے لیئے ایک الگ دارالحکومت تعمیر کیا' جہاں پر صرف سورج خدا "اخناتن" کی پرستش ہوتی تھی۔ واضح رہے کہ قدیم مصر میں فرعونوں کو خدا کا درجہ حاصل تھا اور لوگ ان کی پوجا کیا کرتے تھے۔

کس قدر حیرت انگیز اسرار پوشیدہ ہیں۔ یقینی معنی رکھنے والی یہ علامتیں اتنی آسان بھی نہیں ہیں کہ ذرا سی کاوش سے ہی اس نامعلوم دنیا کی تاریخ ہمارے سامنے آجائے ہاں اگر کوئی اور سائنسی دور ایسا آیا جس میں تمام اقوام ان پیمائشوں اور علامات کے ذریعے اس الوہی دور کو سمجھ سکیں تو پھر یقیناً حیرت سے انسان کی آنکھیں پھٹ جائیں گی اور وہ اپنے ماضی، حال بلکہ مستقبل کے بارے میں بہت کچھ جان سکے گا۔

اپنے بھاری بھر کم وکٹورین اسٹائل میں مسٹر اسمتھ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر ہمیں اس اہرام میں پوشیدہ پیغامات سمجھ میں نہیں آرہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ابھی تک اس علم اور روشن خیالی کی حد تک نہیں پہنچ سکے ہیں جو انہیں سمجھنے میں ہمارے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

برطانوی انجینئر ڈیوڈسن اپنی کتاب "The Great Pyramids- its Divine Message" میں کہتا ہے

''اس عظیم اہرام کے ڈیزائن کی مختلف جہتوں کو سمجھنے کے بعد میرا وجدان یہ کہتا ہے کہ تعمیراتی انداز میں محض ''سچائی'' کا اظہار کیا گیا ہے۔ میں بڑی انکساری مگر یکساں اعتماد کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ جب ہم اہرام سے منسلک آخری پیغام کو بھی سمجھنے کے قابل ہو جائیں گے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ بائبل بلاشبہ خدا کی الہامی کتاب ہے۔ یہ بات بھی ثابت ہو جائے گی کہ حضرت یسوع مسیح کا آسمانوں پر جانا گویا تمام دنیا کے انسانوں کے گناہوں کی قیمت تھی اور گویا کہ ان پر سچا ایمان لانے والا نجات پا چکا ہے۔

مصریات کا ایک اور پیش کار چارلس لیٹی مر سول انجینئر اور The French Metric System or The Battle of the Standards نامی کتاب کا مصنف لکھتا ہے

''بلاشبہ یہ درست ہے کہ ہمارے اوزان اور پیمائش کی اکائیوں میں موجودہ دور میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ مگر یہ کام کیسے کیا جائے؟ اس طرح تو نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں اور ماضی سے رشتہ بالکل ہی منقطع کر لیں۔ نہیں بلکہ ہمیں درجہ کمال تک پہنچی ہوئی قدیم و مقدس تاریخ کی طرف لوٹنا پڑے گا۔ اس مذہب کی طرف جو یہ ثابت کرتا ہے کہ نسل انسانی خود بخود ترقی کی منازل طے کرتی ہوئی موجودہ صورت تک نہیں پہنچی ہے بلکہ خالق کائنات نے انسان کو اسی

موجودہ صورت میں تخلیق کیا تھا۔

"لیکن ہمیں ایسا کمال کہاں سے مل سکتا ہے؟ میرا جواب ہے گیزا کے عظیم اہرام سے۔ کیونکہ ان سنگی ستونوں میں معیاری اوزان اور پیمائش کے پیمانے موجود ہیں۔ زمین وآسمان کی ہم معیاریت اور تناسب پوشیدہ ہے، ہمارے قدیم اور جدید موروثی نظام کا ایک ایسا انجذاب موجود ہے کہ لگتا ہے کہ جیسے خود خالق کائنات نے ہمیں اسے ودیعت کیا ہے تاکہ ہم اسے آج کے دن اور اس گھڑی کے ہنگامی حالات کے لئے ٹھیک طور پر سنبھال کر رکھیں اور میں اپنے امریکی ہم وطنوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ بڑی احتیاط سے اس موضوع کا مطالعہ کریں اور اسے سمجھنے اور پھر کام میں لانے کی کوشش کریں"۔ کیا یہ یقینی بات ہے کہ ہمیں ہمارے اوزان اور پیمائش کی معیاری اکائیاں یہاں سے دستیاب ہو جائیں گی؟" میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہاں وہ یہاں موجود ہیں۔ یہاں انچ ہے' یہاں گز ہے' یہاں پچیس انچ لمبا ہاتھ ہے۔ ہمارا سال یہاں ہے۔ ہمارا سبت Sabbath یہاں ہے، ہمارے یسوع مسیح یہاں ہیں، ہمارا ماضی، ہمارا حال ہاں شاید ہمارا مستقبل بھی یہیں موجود ہے"۔

آج کے علم نجوم واسرار کے معتقدین نے بھی بڑے پر جوش انداز میں علامتی پیغامات کی تصدیق کر دی ہے اور جب سے قدیم فلکیات کا نظریہ مقبول ہوا ہے یہ اعتقاد کچھ زیادہ ہی مضبوط ہو گیا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں ہر گزرے سال کے ساتھ، سائنس ہمیں اس پچھلے دور کی طرف دھکیل رہی ہے جب انسان زمین پر آیا تھا۔ ہر آثاریاتی (Archaeological) دریافت دوسری درجنوں دریافتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے اور ہر دریافت پچھلی دریافتوں کے پرزے اڑا دیتی ہے۔

آنے والے ادوار میں شاید ہمیں اہرام کے بارے میں' ان کے معماروں کے بارے میں ان پتھروں میں پوشیدہ پیغامات کے بارے میں' شاید اس سے بھی زیادہ ناقابلِ یقین نظریات قبول کرنے پڑیں۔ ان نظریات کے سلسلے میں ہم بے شک متشکک ہوں مگر ہمارا رویہ کھلے ذہنوں والے انسانوں کا سا ہونا چاہئے۔

☆

ابتدائی دور کے سیاح

عظیم اہرام کے بارے میں ہماری معلومات کو وقت کے کہر نے دھندلا دیا ہے۔ جانے وہ کون سا جذبہ تھا کیا محرک تھا جس نے مصریوں کو اس عظیم سنگی یادگار کو تعمیر کرنے والی قوم میں ڈھال دیا تھا۔ ہم اس بات سے بھی بے خبر ہیں کہ جب یہ عظیم اہرام مکمل ہو چکا تھا تو وہ لوگ اسے کن نظروں سے دیکھتے تھے۔ مصری طومار (Scrolls) جن میں شاید اس عمارت کے بارے میں تفصیلات درج تھیں، تباہ ہو چکے ہیں۔ ہمارے پاس محض چند زبانی حکایات ہیں جن سے اس اہرام کے صرف دو ہزار سال قبل مسیح تک کے دور کی تاریخ کا کچھ سراغ ملتا ہے۔ ان اساطیر (Myths) میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ اہرام کی ہر چہار اطراف چار مختلف رنگوں سے مزین تھیں۔ بعد میں عرب تاریخ دانوں نے یہ بتایا کہ ان اطراف پر ہزاروں ملفوظات کندہ تھے۔ ہم عصر ماہرینِ اہرامیات آج تک قیاس میں گم ہیں کہ وہ مذہبی تحریریں تھیں، عارفانہ علامات تھیں یا محض بے ڈھنگے نقوش و خطوط جو قدیم دنیا کے اس عظیم ترین عجوبے پر سیاحوں نے اپنے ناموں کی صورت میں گھسیٹ دیئے تھے۔

قدیم زمانے کے بے شمار مصنفین نے مصر کی سیاحت کے بعد ان اہراموں کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے مگر بدقسمتی سے ان میں سے بہت کم نوشتہ ہیں جو زمانے کی دست برد سے بچ کر ہم تک پہنچ سکے ہیں۔ ایک یونانی تاریخ داں ہیروڈوٹس (۴۲۵۔ ۴۸۴ ق م) نے اس وقت مصر کی سیاحت کی جب وہ تقریباً پچیس برس کا تھا۔ اس زمانے میں عظیم اہرام کی چاروں اطراف چمکدار روغنی سطح والے علاقائی پتھروں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ اپنی کتاب "History" میں ہیروڈوٹس کہتا ہے کہ چونے کے پتھروں کو اس قدر مہارت اور کاریگری سے چنا گیا تھا کہ ان کے جوڑ تقریباً نادیدہ ہو کر رہ گئے تھے۔

ہیروڈوٹس کا دعویٰ ہے کہ اہرام کی عمارت کے بارے میں اسے وہاں کے کاہنوں نے بتایا تھا۔ ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ کئی محققین کے نزدیک ہیروڈوٹس ایک مشکوک تاریخ داں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ انہیں یقین ہے کہ اس نے اپنی تحریر کی تزئین و آرائش کے لئے اپنے توانا تخیل کو کچھ زیادہ ہی زحمت دے ڈالی تھی۔ ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ہیروڈوٹس کی مصر کی سیاحت کے وقت اس عظیم اہرام کی تعمیر کو تقریباً دو ہزار برس گزر چکے تھے۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص سن ۷۰۴۴ عیسوی میں کسی سیاح تاریخ داں کو نیویارک کی ورلڈ ٹریڈ بلڈنگس کی تعمیر کے بارے میں بتا رہا ہو۔

بہر حال ہیروڈوٹس کا بیان حاضر خدمت ہے :۔

''اب انہوں نے مجھے بتایا کہ رتمسی نیٹس (Rhampsinitus) کے دورِ حکومت میں انصاف کا بول بالا تھا اور پورے مصر میں انتہائی خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ لیکن اس کے بعد شی اوپس نے زمامِ حکومت سنبھالی تو ملک ہر قسم کی خرابیوں اور برائیوں میں ڈوب گیا۔ تمام عبادت گاہوں کو مقفل کر دیا گیا اور ہر قسم کی قربانی کی ممانعت کر دی گئی پھر اس نے تمام مصریوں کو حکم دیا کہ وہ اس کے لئے کام کریں۔ اس کے احکامات کے مطابق ان میں سے کچھ کو عرب کے پہاڑوں کی کانوں سے دریائے نیل تک پتھر دھکیل کر لانے پر لگا دیا گیا۔ باقیوں کو حکم دیا گیا کہ کشتیوں کے ذریعے دریا پار آنے والے ان پتھروں کو گھسیٹ کر اس پہاڑ تک لائیں جس کا نام لیبین(Libyan) تھا۔

اور وہ لوگ بیک وقت ایک ایک لاکھ کی تعداد پر مشتمل پارٹیوں میں کام کرتے تھے۔ ہر پارٹی تین ماہ کے بعد ایک کے بعد دوسرے کام پر لگا دی جاتی۔ اس طرح جبری مشقت میں پھنسے ہوئے ان لوگوں نے اس سڑک پر دس سال تک کام کیا جو انہوں نے خود اسی مقصد کے لئے بنائی تھی۔ اس سڑک پر ان بھاری پتھروں کو دھکیلنا اور کھینچنا میرے خیال میں اہرام کی تعمیر سے کم مشقت اور مہارت طلب کام نہیں تھا کیونکہ اس سڑک کی لمبائی ۵ اسٹیڈس(stades)(۳۰۲۱ فٹ) اور اس کی چوڑائی ۱۰ اور گائی(Orgyae) ۶۰ فٹ اور اس کا بلند ترین فراز ۸ اور گائی ۴۸ فٹ تھی۔ یہ سڑک روغنی چمکدار پتھروں کی بنی ہوئی تھی جن پر تصویریں کندہ تھیں اور اس سڑک پر ان لوگوں نے دس طویل برس گزار دیئے اور اس پہاڑی کے زیرِ زمین کمرے جن پر یہ اہرام ایستادہ ہے اور جسے اس بادشاہ نے اپنے لئے مدفن کے طور پر تعمیر کروایا تھا ایک جزیرہ نما ہے جسے دریائے نیل سے لائی گئی نہر کے ذریعے بنایا گیا ہے۔

''اس اہرام کی تعمیر میں بیس سال لگ گئے۔ یہ ایک چورس عمارت ہے جس کی ہر سمت ۸ پلیتھی (Plethea)(۸۲۰ فٹ) اور اونچائی بھی اتنی ہی ہے۔ اسے روغن شدہ پتھروں سے تعمیر کیا گیا ہے اور پتھروں کا ہر جوڑ بہترین مہارت کا مظہر ہے۔ ان میں سے کوئی بھی پتھر ۳۰ (تیس) فٹ سے کم نہیں ہے۔ اس طرح قدمچوں کی صورت میں یہ اہرام تعمیر کیا گیا جنہیں کروسی(Crossae) یا بومائنڈس کہا جاتا ہے۔ جب وہ انہیں اس صورت میں تعمیر کر رہے تھے تو ابتدائی قدمچے کے بعد باقی پتھروں کو انہوں نے ایک مشین کے ذریعے اوپر تک پہنچایا۔ یہ مشین لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے بنائی گئی تھی۔ پہلے قدمچوں کے سلسلے پر پتھر پہنچا دینے کے بعد دوسری رینج تک وہ دوسری مشین استعمال کرتے۔ ان کے پاس اتنی ہی مشینیں تھیں جتنے یہ سلسلے(Ranges) تھے یا پھر شاید ایک ہی مشین تھی جسے وہ ایک کے بعد دوسرے سلسلے (رینج) تک لے جاتے رہے اور پتھر اس کے ذریعے اوپر سے اوپر پہنچاتے رہے یا شاید انہوں نے دونوں ہی طریقے استعمال کئے ہوں۔

اہرام کا سب سے اونچا والا حصہ انہوں نے پہلے تعمیر کیا پھر اس کے بعد وہ بتدریج نیچے والے حصے تعمیر کرتے گئے اور آخر میں سب سے نچلے حصے پر آئے۔

اہرام پر مصری حروف میں یہ بات کندہ کی گئی ہے کہ مزدوروں اور کارکنوں کے لئے کس قدر مولیاں، کتنی پیاز اور کتنا لہسن خرچ کیا گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ترجمان نے یہ ساری باتیں پڑھتے ہوئے مجھے بتایا کہ اس پر چاندی کے سولہ سو ٹیلنٹس صرف ہوئے تھے۔ اگر یہی بات تھی تو ذرا اندازہ لگائیں کہ کتنی روٹیاں، کتنے کپڑے اور کتنے لوہے کے اوزار استعمال کئے ہوں گے اور یہ سارا کام ایک طویل دورانیے پر یعنی پتھروں کی کٹائی اور ان کی ترسیل، ان سے تعمیر اور زیرِ زمین چیمبرس کی تشکیل پر محیط تھا۔

"مجھے بتایا گیا کہ شی اوپس اس معاملے میں اس قدر گر چکا تھا اور بدنام ہو چکا تھا کہ دولت کی طلب میں اس نے خود اپنی بیٹی کو قحبہ خانے میں بٹھا دیا تھا اور اسے حکم دیا کہ جبر سے، ترغیب سے جس طرح ہو زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کی جائے۔ مجھے یہ نہیں بتایا گیا کہ اسے کس قدر رقم کی ضرورت تھی مگر یہ ضرور معلوم ہوا کہ اس دوشیزہ نے جس قدر دولت اپنے باپ کے لئے جمع کی تھی اسی قدر اس نے خود اپنی ذاتی اغراض کے لئے بھی حاصل کر لی تھی۔ کیونکہ وہ بھی اپنے باپ کی طرح اپنے لئے ایک مقبرہ تعمیر کرانے کی خواہش مند تھی۔ اس نے تو یہاں تک کہا تھا کہ اپنے ڈیزائن کئے ہوئے مقبرے کی خاطر اس نے اپنے ہر گاہک سے ایک پتھر کا بھی مطالبہ کیا تھا۔ راہبوں نے بتایا کہ ان پتھروں اور اس دولت سے شہزادی نے اپنے لئے واقعی ایک اہرام اس عظیم اہرام سے قبل تعمیر کروالیا تھا۔ یہ اہرام ان تینوں میں سے درمیان والا تھا جو لمبائی میں بڑے سے نصف تھا"۔

محققین کا خیال ہے کہ اہرام پر کندہ تحریر کے بارے میں ہیروڈوٹس سے اس کے ترجمان نے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ جدید ماہرینِ مصریات کا اندازہ ہے کہ یہ علامتیں تعمیراتی اخراجات کے بیان کے بجائے مذہبی اشلوک ہیں۔ یہ تضاد بیانی دور ہو سکتی تھی اگر ہمیں اسٹریبو (Strabo) کی لکھی ہوئی "History" کی سینتالیس گمشدہ جلدیں مل جاتیں۔ اسٹریبو

فرعون اخناتن کی شریک زندگی ملکہ نیفرتتی جس نے اپنے شوہر کے سورج خدا آتن کے تصور کو پختہ کرنے میں بڑی مدد کی اور اس کے ساتھ ریاستی امور میں بھی شریک رہی۔

ایک یونانی مصنف اور نقشہ ساز تھا جس نے ۲۵ سال قبل مسیح میں مصر کی سیاحت کی تھی۔ اس کے ناکافی ضمیمہ سے پتا چلتا ہے کہ عظیم اہرام کے شمالی جانب قبضے لگا ایک بلاک تھا۔ جب یہ سنگی دروازہ بند کیا جاتا تو وہ پتھروں کی متوازی قطاروں میں بالکل فٹ ہو جاتا تھا۔ انتہائی جاں سوزی کے باوجود بھی آج تک کوئی اس دروازے کو دریافت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔ ہماری تاریخ سربستہ رازوں، تضادات اور بے یقینیوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اگر سن ۳۸۹ عیسوی میں عیسائیوں کے ایک مشتعل ہجوم کے ہاتھوں اسکندریہ کی لائبریری تباہ نہ ہوگئی ہوتی تو بیشتر سوالوں کے جوابات مل سکتے تھے۔ سینٹ سیبل (Cybil) کی ماتحتی میں جو اس وقت اسکندریہ (Alexandria) کا بشپ تھا، راہبوں کے اکسانے پر وہ ہجوم جنونی لٹیروں کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ انھوں نے لائبریری کی عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور سینکڑوں ہزاروں بیش قیمت نسخے جلا کر خاک کر ڈالے۔ اس دور کے عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ سے پہلے کے تمام علوم کفر والحاد پر مبنی اور شیطانی اثرات کے حامل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عیسائیوں کو صرف اپنے لارڈ کی پوجا کرنی چاہئے اور اس کے علاوہ کسی بھی قسم کے دیگر علوم یا سائنس سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہئے۔

''تاریکی کا یہ دور پوری دنیا پر غالب تھا''۔ ڈاکٹر گنتھر روزن برگ کہتا ہے ''کئی صدیاں گزرنے کے بعد جا کر کہیں تہذیب و تمدن کے ارتقاء کا عمل شروع ہوا۔ پھر عرب ممالک میں نشاۃ ثانیہ کی ابتدا ہوئی۔ اسلامی افواج نے صحراؤں کو پار کیا اور ۶۴۰ عیسوی میں اسکندریہ کو فتح کر لیا۔ یہ بغداد کے خلفاء کی افواج جلیلہ تھیں جو اس دور کے بے حد باکمال کے حکمراں تھے۔ یہ خلفاء مذہبی اور سیاسی دونوں رہنماؤں کی حیثیت کے حامل تھے۔ ان کی حکمرانی اور طاقت کا سلسلہ حضرت محمد ﷺ سے چلا آرہا تھا۔ ان خلفاء کو سائنس کی اہمیت کا بھی پوری طرح احساس وادراک تھا۔

اپنی لائبریریوں کو بھرنے کے لئے ان خلفاء نے پوری قدیم دنیا کو کھنگال ڈالا تھا۔ جو فوجی کوئی نادر نسخہ لے کر آتا اسے عوض میں انعام کے طور پر سونا دیا جاتا تھا۔ جلد ہی بیش بہا نسخوں اور نادر کتابوں کا بہاؤ بغداد کی طرف ہو گیا۔ ان نسخوں کا فوراً ہی عربی زبان میں ترجمہ کر لیا جاتا تھا اور مترجم حضرات بھی خلیفہ سے انعام میں سونا ہی پاتے تھے۔ ''مترجمین کو ان کے ترجمہ شدہ نسخے کے وزن کے برابر سونا دیا جاتا تھا۔'' ڈاکٹر روزن برگ نے بتایا ''عربی لائبریریوں کو علوم وفنون کے خزانوں سے بھرنے کا یہ ایک بے حد موثر نظام تھا جو عالم گیر تباہی تک باقی رہا''۔

بغداد کے ان انتہائی ممتاز خلفاء میں سے ایک خلیفہ عبدالرحمٰن المامون گزرا ہے وہ سن ۸۱۳ عیسوی میں تخت خلافت پر متمکن ہوا اور اس نے پورے ملک میں یونیورسٹیوں اور لائبریریوں کا جال پھیلا کر خود کو علم ودانش کا سب سے بڑا سرپرست ثابت کر دیا۔ ''اس نے بغداد میں ایک رصد گاہ بھی تعمیر کروائی تھی'' ڈاکٹر روزن برگ لکھتا ہے ''اور اس نے بطلیموس (Ptolemy) کی فلکیات اور جغرافیائی معلومات پر مشتمل کتاب "Almagest" کا عربی زبان میں ترجمہ بھی کروالیا تھا''۔

تاریخ گواہ ہے کہ المامون نے اپنے دربار میں دنیا کے عقل مند ترین افراد کو جمع کر رکھا تھا۔

ایک صبح اس نے ان تمام دانش وروں کی ایک کانفرنس بلوائی۔ ''آج رات میں نے ایک دلچسپ خواب دیکھا ہے''۔ اس نے اپنے سامنے باادب بیٹھے ستر علماء و فضلاء سے کہا''۔ میرے خواب میں ارسطو آیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں بطلیموس کی ''الماجیسٹ'' کی جانچ پڑتال کراؤں۔ خواب میں ارسطو نے مجھ سے یہ مطالبہ کیا کہ میں دیکھوں کہ بطلیموس نے جو دنیا کا محیط اٹھارہ ہزار (۱۸۰۰۰) میل بتایا ہے وہ واقعی درست ہے یا نہیں''۔

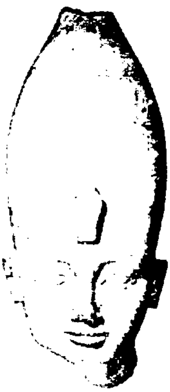

ملکہ ہیت شیپت : اس پرجوش خاتون ملکہ نے مصر پر تیس سال حکمرانی کی۔ مملکت کا تاج ان کے سوتیلے بیٹے کے سر پر سجا تھا مگر اس نے خود حکومت کی باگ دوڑ سنبھال لی اور فرعون کا تاج اپنے سر پر سجا لیا۔ اس مجسمے میں اس نے کوبرا دیوی کا تاج پہن رکھا ہے جس کا تعلق بالائی مصر سے تھا۔

عربی ماہرینِ فلکیات اور ان کے نائبین زمین کے ارتفاع کی مقدار کی پیائش میں لگ گئے اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچے کہ زمین کا محیط ۱۸۰۰۰ کے بجائے ۲۳۱۸۰ میل ہے جو بطلیموس کی پیائش سے کہیں زیادہ درست ہے۔

''المامون کا سراغ رسانی کا انتظام بھی بہت موثر تھا'' روزن برگ نے لکھا ہے۔ ''اپنے مخبروں ہی سے اس نے اس عظیم اہرام کے بارے میں سنا۔ یہ افواہیں بھی اس کے کان میں پڑیں کہ اس اہرام میں ایک ایسا پوشیدہ کمرہ ہے جس میں ایک انتہائی قدیم تہذیب کے تبرکات اور یادگاریں موجود ہیں۔ وہ ایک ایسی تہذیب کے آثار ہیں جسے صدیوں سے بھلا دیا گیا ہے۔ یہ تبرکات اور یادگاریں دنیا کے درست ترین نقشوں، فلکی چارٹوں اور ریاضی کے پہاڑوں (Tables) پر مشتمل تھیں''۔ خلیفہ کو یہ بھی بتایا گیا کہ اس پوشیدہ کمرے میں قدیم ایجادات کا ایک سحر انگیز ذخیرہ بھی چھپا ہوا تھا۔ ''ان ایجادات میں ایک لوچ دار شیشہ تھا جو کسی طرف بھی موڑنے سے ٹوٹتا نہیں تھا'' روزن برگ نے کہا۔ ''ایسی دھاتیں جن میں زنگ نہیں لگتا تھا۔ اس کمرے میں ہیروں جڑا ایک ایسا ڈبہ (Box) بھی تھا جسے قوتِ گویائی حاصل تھی''۔ سن ۸۲۰ عیسوی میں المامون عظیم اہرام کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے ساتھ سنگی کاریگروں، معماروں، انجینئروں اور مزدوروں کی فوج ظفر موج تھی۔ وہاں پہنچ کر نوجوان خلیفہ نے ڈیرہ ڈال دیا اور ایک سائبان والے تخت پر بیٹھا اپنے کارکنوں کو عظیم اہرام پر گھٹنوں کے بل چڑھتا دیکھتا رہا۔ کئی دنوں کی کڑی تلاش کے باوجود بھی وہ لوگ اہرام کی شمالی ڈھلان پر کوئی دروازہ دریافت کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ایک ہفتے کی جان توڑ مشقت کے بعد ایک معمار خلیفہ کے خیمے میں آیا ''کیا آپ کو دروازے کی موجودگی کا یقین ہے؟'' تھکن سے چور معمار نے ادب سے پوچھا ''ممکن ہے وہ اہرام کی کسی دوسری سمت میں ہو''۔

خلیفہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میرے مخبر نے خبر دی ہے کہ دروازہ اور پوشیدہ کمرہ اہرام کی

شمالی جانب ہی ہیں''۔

پھر تو بہتر ہو گا کہ ہم پتھروں کو توڑ کر ہی انہیں دریافت کرنے کی کوشش کریں''۔ معمار نے کہا۔

سنگی کاریگروں کو بلایا گیا اور انہیں ہدایت کی گئی کہ اپنی چھینیوں سے بھاری بھر کم پتھر کے بلاکوں کو توڑنا شروع کریں۔ پورے علاقے میں چھینیوں پر پڑنے والے ہتھوڑوں کی آوازیں گونج اٹھیں مگر جلد ہی اس بات کا احساس ہو گیا کہ عربی چھینیاں مصری پتھروں کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتیں۔ چھینیاں تیز کرنے کے لئے لوہاروں کے گروہ کو بلایا گیا مگر کام کی رفتار میں ذرا سا بھی اضافہ نہ ہو سکا۔

آخر پرُ عزم خلیفہ نے حکم دیا کہ پتھر میں کسی طور ایک سوراخ ہی کر دیا جائے۔ عظیم اہرام کے شمالی جانب ایک وسیع پلیٹ فارم بنا ہوا تھا۔ ٹنوں کے حساب سے لکڑیاں جمع کر کے آگ دہکائی گئی اور پنکھے جھل جھل کر اس کے درجہ حرارت کو آخری حد تک بڑھا دیا گیا۔ جب گرینائٹ پتھر خوب گرم ہو گئے تو ان پر ٹھنڈے سرکے کے ڈرم انڈیل دیئے گئے۔ گرم کرنے کے بعد اس سرد عمل نے پتھر کے بلاکوں کو تڑخا دیا جن پر پھر ہتھوڑے مار مار کر خاصا بڑا سوراخ بنا لیا گیا۔

پتھر میں ایک سو فٹ لمبا چوڑا شگاف ڈالنے کا انعام خلیفہ کو اس صورت میں ملا کہ انہوں نے اہرام کے اندر اترنے کا راستہ دریافت کر لیا۔ وہ رینگتے ہوئے اس راستے میں اترے اور آخر کار ایک کمرے میں پہنچ گئے۔ کمرے میں معماروں کے چھوڑے ہوئے ملبے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ المامون بڑی بے خوفی سے کمرے میں نظریں دوڑاتا رہا۔ کمرے میں دوسری جانب ایک سیاہی مائل سرخ گرینائٹ تھا جو ادھر جانے والے راستے کی نشان دہی کر رہا تھا۔

سنگی کاری گروں نے اس پتھر کو کاٹ کر راستہ صاف کر دیا۔ سامنے ہی ایک چار فٹ چوڑی سرنگ دیکھ کر المامون خوش ہو گیا۔ اگلے کئی ہفتوں تک وہ اہرام کے اندر پھیلی ہوئی راہداریوں اور سرنگوں کے درمیان ایستادہ پتھر کی رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ ان جگہ جگہ کھڑے ہوئے رکاوٹی پلگوں کی وجہ سے ان کی رفتار بہت سست تھی۔ ''تاریخ گواہ ہے کہ وہ جس طرف بھی گئے انہیں ان سنگی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا''۔ روزن برگ نے بتایا ''ایک راہداری میں تو انہیں ہر چار فٹ کے فاصلے پر ایک رکاوٹ کھڑی ملی اور ان میں سے ہر رکاوٹی پتھر کا وزن کئی کئی ٹن تھا۔ المامون نے بلاشبہ اہرام کے اندر جا کر ایک حیرت انگیز کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ اس کی خود اعتمادی بلاشبہ اس کی فولادی قوتِ ارادی کی مظہر تھی۔ اور آخر کار یہ عرب کوئنس چیمبر (ملکہ کے ایوان) تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ کمرے کی لمبائی ۱۸ فٹ تھی اور وہ تقریباً چورس تھا اور بالکل خالی پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے بہ دقت تمام ایک دیوار میں بنے طاق کو توڑا اور ایوان شاہی (کنگس چیمبر) میں داخل ہو گئے۔ کمرے کی واحد چیز جو انہیں وہاں ملی وہ پتھر کا بغیر ڈھکن کا تابوت تھا۔ یہ گہرے رنگ کے گرینائٹ کا منقش تابوت تھا جس کی بیرونی سطح بے حد چمک دار تھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا''۔ خلیفہ نے مایوسی سے کہا ''ایک خالی صندوق (تابوت) کے گرد آخر

ن لوگوں نے ایسی عظیم الشان یادگار کیوں تعمیر کی؟"

"شاید لٹیرے ہم سے پہلے یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہوں"۔ کسی نے رائے دی۔

"ہم جس دقت اور کوششوں کے بعد یہاں پہنچے ہیں اس کے پیش نظر یہ امکان ہرگز نہیں ہے کہ کوئی اور ہم سے پہلے یہاں تک پہنچا ہو"۔ خلیفہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

کچھ عرب تاریخ دانوں کا دعویٰ ہے کہ خلیفہ نے اپنے کارکنوں کے لئے انعام کے طور پر اہرام میں ایک خزانہ چھپا دیا تھا۔ دوسرے عرب محققین کا خیال ہے کہ خلیفہ کو اس تابوت میں پتھر کا ایک مجسمہ ملا تھا "اس مجسمے میں ایک دراز قامت آدمی کا جسم تھا"۔ روزن برگ نے بتایا۔ "اس نے خالص سونے کا بنا ہوا ایک زرہ بکتر پہنا ہوا تھا۔ اس کے سینہ بند پر بے شمار قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اس کی پیشانی پر انڈے جتنا بڑا موتی یا ہیرا تھا۔ وہ آدمی اپنے ہتھیاروں کے ایک منقش خنجر اور ایک ہیروں جڑی تلوار کے ساتھ دفن کیا گیا تھا"۔

المامون اور اس کے ساتھی اہرام کو اسی حالت میں چھوڑ آئے اور ان کا پھیلایا ہوا ملبہ اگلے چار سو سالوں تک ویسے کا ویسا ہی پڑا رہا۔ سن ۱۳۵۰ عیسوی میں المامون کے ایک عرب جانشین نے قاہرہ میں مساجد اور خانقاہیں تعمیر کروانے کا سلسلہ شروع کیا۔ انھوں نے اہرام کے روغن سے مزین غلافی پتھروں کو گھسیٹ کر قاہرہ پہنچایا اور تعمیر شروع کر دی۔ مسجد سلطان حسن انہی پتھروں سے تعمیر شدہ ہے۔ غلافی پتھروں کے ہٹ جانے کی وجہ سے اہرام کے گرینائٹ بلاکس صحرا کے موسم کا سامنا کرنے کے لئے عریاں رہ گئے۔ ریت کے طوفان، بارشوں اور ہوا کے جھکڑوں نے عظیم اہرام کا حلیہ بگاڑنا شروع کر دیا۔ بے آب و گیاہ صحرا میں ایستادہ یہ اہرام جلد ہی افواہوں اور اوہام کی آماجگاہ بن گیا۔ مصر جانے والے کچھ سیاحوں نے تو یہاں تک دعویٰ کر دیا کہ یہ اہرام شیطانی اور تاریکی قوتوں کی حامل جادوگرنیاں ہی تعمیر کر سکتی تھیں۔

بے دست ملکہ: بغیر ہاتھوں والی مصر کی ملکہ کا مجسمہ جس نے مصر پر ۷۰۰ قبل مسیح کے لگ بھگ حکمرانی کی۔ اس کے ہاتھ الگ سے لگے ہوئے تھے، مگر پھر وہ گم ہو گئے۔ اس کے سر پر کلغی نما سونے کا تاج سجا ہوا تھا اور سینے پر غیب کی دیوی اوسرس کی شبیہہ کندہ ہے۔

عربوں نے بھی اہرام کے اندر بھوت پریت کی موجودگی کی داستانیں تخلیق کر ڈالیں۔ "ایک حسین مہ جبیں توبہ شکن عورت اس کی راہداریوں میں گھومتی رہتی ہے" ڈاکٹر روزن برگ نے کہا۔ "یہ عورت اندر آنے والے کسی بھی آدمی کو ورغلانے کی قوت رکھتی تھی اور جب کوئی آدمی ایک بار اس کے چنگل میں پھنس جاتا تو پھر وہ بڑے بڑے دانتوں

والے عفریت کی صورت اختیار کر لیتی اور اپنے محبوب کے گوشت سے اپنی بھوک مٹاتی"۔ ایک اور محقق جس نے ان اہراموں کو کھنگالا جان گریوس تھا جو ۱۶۳۸ء میں مصر گیا تھا۔ ماہر فلکیات اور ریاضی داں گریوس (Greaves) کا خیال تھا کہ اس عظیم اہرام میں زمین کی پیائش کا راز پوشیدہ تھا۔ المامون کی طرح یہ انگریز محقق بھی یہی سمجھتا تھا کہ شاید اس اہرام کی مدد سے زمین کا محیط معلوم کیا جا سکے۔ وہ المامون کی دریافت کی ہوئی سرنگ کے ذریعے اہرام میں داخل ہوا اور آخر بادشاہ اور ملکہ کے دیوان تک پہنچ گیا۔

گریوس نے اہرام کی پیائش کی۔ اس پیائش کو اپنی نوٹ بک میں لکھتا گیا اور انگلینڈ واپس آکر پیرامڈوگرافیا "Pyramidographia : A Description of the Pyramids in Egypt" نامی کتاب شائع کر دی۔ اس کی ان کاوشوں کے عوض اسے آکسفورڈ یونیورسٹی میں علم ہیئت کا پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔ پیرامڈوگرافیا اہرام سے متعلق زوردار بحث و تمحیص کے آغاز کا باعث بن گئی۔ سر آئزک نیوٹن نے بھی گریوس کی پیائش کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عظیم اہرام کی تعمیر کی بنیاد الحادی اور الوہی ذراع (ہاتھ کی لمبائی) پر رکھی گئی ہے۔

"نیوٹن اس زمانے میں اپنے مشہور زمانہ نظریۂ کشش ثقل کے ارتقاء میں مصروف تھا"۔ روزن برگ نے بتایا۔ "وہ مصری ذراع کی ٹھیک ٹھیک پیائش کو جانچنے کا حاجت مند تھا۔ کئی قدیم ریاضی دانوں کا دعویٰ تھا کہ مصری اسٹیڈیم (ناپنے کا قدیم پیمانہ جو تقریباً ۶۰۷ فٹ کے برابر تھا) کی پیائش کا جغرافیائی زاویئے سے گہرا تعلق تھا۔ ذراع کا ناپ جاننے کے بعد ہی نیوٹن اپنے تجربات کو آگے بڑھانے کے قابل ہو سکا تھا"۔ نیوٹن نے فیصلہ کر لیا تھا کہ الحادی ذراع ۲۰ء۶۳ برطانوی انچ کے مساوی تھا اور الوہی یا یہودی ذراع کی پیائش ۸۰ء۲۴ اور ۰۲ء۲۵ انچ کے درمیان تھی۔ بدقسمتی سے عظیم اہرام کی پیائش کے سلسلے میں گریوس سے غلطی ہو گئی تھی۔ نیوٹن نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی جس کا نام "The Sacred Cubit of the Jews and the Cubits of several nations" (یہودیوں کا الہامی ذراع اور دوسری اقوام کے ذراع) تھا۔ اس خامی کے باوجود نیوٹن نے اپنے نظریہ کشش ثقل پر کام جاری رکھا۔ بعد میں جب ایک فرانسیسی نے عرض بلد کی صحیح مقدار معلوم کر لی تو نیوٹن نے اس پیائش کی مدد سے اپنے نظریئے کی تکمیل کی۔

اہرام سے متعلق اگلی تحقیق انقلاب فرانس کے فوراً ہی بعد اس وقت کی گئی جب نپولین بوناپارٹ مسند اقتدار پر بیٹھا۔ نپولین عجیب و غریب رجحانات کا حامل شخص تھا۔ نظریاتی طور پر وہ ایک فری میسن تھا۔ وہ پہلے مصر کو فتح کرنا چاہتا تھا پھر ہندوستان کو اور اس کے بعد پوری دنیا کو۔ ۳۳۰ جنگی جہازوں پر وہ ۳۶۰۰۰ سپاہیوں کے لشکر جرار کے ساتھ تولون (Toulon) سے مصر فتح کرنے نکلا۔

ڈاکٹر روزن برگ نے لکھا "بوناپارٹ فری میسنری کے اصولوں کی ترویج چاہتا تھا۔ وہ پراسرار قوتوں پر یقین رکھتا تھا اس لئے قدیم مصر میں اس کی دلچسپی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ اسکندریہ کی طرف سفر کرتے وقت اس کے ساتھ ۱۷۵ اقتجر عالم تھے۔ یہ وہ فرانسیسی دانش ور تھے جنہیں قدیم

اسفنکس اور قیدی: فرعون اسفنکس کی طاقت کا اندازہ آپ فتح مندی کے اس طلائی مجسمے سے بخوبی لگا سکتے ہیں جس میں فرعون اسفنکس ایک قیدی کے اوپر سوار ہے۔ یہ مجسمہ ۳۶۰۰ سال سے زائد عرصہ قبل بنایا گیا تھا۔

مصری ثقافت کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا دعویٰ تھا۔ نپولین کا ٹکراؤ مراد بے سے ہوا جو ترک عثمانیہ سلطنت کی طرف سے مصر کا گورنر تھا۔ ان دونوں جری قوتوں کے خوفناک ٹکراؤ سے اہراموں کے پتھر یقیناً لرز کر رہ گئے ہوں گے۔ فرانسیسی فوجوں کا مقابلہ دس ہزار مملوک گھڑ سواروں سے ہوا جو یقیناً اپنے وقت کے بہترین لڑاکا تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو عیسائی سے مسلمان ہوئے تھے۔ حالانکہ ان مملوکوں نے چنگیز خاں کے ایشیائی طوفانی خانہ بدوشوں کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا تھا مگر فرانسیسی فوج کی جدید رائفلوں کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔ چند گھنٹوں میں ہی جنگِ اہرام کا خاتمہ ہو گیا۔ دو ہزار مملوکوں کے خون سے ریگستان لالہ زار ہو گیا اور نپولین مصر کا فاتح ٹھہرا۔

اپنے شان دار گھوڑے پر سوار پستہ قد ڈکٹیٹر اپنی فاتح فوج کے جلو میں سید حامراد بے کے محل میں جا وارد ہوا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے ماہرین اور فضلاء نے اہراموں پر دھاوا بول دیا۔ وہ لوگ پرانی یادگار اشیاء کے خزانوں کی تلاش میں تھے پھر وہ پیمائش میں مصروف ہو گئے۔ ۱۲ اگست ۱۷۹۹ء کی سہ پہر کو نپولین عظیم اہرام کو دیکھنے آیا۔ ایوان شاہی میں پہنچ کر اس نے اپنے گائیڈ کو رخصت کر دیا کیونکہ وہ وہاں اکیلا کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔

نپولین پر اس ایوان میں کیا گزری اس کے متعلق کئی کہانیاں مشہور ہیں۔

''ایک داستان میں دعویٰ کیا گیا'' ڈاکٹر روزن برگ نے کہا ''کہ نپولین جب ایوان سے باہر آیا تو بری طرح کپکپا رہا تھا۔ وہ شاید اپنی کیفیت کے بارے میں پیش بینی کا شکار ہو گیا۔ چاہے اس پر کچھ بھی بیتی ہو اس نے اپنے مصاحبوں سے اس معاملے پر بات کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ جب وہ شہنشاہ بنا تو اس نے بتایا کہ جب وہ ایوان شاہی میں سنگی تابوت کے قریب کھڑا ہوا تھا تو اس پر ایک الہامی کیفیت طاری ہو گئی تھی جس میں اس پر اس کے مستقبل کے بارے میں انکشافات ہوئے تھے۔ سینٹ ہیلینا میں اپنی موت سے کچھ دیر قبل اس نے اہرام میں گزری ہوئی واردات کے بارے میں بتانا شروع کیا پھر کاندھے جھٹک کر خاموش ہو گیا۔ دوسری داستان کچھ اس طرح سے ہے کہ اہرام سے نکل کر نپولین محل میں چلا گیا۔ اس رات سوتے میں اسے اپنی خواب گاہ میں کسی کے حرکت کرنے کا احساس ہوا وہ چونک اٹھا۔ اس نے جلدی سے اپنی تلوار اٹھائی اور کمرے میں نظر دوڑائی۔ ایک کونے میں اسے بہت تیز روشنی دکھائی دی۔ پھر اچانک ہی وہ روشنی ایک سرخ شعلہ بدن آدمی میں ڈھل گئی۔

اس شعلہ بدن آدمی نے نپولین پر طعنوں کی بوچھاڑ کردی۔
"کون ہے نپولین" وہ بیٹھی ہوئی تند آواز میں بول رہا تھا۔ "اس کی مصر کی فتح دائمی نہیں ہے۔ اس کا بحری بیڑا اسکندریہ نہیں پہنچ سکے گا۔ میرے الفاظ یاد رکھنا نپولین دنیا میں امن قائم کرنے کے منصوبے بنانے کے لئے تمہارے پاس چار سال سے زیادہ کا عرصہ نہیں ہے" نپولین کے دورِ حکومت میں یہ شعلہ بدن آدمی وقتاً وقتاً اسے نظر آتا رہا۔ ساحروں کا دعویٰ ہے کہ سینٹ ہیلینا میں جلا وطنی تک نپولین اس سرخ شعلہ بدن آدمی کے آسیب میں مبتلا رہا تھا۔ جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو سنا ہے کہ نپولین نے اس آدمی سے کچھ اور مہلت دینے کی درخواست بھی کی تھی۔
"صرف ایک اور سال" پستہ قامت کورسیکن (نپولین) نے درخواست کی۔ "مجھے چند ماہ کا وقت اور دو اور میں وہی کروں گا جو تم چاہو گے" ماہرینِ نفسیات یہی توجیہہ پیش کریں گے کہ وہ شعلہ بدن آدمی ایک واہمہ تھا جو نپولین کے مجرم ضمیر کی پیداوار تھا۔ روحانیت کے ماہرین کے مطابق یہ مردوں کی دنیا سے آئی ہوئی کوئی پیش گو آتما تھی جو نپولین کو خبردار کرنے آتی تھی۔ مابعد الطبیعیات سے متعلق لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ "آقا" (Master) کا نمائندہ تھا۔ دنیا کے ان حکمرانوں کا نمائندہ تھا جو مبینہ طور پر خود کو دنیا کے قابلِ ذکر حکمرانوں کے طور پر ظاہر کرتے رہتے ہیں۔
یورپ کی انجمن تحقیق ساحری "The European Occult Research Society" نے نپولین کے اہرام میں اس نظارے کے بارے میں ایک اور ہی نظریہ پیش کیا ہے۔ "ہم جانتے ہیں کہ اہرام کی شکل سے انتہائی طاقتور اور توانائی کے انداز (Pattern) منسلک ہیں"۔ ٹی اونڈسن نے سوسائٹی کے بلیٹن میں لکھا۔ "نپولین نے شاید کچھ زیادہ ہی وقت ایوان شاہی میں گزار دیا چنانچہ ممکن ہے کہ اہرام کی توانائی کی لہروں نے اس کے دماغ میں برقی خلل پیدا کر دیا ہو۔ خلل نے اس کے شعور میں ایسی تبدیلی پیدا کر دی کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے مستقبل کی جھلکیاں دیکھنے کے قابل ہو گیا تھا"۔ نپولین کے مصر سے چلے آنے کے بعد اس کے دانشوروں اور علماء کی فوج کو برطانوی فوج نے گرفتار کر لیا مگر خوش قسمتی سے ان کے ساتھ عام آدمیوں کا سا برتاؤ کیا گیا اور انہیں اپنی محنت سے تیار کئے گئے پلندوں کے ساتھ فرانس جانے کی اجازت دے دی گئی۔ جب وہ لوگ فرانس پہنچے تو نپولین نے اہرام کے جامع مطالعہ کے منصوبے کا اعلان کر دیا۔ اگلے پچیس برسوں میں یہ لوگ چار سو نقاشوں اور سینکڑوں ناشرین اور مصوروں کی مدد سے ایک بڑا جامع مطالعاتی کام مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ "The Description de l'Egypt" صحیح معنوں میں مصر اور اہرام کے روایاتی علم کی ایک بیش قیمت انسائیکلو پیڈیا تھی۔ اس انسائیکلو پیڈیا کی نو جلدیں تحریر پر اور بارہ کتابیں مصوری اور اشکال پر مشتمل تھیں۔
مصریات کے سلسلے میں نپولین کا بنیادی کارنامہ مشہور زمانہ روزیٹا پتھر (Rosetta Stone) کی دریافت تھا۔ ایک گز لمبی پتھر کی یہ سل اس کے ایک کپتان کو دریائے نیل کے ڈیلٹا پر روزیٹا کے قریب ملی تھی۔ اس پتھر کے ایک جانب تصویری تحریر کندہ تھی۔ بعد میں یہ پتھر

انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا جنھوں نے اسے برٹش میوزیم کے مصری شعبہ میں رکھ دیا۔ دو دہائیوں (بیس برس) تک یہ پتھر وہیں سجا رہا یہاں تک کہ ایک فرانسیسی محقق جین فرینکوئس شیمپولین مصری تحریر کے معمے کو حل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی مدد سے دیگر محققین اس قابل ہو گئے کہ مصری ہیروغلافی کو جدید زبان میں ترجمہ کر سکیں۔

سولھویں اور سترہویں صدی کے درمیان یورپ میں طب کے شعبے میں ایک اور ضمنی یا اتفاقی آگاہی حاصل ہوئی۔ اس دور میں ممی کے گوشت کو ہمارے جدید دور کی اینٹی بایوٹک ادویات کے مماثل انتہائی طاقت ور اور صحت افزا دوا سمجھا جانے لگا۔ ممی کے گوشت کا ایک نوالا چبانا جسم کی اندرونی تمام بیماریوں کا شافی علاج خیال کیا جاتا تھا۔ کسی زخم یا جسم کی کسی بھی ٹوٹی ہوئی ہڈی پر ممی کا مکروہ گوشت رگڑنے سے اس زخم یا فریکچر کا فوری اور عام فہم علاج تصور کیا جانے لگا۔ چنانچہ جلد ہی ہر میڈیکل اسٹور پر ممی کے گوشت کا ڈھیر لگ گیا۔

بدقسمتی سے مصری ممیوں کے گوشت کی ترسیل محدود تھی۔ چالاک اور عیار لوگوں نے قبرستانوں اور مردہ خانوں سے لاشیں چرا چرا کر انھیں لپیٹ لپٹا کر ممیوں کی صورت میں فروخت کرنا شروع کر دیا۔ اٹلی کے ایک کاروباری گروہ نے روم کے زیرِ زمین قبرستانوں سے ابتدائی دور کے عیسائیوں کی لاشوں کی لوٹ مار مچا دی۔ جلد ہی رومی قبرستان اپنے قدیم مسکن سے محروم ہو گئے۔ جب ممیوں کے گوشت کی مانگ اور زیادہ بڑھی تو ہسپتالوں سے بھی لاشیں چرائی جانے لگیں۔ بہت سارے مریض خوفناک امراض یا حادثات سے جاں بحق ہو جاتے تھے۔ تاہم ان کی لاشوں کو رال یا نفت جیسے مادے میں بھیگے ہوئے کپڑوں میں لپیٹ کر کئی گھنٹوں تک تنور میں پکایا جاتا اور اس طرح مصنوعی ممیاں تیار کر لی جاتیں۔ اس ہیبت ناک اور مکروہ عمل کا نتیجہ ایک فوری ممی کی صورت میں نکلتا تھا۔

ممی بنانے والے یہ دغا باز لوگ چونکہ بیمار جسموں کی ممی بنایا کرتے تھے اس لئے ان ممیوں کا گوشت استعمال کرنے والے مریضوں کی بیماریاں ختم ہونے کے بجائے اور سنگین ہو جاتی

توتنخ آمن: یہ فرعون صرف ۹ برس کی عمر میں تخت پر بیٹھا، ان کی رہنمائی بڑی عمر کے اعلیٰ عہدیدار کرتے تھے۔ اس نے اقتدار میں آتے ہی اخناتن کے واحد خدا کے تصور کو ختم کر کے دوبارہ روایتی خداؤں کو بحال کیا اس حد تک کہ اخناتن اور ملکہ نیفرتتی کے نام قابلِ نفرت گردانے جانے لگے اور ان کی قائم کردہ عبادت گاہوں کو مسمار کر دیا گیا اور ساتھ ہی ان کی تحریر کردہ عبارتیں بھی مٹا دی گئیں۔ یہ مشہور طلائی ماسک توتنخ آمن کے اہرام سے ملا ہے۔

تھیں اس وجہ سے ممی سے علاج کا جوش جلد ہی سرد پڑ گیا اور آخر لوگوں نے اس طریق علاج سے کنارا کر لیا۔

اس عظیم اہرام کا ایک اور سیاح سی پی کیوگلیا (Caviglia) نامی اٹلی کا ایک مہم جو صوفی تھا۔ ایک مال بردار جہاز کا مالک تھا اور جزیرہ مالٹا میں رہائش پذیر تھا۔ ایک بار جب اس کا جہاز کسی مصر گاہک کا سامان اتار رہا تھا تو کیوگلیا سیر کے لئے گیزا کے اہراموں کی طرف نکل گیا۔ بلند وبالہ اہرام پر نظر پڑتے ہی کیوگلیا اس کے سحر میں مبتلا ہو گیا اور ان کھنڈرات کو کھنگالنے کے لئے گیزا رہ پڑا۔ "وہ عہدِ عتیق کے علوم کے دفینوں کا ایک ایسا پرجوش عقیدت مند تھا جس نے مصر مقبروں اور اہراموں کے پوشیدہ اسرار کو جاننے کے لئے اپنا ملک، اپنا گھر، اپنے دوست، اپنی دولت جاگیر سب کچھ قربان کر دیا"۔ اس کے ایک دوست نے لکھا۔ کیوگلیا اپنی گزر اوقات اور اپنی جستجو اخراجات کو پورا کرنے کے لئے مقبروں میں مصری تبرکات کی تلاش میں آنے والے سیاحوں کی کیا کرتا تھا۔ اس نے رہائشی اخراجات کم کرنے کے لئے اہرام میں ایک کمرے میں رہنا شروع کر تھا۔

اپنے سے پہلے آنے والے لوگوں کی طرح اٹلی کے اس مہم جو کو بھی اہرام میں کسی پوشید کمرے کے وجود کا یقین تھا۔ "وہ بڑا مذہبی آدمی تھا" انگلینڈ کے لارڈ لنڈسے (ord lindsay نے اس کے بارے میں لکھا۔ یہ لارڈ کیوگلیا کی کاوشوں میں اس کی مالی امداد کیا کرتا تھا۔ "مگر اس کے ذہن میں ایک بڑا ہی نادر خیال تھا کہ اسے یہاں کس چیز کی تلاش تھی۔ ایک بار اس نے مجھے بتایا اس نے اپنے تجربات کو انسان کی تمام تر قابلیتوں کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ وہ ساحری، حیوا مقناطیسیت اور مسائل محرمانہ (مخفی یا باطنی علوم) پر تجربات کر رہا تھا۔ اس نے کہا کہ ایک تجربے تو اس کی جان ہی لے لی تھی کیونکہ وہ انسانی ممنوعہ سرحدوں سے بھی آگے نکل جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کی نجات کا سبب محض اس کی نیت کی پاکیزگی تھا"۔

کیوگلیا جب عظیم اہرام کی پراسرار وادیوں میں اترنے کی کوشش کر رہا تھا تو اس کی ملاقات ایک انگریز فوجی افسر ہاورڈ وائس سے ہوئی۔ ہاورڈ وائس ایک سخت گیر آدمی تھا اور انسانوں سے نفرت کرتا تھا۔ اس میں حسِ مزاح کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ ۱۸۳۶ء میں مصر گیا تھا۔ ایک رات گھوڑے سوار چاندنی میں ڈوبے صحرا کی سیر کر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر عظیم اہرام پر پڑی اور کیوگلیا کی طرح وہ بھی اس سحر کا اسیر ہو گیا۔

"ان کی عہد رفتگی اور ان کی اصلیت کے بارے میں بے یقینی نے میرے تجسس کو ہوا دی" اس نے اپنے گھر انگلینڈ بھیجے گئے ایک خط میں لکھا۔ "ان کی ساخت و تعمیر کے سلسلے میں بڑا اسرار پوشید تھا۔ میرے ذہن پر اس اہرام میں موجود بے شمار راہداریوں اور لاتعداد کمروں کی تعمیر کے اسباب کی طرف سے شکوک و شبہات کا بھوت سوار ہو گیا۔ آدمی تصور نہیں کر سکتا تھا کہ اس قسم کی تعمیر میں اتنی زیادہ تعداد میں کمرے اور راہداریاں ہو سکتی تھیں۔"

عظیم رعمیس: تیرھویں صدی قبل مسیح میں رعمیس دوئم نے مصر پر حکومت کی اور ۶۷ سال اقتدار پر رہا۔ اس نے تمام فرعونوں سے زیادہ اہرام اور مجسمے بنوائیے۔ اس کی عمارتوں میں تھیبس کے مغربی کنارے پر واقع مدفن عمارات (اہرام) شامل ہیں جنہیں آج کل رعمیسئم کہا جاتا ہے، جہاں سے یہ سنگی مجسمہ دریافت ہوا، اس بادشاہ نے اپنے لیئے ہمیز کا تاج منتخب کیا جو کوبرا تاج سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ واضح رہے کہ یہ وہی فرعون تھا جس کے محل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش ہوئی تھی۔

وائس اہرام کی تحقیق و مطالعہ کے لئے مصر ہی میں رہنا چاہتا تھا۔ اس کے خاندان والے، اس تیز مزاج نوجوان کو خود سے دور رکھنے کی خاطر فوراً ہی اس کے منصوبے سے متفق ہو گئے۔ اگلے چار برسوں میں ہاورڈ وائس نے اہرام میں راستہ بنانے کے لئے اس کے بلاکوں کو توڑنے، اڑانے اور ڈرل کرنے میں تقریباً دس ہزار پونڈ خرچ کر دیئے۔ شروع میں اس نے کیوگلیا کے ساتھ مل کر یہ کام کیا مگر جلد ہی ان کی شخصیات کے تضادات ظاہر ہونے لگے اور ان میں ٹکراؤ ہو گیا۔ وائس کا خیال تھا کہ تبرکات کی تلاش میں سیاحوں کی مدد کر کے کیوگلیا اپنا وقت ضائع کر رہا تھا جب کہ تند مزاج اٹالین کی رائے میں یہ انگریز دولت مند تو ضرور تھا مگر اس کے دماغ کا خانہ خالی تھا۔

تلخ و ترش بحث مباحثہ کے بعد کیوگلیا نے پار شین کے آرام دہ اپارٹمنٹ میں منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا اور ایک دن اپنا سازو سامان سمیٹ کر اہرام سے رخصت ہو گیا۔ یوں گویا اس نے اہرام کے کھنگالنے اور اس کی تحقیق و تفتیش کا کام اس بد دماغ انگریز کے حوالے کر دیا تھا۔ ہاورڈ وائس کی ایک خاتون مداح نے اس کی کاوشوں کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔

"کرنل ہاورڈ وائس نے اس عظیم اہرام کو ایک ایسے قلعہ کی مانند سمجھ لیا تھا جس کا اس نے محاصرہ کر رکھا تھا۔ سردی اور موسم بہار اور مصر کے سلگتے ہوئے موسم گرما میں عرصہ بعد جب سارے سیاح چلے گئے تو وائس اس آپریشن کا واحد ڈائریکٹر بن گیا۔ وہی اپنے تمام کام کا کلرک تھا اور وہی اپنے سینکڑوں کارکنوں کا "پے ماسٹر"۔ دنوں کے بعد دن اور مہینوں پر مہینے گزرتے گئے یہاں تک کہ ان لوگوں نے وائس کے خیالات کے مطابق اہرام کی تفتیش و تحقیق کا کام مکمل کر لیا۔ وائس نہ صرف ان آدمیوں میں سے ایک تھا جو اپنی دھن کے اس قدر پکے ہوتے ہیں کہ کسی کام میں ہاتھ ڈالنے کے بعد اس کی تکمیل تک پیچھے ہٹنے کا تصور بھی نہیں کرتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے

خیالات بھی کٹر مذہبی آدمیوں جیسے تھے۔ وہ ایک پکا عیسائی تھا اور اس کا عقیدہ تھا کہ اس کام کے ۔
بھی اسے "ماسٹر" ہی نے مقرر کیا تھا گویا اس طرح وہ اپنے آقا ہی کی ایک عظیم خدمت سرانجام د۔
رہا تھا۔ ابتدا میں حالانکہ اسے اس کام کی بہتر تکمیل کے سلسلے میں اپنی قابلیتوں پر پورا یقین نہیں
چنانچہ اس نے بہتر سمجھا تھا کہ اس اٹالین کیو گلیا کی پیشہ ورانہ خدمات خرید لی جائیں مگر جب وہ اس ۔
شراکت کار میں ناکام ہو گیا تو خود بالکل بدل گیا۔ اب وہ غریب امیر سب کے لئے یکساں طور
پسندیدہ شخصیت بن چکا تھا۔ وہ اپنے کارکنوں کا خود ہر کام میں ہاتھ بٹا تا سنگی سلوں کو ان کے سات
کاندھا لگا تا اور جب تک کام ختم نہ ہو گیا اس نے اپنی اس نوساختہ خوش اخلاقی کا دامن ہاتھ سے
چھوڑا۔ اس نے اس دوران میں انصاف کے تقاضوں کو ہر امکانی حد تک پورا کیا۔ یہی وجہ تھی کہ ا
کے تمام عرب کارکن اس کا بے حد ادب اور احترام کرتے تھے اور ان کے ذہنوں پر وائس کی خو
اخلاقی کا دائمی اثر مرتب ہو کر رہ گیا تھا"

وائس کا ایک بڑا کارنامہ ایک ایسے کمرے کی دریافت تھا جس کی دیواروں پر کئی سرخ منقش
بیاضیں (Cartouches) (بیضوی حلقے جن پر شاہی نام اور القاب درج ہوں) جڑی ہوئی تھیں
بیضوی شکل میں کندہ یہ تحریریں فرعونوں کے چوتھے خاندان کے بادشاہ شی اوپس سے متعلق
تھیں۔ اسی قسم کی تحریریں پتھر کی اس کان میں دیکھی گئی تھیں جہاں عظیم اہرام کی تعمیر کے ۔
بھاری بھرکم سنگی سلیں تراشی گئی تھیں۔ ماہرین مصریات ابھی تک اس الجھن میں مبتلا ہیں کہ کہیں
اوپس نامی دو بادشاہ تو نہیں گزرے تھے یا کوئی اور ابتدائی دور کا بادشاہ تھا جس نے کان میں وہ تحریر
کندہ کرائی تھیں۔ ہیروڈوٹس کے مطابق تو یہی ایک شی اوپس تھا جس نے اس اہرام کو تعمیر کروایا تھ
دیگر قدیم مصنفین بھی شی اوپس ہی کو اس تعمیر کا بانی سمجھتے ہیں۔ وائس نے محسوس کیا کہ جیسے ا
نے اس اہرام کے تعمیری دور کی تاریخ کا تعین کر لیا ہو۔

وائس نے یہ بھی پتا چلا لیا کہ اہرام کی اصل عمارت غلافی پتھروں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس ۔
مصر میں قیام کے دوران تک اہرام کی عمارت کے گرد بیس تیس فٹ بلند ملبہ کھڑا ہوا تھا۔ اس انگر
نے یہ داستانیں بھی سن لی تھیں کہ ازمنہ وسطیٰ میں اہرام کے غلافی پتھروں Casing
(Stones کو اکھاڑ کر لے جایا گیا تھا۔

اس نے اپنے ایک فورمین کو اپنے اس کمرے میں بلایا جسے اس نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا ہوا تھا۔
"فوراً ہی اپنے مزدوروں کو اہرام کے گرد جمع ملبے کو ہٹانے پر لگا دو"۔ اس نے فورمین کو ح
دیا۔ "جب تک چاروں طرف یہ ملبہ جمع ہے میں اہرام کی بنیاد کا صحیح ناپ ہرگز نہیں لے سکتا"۔

جب مزدوروں نے وہ ملبہ ہٹایا تو انہیں بنیاد کے قریب جڑے ہوئے اصلی پالش شدہ لا
اسٹون کے دو غلافی پتھر مل گئے۔ "اب غلافی پتھروں کی بحث ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی" ہا
وائس نے اعلان کیا۔ بعد میں غلافی پتھروں کی تزئین، ساخت اور استعمال سے ایسا لگتا ہے جیسے یہ جد
زمانے کے کسی بصری آلات ساز کی ہنرمندی کا کمال ہو۔ ان پتھروں کے جوڑ مشکل دکھائی دیتے ا

بس اتنے ہی کشادہ تھے کہ چاندی کے ورق کی موٹائی بھی ان کے سامنے کچھ زیادہ ہی تھی۔ وہاں ایک روش بھی ملی تھی جس کے ساتھ ساتھ یہ عمارت ایستادہ تھی۔ اس روش کی ہمواری اور ساخت اس قدر ٹھیک اور خوبصورت تھی کہ اس سے بہتر کا تصور ممکن نہیں تھا۔ میرے خیال میں ایوانِ شاہی، روش اور غلافی پتھروں کی ساخت میں جس ہنر اور کمال کاریگری کا مظاہرہ کیا گیا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے"۔

غلافی پتھروں کے مل جانے کے بعد وائس نے انہیں دوبارہ وہیں ڈھک دیا۔ انہیں برطانوی عجائب گھر (برٹش میوزیم) میں جہاز کے ذریعے لے جانے کے لئے اسے مصری حکومت کی خاص اجازت کی ضرورت تھی۔ ابھی وہ مصری مجاز حاکم سے اس اجازت کا منتظر ہی تھا کہ کچھ عربوں نے وہ پتھر دوبارہ نکال لئے اور ان کے کناروں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ "یہ عرب بڑے حاسد لوگ ہوتے ہیں" وائس نے لکھا۔ "انہوں نے سن لیا تھا کہ ان پتھروں کی عیسائی قوم میں نمائش کی جائے گی اور انہیں وہیں رکھا جائے گا سو انہوں نے انہیں توڑ کر بد شکل بنا دیا تاکہ یہ مصر کی سرزمین سے نہ لے جائے جائیں"۔

اپنے عرب کارکنوں کے ساتھ سخت انصاف پرور ہونے کے باوجود بھی یہ بد مزاج انگریز ان لوگوں کی تخریب کاری کا شکار ہو گیا۔ ۱۸۴۰ء میں اس درماندہ وکٹورین بھلے مانس نے اپنے تمام عرب کارکنوں سے چھٹکارا حاصل کیا۔ اپنے نوٹس اور سامان سمیٹا اور اپنے وطن لوٹ آیا۔ اس نے اپنی تحقیقی کاوشوں پر مشتمل ایک کتاب "Operations Carried on at Pyramid at the Giza in 1837" نامی لکھی جسے بعد میں ذاتی طور پر اس کے خاندان والوں ہی نے شائع کروائی۔ اس کے ایک نائب نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی جس کا نام "The Pyramid of Giza from Actual Survey and Measurement on the Spot" تھا۔ ان دونوں افراد کی کی گئی پیمائشیں اس وقت تک درست ترین سمجھی جاتی تھیں۔ ان کی کتابوں کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ ان کی مقبولیت دیکھ کر دوسرے محققین نے بھی پیمائش کا کام شروع کر دیا جس کے نتیجے میں اہرامیات کی متنازع سائنس کی بنیاد پڑی اور آج تک عظیم اہرام سے متعلق حقائق، نصف حقائق اور الٹی سلٹی باتوں اور نظریات کا سلسلہ جاری ہے۔

☆

ماہرینِ اہرامیات کی پیش گوئیاں

پوشیدہ خلوت گاہیں!
تبت کی جانب مخفی سرنگیں!
دوسری دنیاؤں کے فوق الانسانی معمار!
ٹائی ٹن جناتوں کا دور!
حجرات میں پیشین گوئی!

یہ اور اس قسم کے دیگر نظریات عظیم اہرام سے منسلک پر اسرار روایات کا ایک حصہ ہیں۔ عظیم اہرام کی اصلیت، مقاصد اور طرزِ تعمیر ہمارے تصور کو مختل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ یہ وہ چھتری ہے جس نے زماں ومکاں کی پہنائیوں میں دور تک پھیلی ہوئی سرحدوں میں موجود ساحری کے عقیدت مندوں کو اپنے سایہ میں لے رکھا ہے۔ قدیم ہیئت اور اڑن طشتریوں کے وجود پر یقین رکھنے والے لوگ اس امکان کو مسترد نہیں کرتے کہ اس اہرام کی تعمیر غیر ارضی مخلوق کا کارنامہ ہے۔ اٹلانٹک کے ماہرین نے اس بات کا امکان بھی ظاہر کیا ہے کہ اس کے پوشیدہ حجروں میں قدیم روایتی تہذیب وتمدن کا بیش بہا خزانہ چھپا ہوا ہے۔ زمین کے کھوکھلا ہونے کے نظریات کے حامل لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں گمشدہ نسلوں، زیرِ زمین شہروں اور اہراموں کو ایک دوسرے سے ملانے والی سرنگوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔

ہم چاہے ساحری، مذہب، مابعدالطبیعیات یا ریاضی میں سے کسی بھی عقیدے کے حامل ہوں عظیم اہرام کو اپنے نظریات کے مطابق ڈھال لیتے ہیں اور یہ حال "لندن آبزرور" کے ایڈیٹر جون ٹیلر کا بھی تھا جو ایک ماہر فلکیات ہونے کے ساتھ ساتھ ممتاز ریاضی داں بھی تھا۔ کرنل ہاورڈ وائس (Howard Vyse) جب اپنی مصری مہم سے واپس آیا تب جون ٹیلر لندن میں اپنے اخبار کی ایڈیٹنگ کر رہا تھا۔ وائس کی کتاب کے شائع ہوتے ہی ٹیلر نے اہرام کے چھوٹے چھوٹے ماڈل بنانا اور ان کے ریاضی اور ہندسی (Geometrical) تناسب دریافت کرنے کا کام شروع کر دیا۔

ٹیلر نے اس امید میں کہ وائس کے دیئے ہوئے اعداد کی مدد سے وہ اس کے نظریات میں کوئی نہ کوئی ربط دریافت کر لے گا کئی شوقین معاونین کے ساتھ یہ کام شروع کیا تھا۔ "ان اعداد میں کوئی نہ

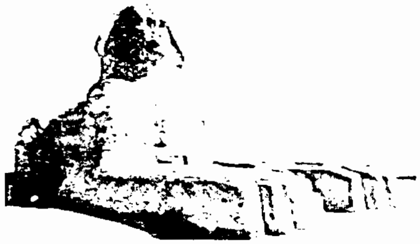

غزہ پر واقع عظیم اسفنکس: آدھے انسان اور آدھے شیر کی شکل کا یہ بڑا مجسمہ ۴۵۰۰ سال پہلے بنایا گیا جسے فرعون خافرے اور اس کے اہرام کی نگرانی کے خیال سے تعمیر کیا گیا تھا۔

کوئی مربوط نظام ضرور پوشیدہ ہے" ٹیلر کا خیال تھا۔

"مگر یہ اعداد مستقل نہیں ہیں"۔ اس کے ایک معاون نے احتجاج کیا۔ "بنیاد کی لمبائی ہی لے لیں۔ جب گریوس وہاں تھا تو یہ لمبائی ۶۹۳ فٹ تھی اور جب اس فرانسیسی نے اس کی پیمائش کی تو وہ ۷۶۳ء۶۲ فٹ نکلی۔ لگتا ہے مصر میں کوئی چیز یکساں حالت میں نہیں رہتی"۔

اچانک ہی ٹیلر کے ذہن میں ایک خیال آیا "یہ ریت اور پتھر روڑوں کی وجہ سے ہے"۔ اس نے کہا "لوگ برسوں سے ان کے گرد پھیلا ملبہ ہٹا رہے ہیں۔ جب وہ کسی جگہ کا ناپ لے لیتے ہیں تو پھر اس سے نیچے کھدائی شروع کر دیتے ہیں"۔

حالانکہ ٹیلر نے کبھی اہرام نہیں دیکھا تھا مگر اس کا یہ خیال بڑا درست تھا۔ جتنا اس کا کام آگے بڑھتا گیا اتنا ہی وہ ہیروڈوٹس کی کتاب "History" کو زیادہ دلچسپی سے پڑھتا گیا۔ "اس کی بھی ایک وجہ ہے کہ کیوں غزہ اہرام کے معماروں نے اطراف کے زاویوں کی پیمائش ۵۱ ڈگری ۵۱ فٹ رکھی تھی"۔ ٹیلر نے اپنے ایک نائب کو بتایا "مصری راہبوں نے ہیروڈوٹس کو بتایا تھا کہ اس کے اطراف کا رقبہ برابر ہے اہرام کی بلندی کے مربع کے۔ کیوں؟"

یہ بحث کئی روز تک چلتی رہی اس دوران میں ٹیلر اعداد کے ایک کالم کا مطالعہ اور تجزیہ بھی کرتا رہا۔ اس رات اس نے دریافت کیا کہ اہرام کے احاطے یا محیط کو اس کی بلندی سے تقسیم کرنے سے جواب تقریباً ۱۴۴ء۳ آتا تھا۔ "یہ تو پائی سے بہت قریب ہے۔" وہ حیرت سے بولا اسے علم تھا کہ پائی کے اعداد ۱۴۱۵۹ء۳ تھے۔ "یہاں ضرور ریاضی کا کوئی تناسب موجود ہے۔ پائی کے اعداد سے اس قدر قریب اعداد کا حاصل ہو جانا محض اتفاق نہیں ہو سکتا"۔

ٹیلر نے دلیل دی کہ جیسا کہ دائرے کے نصف قطر اور اس کے محیط میں ایک تناسب ہوتا ہے اس طرح کا تعلق گیزا کے اہرام کی بلندی اور اس کی بنیاد کے محیط میں بھی موجود ہے۔ ایک نائب نے احتجاجاً کہا۔ "اس کا مطلب تو یہ ہے کہ یہ قدیم مصری ایڈوانس ریاضی سے واقف تھے"۔

ٹیلر نے ایک آہ بھری۔ "اس دور کے مصر میں جو کچھ ہو رہا تھا"۔ وہ بولا "مجھے تو پائی کے اس تناسب کا راز جاننا ہے"۔

یہ دراز قامت نحیف و نزار ایڈیٹر دن بھر اپنے دفتر میں کام کرتا رہتا اور رات کو اپنے مقالہ کی تیاری کی خاطر اپنے گھر کی لیبارٹری میں گھسا رہتا۔ پھر وہ جلدی جلدی کھانا کھا کر اپنے دو نائبین کے

ساتھ کانفرنس کرنے بیٹھ جاتا۔ ایک رات اس نے ایک عجیب بات کہی۔ ''اس عظیم اہرام کی تعمیر میں ساری زمین کی پیائش کا راز پوشیدہ ہے''۔ اس نے کہا: ''ان قدیم مصریوں کو علم تھا کہ زمین گول ہے۔ وہ آنے والی نسلوں کے لئے اس کا ایک مستقل ریکارڈ چھوڑ کر جانا چاہتے تھے''۔

''انہیں اس بات کا علم کیسے ہو سکتا تھا؟'' ایک نائب نے پوچھا۔

انھوں نے سطحِ زمین پر چاند اور سورج کی گردش کا نقشہ بنایا تھا''۔ ٹیلر نے کہا۔ ''اس کے حساب سے وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ زمین گول ہے''۔ وکٹورین دور سے قبل اس قدر ترقی یافتہ سائنس کے وجود کا خیال ہی ٹیلر کے لئے بڑا پریشان کن تھا۔ ایک راسخ العقیدہ عیسائی ہونے کی وجہ سے اسے اپنے دور کے مذہبی رجحانات اور عقائد پر پورا یقین تھا۔ اس دور کے پادریوں کے بیان کے مطابق حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کی تخلیق چار ہزار سال قبل مسیح میں ہوئی تھی اور طوفان نوحؑ کے بارے میں ان کا عقیدہ تھا کہ وہ ۲۴۰۰ ق م میں آیا تھا۔ ان بیانات کی روشنی میں ٹیلر یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ کشتی نوحؑ جیسی ناپختہ تخلیق سے چند نسلوں قبل عظیم اہرام جیسی تخلیق کیسے ممکن ہو سکی تھی۔

ایک صبح اتوار کی دعا کے بعد ٹیلر نے گرجا گھر میں اپنے پادری کے سامنے یہ مسئلہ رکھا تو اس نے جواب دیا ''شاید الوہی مداخلت کے باعث ممکن ہو سکا تھا''۔ اپنی کتاب "The Great Pyramid: Why Was It Built and Who built it? (یہ اہرام عظیم کس نے بنایا کیوں بنایا؟) میں اس نے الوہی مداخلت کے نظریئے کی بڑی صراحت کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اہرام کے معماروں کو اسی طرح الوہی رہنمائی حاصل تھی جیسے حضرت نوحؑ کو اپنی کشتی کے سلسلے میں اللہ کی طرف سے ملی تھی۔ اس نے لکھا ''امکان نظر آتا ہے کہ ابتدائی دور کے معاشروں میں چند انسانوں کو خالق کی طرف سے غیر معمولی ذہانت ودیعت کی گئی تھی جس کی وجہ سے وہ باقی لوگوں سے ممتاز اور منفرد ہو گئے تھے''۔

اس انتہائی مذہبی دور میں اسرائیل کے گمشدہ قبائل کی طرف کچھ زیادہ ہی توجہ دی جارہی تھی۔ ٹیلر کا خیال تھا کہ یہ قبائل برطانیہ میں آکر آباد ہو گئے تھے اور اپنے ساتھ کسی قدر چھوٹا برطانوی انچ کا پیمانہ بھی لے آئے تھے۔ ''اپنی قید و بند اور آوارہ گردی کے دوران انہوں نے قدیم مصری ذہانت کو برقرار و محفوظ رکھا تھا۔ یہ اس سلسلے کی منتخبہ نسل تھی جس کا تعلق حضرت ابراہیمؑ سے جا ملتا تھا اور وہ حضرت نوحؑ سے زیادہ قریب تھے''۔

سائنس دانوں نے جب اس کے نظریات کی تردید کی تو ٹیلر کو بہت دکھ پہنچا۔ اس نے اپنے الوہی انکشافات والے نظریئے کو ثابت کرنے کے لئے پھر بائبل سے رجوع کیا اور کئی ایسے پیراگراف کا حوالہ دیا جن میں اہراموں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ اس نے Job ۳۸: ۵-۷ کو نقل کیا جس میں کہا گیا تھا ''کس نے پیائش کی بنیاد رکھی۔ اگر تو جانتا ہے؟ یا کس نے خط پہ خط جمایا؟ یا کس نے سنگ بنیاد رکھا جب صبح کے ستارے گیت گا رہے تھے اور خداوند کے تمام بیٹے خوشی سے چلا رہے تھے؟'' اسے Isaiah ۱۹: ۱۹-۲۰ میں ایک اور پیراگراف مل گیا جس میں بتایا گیا تھا ''اس دن

سرزمینِ مصر کے وسط میں خداوند کے لیئے قربان گاہ ہوگی اور یہ میزبانوں کے خداوند کے لئے گواہی اور علامت کا کام دے گی"۔

ٹیلر کو پکا یقین تھا کہ سینٹ پال نے Ephesians ۲: ۲۰-۲۱ میں عظیم اہرام ہی کی طرف اشارہ کیا ہے "خود یسوع مسیح اول سنگ بنیاد ہے۔ جس میں تمام عمارات کی ساخت موجود ہے اور اس نے خداوند کے مقدس مندر کی بنیاد ڈالی"۔

"عظیم اہرام گرجا گھر کی صحیح ترین علامت ہے"۔ ٹیلر نے اعلان کیا "اور یسوع مسیح پہلے سنگ بنیاد کی نشانی ہیں"۔

اگر چارلس پیازی اسمتھ اہرام کی منظر نگاری میں شامل نہ ہو جاتا تو ٹیلر کے نظریئے کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا۔ اسکاٹ لینڈ کے شاہی نجومی اور ایڈنبرگ یونیورسٹی کے پروفیسر پیازی اسمتھ نے ٹیلر کی کتاب پڑھی تو قائل ہو گیا کہ ضرور اہرام میں کوئی ایسی بات ہو گی۔ ٹیلر کی زندگی تک وہ اس سے خط کتابت کرتا رہا اور پھر اس کی وفات کے بعد خود مصر کی مہم پر روانہ ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب امریکہ میں خانہ جنگی عروج پر تھی اور ۱۸۶۵ء کا مصر امریکہ میں روئی کی کمی کے سبب دولت میں کھیل رہا تھا۔

ٹیلر کی طرح پیازی اسمتھ بھی ایک راسخ العقیدہ عیسائی اور صحیح معنوں میں وکٹورین جنٹلمین تھا۔ مقام اہرام پر کئی ماہ کی کاوشوں کے بعد اس نے اہرامی انچ دریافت کیا اور دعویٰ کیا کہ یہی وہ مقدس ذراع (Sacred Cubit) تھا جس کی نیوٹن کو تلاش تھی۔ اسمتھ کا انچ ۲۵ انچ کے غلافی پتھر کا ایک حصہ تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ الوہی ناپ تھا جو

تھٹموسس چہارم: یہ بادشاہ اس حوالے سے معروف ہوا کہ اس نے غزہ پر واقع عظیم اسفنکس کو اس کے ارد گرد جمع شدہ صحرا کی ریت سے چھٹکارہ دلایا اور اس کے سامنے حفاظتی بند تعمیر کروائے۔ اس پیتل کے مجسمے میں وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا ہے اور دونوں ہاتھوں میں مقدس مائع کے پیالے لیئے ہوئے ہے اس کے سر کی حفاظت کوبرا دیوی ودجیت کر رہی ہیں جس کی شبیہہ اس کے تاج پر کندہ ہے۔ صرف وہ بادشاہ اور ملکائیں کوبرا کی نشانی والا تاج پہنتے تھے جن کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ دشمن کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔

اس عظیم یادگار کی عمارت میں استعمال کیا گیا تھا۔ ٹیلر کی طرح اسمتھ بھی اسی ناپ کو برطانوی انچ کی بنیاد سمجھتا تھا۔

"اسمتھ نے اہرامی مصر پر کچھ زیادہ ہی زور دیا تھا" روزن برگ نے لکھا۔ "تاہم مصر کی مہم کے

دوران میں نے اس سے کچھ اور غلافی پتھر کھود نکالے۔ چوڑائی میں یہ پتھر اس پتھر سے بالکل مختلف تھے جنہیں اسمتھ نے اپنے انچ کی بنیاد بنایا تھا"۔

اپنے دریافت شدہ انچ کے سہارے اسمتھ نے ریاضی کی دیگر حقیقتوں کو جاننے کے لئے پورے اہرام کو کھنگال ڈالا۔ اپنی ان کاوشوں کے نتائج اس نے اپنی کامیاب ترین کتاب Our Inheritance in the Great Pyramid (عظیم اہرام میں ہمارا ورثہ) کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کر دیئے۔ اس کتاب کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اس کتاب کے چھ سو صفحات محض پیائشوں کے لئے مختص ہیں۔ اپنے اہرامی انچ کی مدد سے اسمتھ نے کئی فارمولے بنائے جن سے زمین کی کثافت، سورج سے زمین کا فاصلہ اور دیگر معلومات کا پتا چلتا ہے۔

اسمتھ پہلا آدمی تھا جس نے اعلان کیا تھا کہ یہ اہرام پتھروں کی زبان میں الہام گوئی ہے۔ اس نے انگریز مصنف رابرٹ میزیز کے اس نظریئے کی بھی وضاحت کی ہے کہ اہرام کی راہداریوں میں انسانی تاریخ کے اوراق بکھرے پڑے ہیں۔ "اسمتھ کا خیال تھا کہ ایک سال ایک اہرامی انچ کے برابر ہے" ڈاکٹر روزن برگ نے کہا۔ "اسمتھ کا خیال تھا کہ دنیا کی تخلیق ۴۰۰۴ قبل مسیح میں ہوئی تھی۔ طوفان نوح، عظیم تباہی، اہرام کی تعمیر کا دور سب کچھ اس کی راہداریوں میں پوشیدہ ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ عظیم گیلریوں کی تعمیر کی ابتداء حضرت عیسیٰ کی پیدائش کی نشاندہی کرتی ہے"۔ گرانڈ گیلری میں دوسرے تینتیس انچ حضرت عیسیٰ کے کفارے کی علامت ہے۔ ان کا نزول ان کا پھر سے نازل ہونا۔ اگر اس پیائش کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ کوئی ۱۸۸۲ء اور ۱۹۱۱ء کے درمیان کا زمانہ نکلتا ہے۔ یہ انیس سال کا درمیانی عرصہ ان کی دوبارہ آمد کا دور سمجھا گیا ہے۔

اسمتھ کی کتاب نے اس کے نظریات کو پوری مغربی دنیا میں پھیلا دیا۔ تقریباً ہر ملک کے جوشیلے افراد ان نظریات پر ایمان لے آئے اور اس طرح اہرامیات کی جعلی سائنس کی بنیاد پڑی۔ پیرس کا ایبی مونیگو اس کا پرجوش مبلغ بن گیا اور اپنے مضامین کے ذریعے اہرامیات کا پرچار کرنے لگا۔ انگلینڈ میں بیسیوں گروپ ایسے بن گئے جو برطانوی انچ کو واپس "مقدس ہیبر یوزراع" کے ناپ پر لانے کا مطالبہ کرنے لگے۔ جرمنی میں انجینئروں کا ایک گروہ تازہ واقعات کو اسمتھ کے نظریات کی روشنی میں ڈھالنے کے لئے ہفتہ وار اجتماع کرنے لگا۔

امریکہ میں International Institute for Preserving and Perfecting Weights and Measurements نامی ادارہ کی بنیاد پڑی۔ صدر امریکہ جیمز گارفیلڈ اس ادارے کا پرجوش رکن تھا حالانکہ اس نے اس ادارے کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شمولیت سے انکار کر دیا تھا۔ یہ گروہ اہرامی انچ کو "کرسچین ناپ" کے طور پر استعمال کا حامی تھا اور فرانس کے کافرانہ میٹرک سسٹم کا سخت مخالف تھا۔

پھر تو ہر شخص نے اس نظریہ کو کیش کرانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ سینٹ لوئی کے ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور نے اشتہار جاری کیا! "کھرے عیسائی ناپ ہیبر یو پونڈ کے ساتھ" سیاستداں

"خدا کا کھرا پونڈ" کی باتیں کرنے لگے۔ پادریوں نے اسمتھ کے اہرامی انچ پر طویل وعظوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ناپ تول خدا کی الوہی منصوبہ بندی میں انسانیت کا لازمی حصہ ہے۔ اخباری اداریوں میں قانون سازوں کی بے ایمانی کے چرچے ہونے لگے کہ وہ اس خدائی ناپ کو تبدیل کرنے کی سازشیں کر رہے ہیں۔

سنڈے اسکول کی کلاسوں میں تو اس موضوع پر باقاعدہ گیت بھی بن گئے اور گائے جانے لگے۔ ان کا مفہوم کچھ یوں تھا

"یہ میٹرک نظام جھوٹا ہے۔ اسے غیر ملکی لوگوں نے بنایا ہے۔ ہم اپنے فادر گاڈ کی پرستش کرتے ہیں اور اس کے پیمانے کو مانتے ہیں۔ ایک مکمل انچ ایک مکمل پنٹ اور اینگلو کا کھرا پونڈ۔ دنیا پر یہی قائم و رائج رہے گا۔ اس وقت تک جب آخری گجر بجے گا"۔

فرعون: اس طلائی مجسمے میں بادشاہ کے سر پر شاہی تاج پہنایا ہوا ہے جو اس وقت پہنا جاتا تھا جب دربار میں فیصلے سنائے جاتے تھے ساتھ ہی لوگوں پر دہشت بٹھانے کے لیئے یہ تاج پہنے فرعون سواری بھی کیا کرتے تھے اور شکار کے دوران بھی اسے پہنے رہتے تھے جس پر کوبرا ناگ دیوی کی تصویر کندہ ہوتی تھی۔

کلیو لینڈ کے ایک میگزین "دی انٹر نیشنل اسٹینڈرڈ" نے قوم کو بڑے زور شور سے "مقدس ہیبریو ناپ" کی طرف راغب کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس میگزین نے اپنی پہلی اشاعت کے ایڈیٹوریل میں لکھا "ہمیں یقین ہے کہ ہم خدائی کام کر رہے ہیں۔ ہم خود غرض یا کرائے کے ٹٹو نہیں ہیں۔ ہم ہر قسم کی ذاتیات سے بلند ہیں۔ ہم ذاتی مخاصمت کے خلاف ہیں مگر ہم اعلان کرتے ہیں کہ فرانسیسی میٹرک نظام کی مخالفت ہمارا مشن ہے۔ جاہلوں کا تمسخر اور حاسدوں کی بد زبانی ہمیں اپنے راستے سے نہیں ہٹا سکتے۔ یہ معیار کی جنگ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ سچائی، آزادی اور عالمی برادری کے نام پر جو جھنڈا ہم نے بلند کیا ہے اور جس کی بنیاد کھرے اوزان اور کھری پیمائش پر ہے، خدا کو مقبول ہوگا اور سدا بلند رہے گا" اور اس طرح یہ جنگ برسوں تک جاری رہی۔

اہرامیات کا ایک نومرید (Convert) پنسلوانیا کا ایک پادری چارلس تازی رسل تھا جس نے ایک مذہبی فرقے "شاہدینِ یہوواہ" Jehovah's Witnesses کی بنیاد رکھی تھی۔ اس نے بڑے جوش و جذبے سے اسمتھ کی کتاب کا مطالعہ شروع کیا پھر اہرام سے متعلق بائبل کی پیش گوئیوں والی کتابیں خرید ڈالیں۔ آخر ۱۸۹۱ء میں اس نے خود اپنی ایک کتاب "مطالعۂ عہد نامہ قدیم و جدید" شائع کی جس میں اس نے دوسرے مصنفین کی طرح عظیم اہرام کی پیمائشوں کو بائبل کی

تعلیمات سے مربوط کرنے کی کوشش کی تھی۔

رسل کا خیال تھا کہ ''حضرت عیسیٰ کی دوسری آمد ۱۸۷۴ء میں ہوئی تھی۔ لوگ اس واقعہ کے بارے میں نہیں جان سکے کیونکہ حضرت عیسیٰ غیر مرئی شکل میں آئے تھے۔ اس وقت سے ۱۹۱۴ء تک یعنی ان چالیس برسوں کے دوران میں فصل کی کٹائی تمام ہوئی اور ہزار سالہ سنہرا دور شروع ہو گیا۔ یہ سنہرا دور ۱۹۱۴ء سے شروع ہو گا۔ مردے زندہ ہو جائیں گے جو عیسائیت قبول کر لیں گے انہیں ایک اور موقع ملے گا جو گناہ گار ہو گا برائیوں سے تائب نہ ہو گا وہ ختم کر دیا جائے گا۔ رسل کے فرقے کے لوگ ہمیشہ ایک ایسی دنیا میں زندہ رہیں گے جو گناہوں سے' ہر قسم کی برائی سے اور ہنگاموں سے پاک ہو گی۔ وہ جنت ارضی میں شاد و آباد رہیں گے''۔

رسل کے شاہدینِ یہوداہ، فرقے کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ ''لاکھوں جواب زندہ ہیں کبھی نہیں مریں گے'' یہ ان کا نعرہ بن گیا انہیں ۱۹۱۴ء کا انتظار تھا جب یہ دور شروع ہونے والا تھا۔ بد قسمتی سے پہلی جنگ چھڑ گئی اور ان کا یہ ہزار سالہ سنہرا دور التوا میں پڑ گیا۔ فرقے کی رکنیت کی رفتار سست ہو گئی اس کے ساتھ ہی ساتھ رسل کی پیش گوئیوں پر مبنی نئی کتابیں پریسوں میں پہنچنے لگیں۔ رسل کا دعویٰ کہ یہ دور ۱۹۱۵ء سے پہلے پہلے شروع ہو جائے گا بدل کر اس طرح ہو گیا کہ ۱۹۱۴ء کے بعد بہت جلد سنہرا دور آنے والا ہے۔ رسل کے بعد اس فرقے کا جانشین جے ایف رتھر فورڈ بنا۔ اس نے کئی انداز میں دعویٰ کیا کہ ملنیئم (سنہرا دور) ۱۹۲۵ء سے شروع ہو گا اور جب یہ دعویٰ بھی جھوٹا ہو گیا تو رتھر فورڈ اپنے ساتھیوں کو بڑی ذہانت سے اہرامیات سے دور لے گیا۔ یکم دسمبر ۱۹۲۸ء کو دی واچ ٹاور ہیرالڈ'' میں رتھر فورڈ کے نظریات شائع ہوئے کہ عظیم اہرام دراصل شیطانی کارنامہ تھا۔ سینگوں والے شیطان نے یہ اہرام دنیا کو بائبل کی سچائیوں سے دور لے جانے کے لئے بنایا تھا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ اہرام کا مطالعہ اور تحقیق وہی لوگ کرتے ہیں جو خدا اور بائبل کی تعلیمات کے منکر ہیں۔ آج شاہدینِ یہوداہ (عیسائی فرقے کے وہ اراکین جو آنے والے ہزار سالہ عہد اور خدا کی مذہبی حکومت پر یقین رکھتے ہیں) اہرام سے متعلق بائبل کی پیش گوئیوں سے جو رسل کے ذہن کی اختراع تھیں' دور بھاگتے ہیں۔ امریکہ کے ایک اور گروہ نے عظیم اہرام کو اپنے عقائد کی بنیاد سمجھنا جاری رکھا۔ یہ اینگلو اسرائیل تنظیم کے لوگ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ گال اور اینگلو سیکسن قومیں ہی اسرائیل کے گمشدہ قبائل کی اولادیں ہیں چنانچہ ہم ہی ان وعدوں کے وارث ہیں جو خدا نے اپنے بندے ابراہیمؑ سے کئے تھے۔ حال ہی میں انہوں نے ایک ماہوار جریدہ The Destiny Editorial Letter کے نام سے نکالا ہے۔ ہاورڈ بی رینڈ جو اہرام کی پیش گوئیوں سے متعلق کئی کتابوں کا مصنف ہے اس رسالے کا ایڈیٹر ہے۔ اپنے ایک جریدے میں رینڈ نے لکھا کہ غزہ کا عظیم اہرام خدا کا ستون اور قربان گاہ ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اہرام کا جغرافیائی محل وقوع وہی جگہ ہے جس کی طرف بائبل کے بنی عذرا نے مصر کی قربان گاہ والی آیت میں اشارہ کیا ہے۔

رینڈ کا کہنا ہے کہ مشرق کے علماء جو ماہرین فلکیات بھی تھے تصویری الفاظ کو سمجھنے کی پوری صلاحیت

رکھتے تھے۔ عظیم اہرام میں پوشیدہ ریاضی کے اعداد بائبل کی تاریخ نگاری کی تائید کرتے ہیں۔ اس کا ایمان ہے کہ اس عظیم یادگار میں موجود تصویری حروف اور ریاضی کے اعداد آنے والے زمانوں میں ظاہر ہونے والے واقعات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ میساچوسٹس گروپ سے تعلق رکھنے والے ایک انگریز انجینئر ڈیوڈسن نے ایک معرکتہ الآرا کتاب "عظیم اہرام اور الوہی پیغام" لکھی ہے۔ اس نے پیازی اسمتھ کے تخمین و شماریات کی مدد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اینگلو سیکسن کے ابتلاء کا زمانہ ۱۹۲۸ء سے شروع ہوگا۔ یہ دور ۱۹۳۶ء تک جاری رہے گا جب اینگلو سیکسن (سچے اسرائیلی) کو خدا دنیا کی بڑی طاقتوں کے خلاف جو اسرائیلوں کو مٹانے پر تلے ہوں گے اپنی حفاظت میں لے لے گا۔ ڈیوڈسن کی یہ کتاب ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی تھی اور ہم جانتے ہیں کہ یہ واقعات بھی کبھی ظہور پذیر نہیں ہوئے۔

ایک اور کتاب "Great Pyramid: Proof of God" کے نامی ڈیسٹنی پبلشر نے شائع کی ہے جس کا مصنف جارج ریفرٹ ہے۔ اس کتاب کا اب بارہواں ایڈیشن آیا ہے۔ پہلی بار یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں چھپی تھی۔ ریفرٹ نے ۱۶ ستمبر ۱۹۳۶ء کے دن کو بڑا اہم بتایا تھا۔ جب یہ دن بھی بغیر کسی قابل ذکر سانحے کے گزر گیا تو ریفرٹ نے اپنی کتاب میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔ "اس دور کی نشاندہی جو ۱۶ ستمبر ۱۹۳۶ء سے شروع ہونے والا ہے بڑا گھمبیر مسئلہ ہے" اس نے لکھا تھا اس دن کا اہم ترین واقعہ یہی تھا کہ انگلینڈ کے بادشاہ ڈیوک آف ونڈسر نے اپنے وزیرِ اعظم مسٹر بالڈون کو اطلاع دی تھی کہ وہ مسز سمپسن سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

اس نے اپنے نئے باب میں لکھا "۱۹۵۳ء تک یہ وحشیانہ تہذیب، دولت کے بل بوتے پر قوموں کا استحصال، یہ سرمایہ دارانہ نظام دم توڑ دے گا۔ ایک حشر برپا ہوگا اور نیا سماجی اور معاشی نظام New Social or Economic Order آمریت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا۔ اگلو سیکسن قوموں کو خدا دنیا بھر کی حکمرانی عطا فرمائے گا۔ بادشاہوں کے بادشاہ حضرت عیسیٰ دوبارہ ظہور پذیر ہوں گے اور ہزار سالہ عہد مسرت شروع ہو جائے گا"۔

معزز خاتون: فرعونوں کے دربار میں کام کرنے والے بڑے عہدیداروں کی بیگمات کا مرتبہ بہت اونچا تھا۔ انہوں نے اپنی ہم پیشہ خواتین کی ایک قسم کی انجمن دیوی ہتحور کی زیر سرپرستی بنا رکھی تھی۔ یہ درباری معزز خاتون بھاری بھرکم وگ پہنے ہاتھ میں پھولوں کا گلدستہ سینے سے لگائے کھڑی ہے جبکہ دوسرے ہاتھ میں ایک پھول ہے جو محبت کی علامت ہے اور اس نے بہترین چنت کیا ہوا لباس پہنا ہوا ہے جس کے چاروں طرف جھالر لگی ہوئی ہے۔

۲۰ اگست ۱۹۵۳ء کو دنیا میں ہونے والا واحد قابل ذکر واقعہ روس کا یہ اعلان تھا کہ ایک ہفتہ

پہلے ایک ہائیڈروجن بم پھٹ گیا تھا۔ ماہرین اثریات واہرامیات نے ان مختلف نظریات کے حامل افراد کو سدا اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ مصنف اور فلم پروڈیوسر لیونارڈ کوٹریل نے اپنی کتاب "Mountains of the Pharaohs" میں لکھا ہے ''عظیم اہرام کے ان تھیورسٹ کا اثریات یا سائنس سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اگر آپ قدیم مصر پر جان ٹیلر، چارلس پیازی اسمتھ 'جون ڈیوڈسن اور دیگر ماہرینِ اہرامیات کی کتابوں کا مطالعہ کریں گے تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تاہم ان لوگوں نے اہرام پر چارٹوں، تصویروں، پیائشی اعداد اور ریاضی کے حسابات سے مزین بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھ ماری ہیں اور یہ کتابیں انگلینڈ اور امریکہ میں بڑے شوق سے پڑھی جاتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں درج کوئی بھی پیش گوئی کبھی درست ثابت نہیں ہوئی ہے پھر بھی لوگ آج تک انہیں بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ خاص طور پر مسٹر چارلس پیازی اسمتھ کی سو سال پہلے شائع شدہ کتاب Life and Work at the Great Pyramid تو آج بھی خاصی مقبول ہے۔

''نظریات پیش کرنے کا یہ سلسلہ ابھی جاری ہے''۔ سر فلنڈرس پیٹری نے اپنی کتاب "Seven Years in Archthaeology" میں لکھا۔ ''اور یہ محققین اب بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ حقائق ان کی ضروریات کے مطابق ہیں۔ سو ایسے لوگوں کو سمجھانا فضول ہی ہے کیونکہ ان کے اذہان پر اہرام کی سرّیت کا بھوت سوار ہے''۔

لیفٹیننٹ کمانڈر این ایف وھیلر نے غزہ میں ہارورڈ یونیورسٹی کے اہرامیات کے ایک امریکی پروفیسر جارج اے ریسنر (George A Reisner) کے ساتھ کام کیا تھا۔ اس نے لکھا ''سمجھ میں نہیں آتا آخر ان سنکیوں نے خود کو غزہ کے شی اوپس کے اہرام تک ہی کیوں محدود کر رکھا ہے۔ نورچرٹ نے گویا یہ دریافت کر کے ایسے لوگوں کو ایک تحفہ پیش کیا ہے کہ ابو سر میں سہورے کی ملکہ کے اہرام کی بنیاد کا محیط اس کی بلندی کا بالکل نصف ہے جو نیپیئر کی لوگارتھم کے بیس (e) کے برابر یعنی ۲۶۷۱۸۳۸ ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر شی اوپس کے اہرام کے بجائے کرسٹل پیلس کی پیائش کریں تو بلاشبہ اس سے بھی زیادہ معلوماتی پیائشیں حاصل ہو سکتی ہیں۔ اگر پیائش کی کوئی مناسب اکائی مل جائے جیسے ورسٹس 'ہینکس یا کیبلس (لمبائی کے روسی پیانہ ۷ ۴ ۰ ۱ کلومیٹر یا ایک میل کا دو تہائی ہوتا ہے) تو ٹمبکٹو تک فاصلہ یقینی طور پر کسی چھت کے گرڈر یا بونڈ اسٹریٹ میں اسٹریٹ لیمپس کی تعداد یا کیچڑ کی کثافت یا کسی گولڈ فش کے اوسط وزن کے برابر ثابت کیا جا سکتا ہے''۔

اپنی کتاب ''ممی'' میں سر ویلس بج (Sir Wallis Budge) نے بھی ان محققین پر کڑی تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ ان لوگوں نے اہرام کو علامات کے چکر میں الجھا دیا ہے۔ ''ان ممتاز مفکرین کے مطابق کمروں کی ترتیب، راہداریوں کی طوالت اور زاویوں کے جھکاؤ وغیرہ کی پیائش نسلِ انسانی کے لئے انتہائی اہمیت کی حامل ہیں اور ہر پیائش میں ایک باطنی اور علامتی مطلب پوشیدہ ہے''۔ بج نے لکھا ''جب کہ موجودہ مصنفین کے مطابق یہ عظیم اہرام کوئی فلکی آلات یا پیائش کا کوئی عالمی پیانہ نہیں بلکہ محض ایک مقبرہ ہے، ایک مدفن ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں ہے''۔

ڈاکٹر گنتھر روزن برگ بھی ان محققین کی طرف سے مشکوک ہے مگر وہ کھلے ذہن سے اس بات
ی تسلیم کرتا ہے کہ "آزادیٔ تحریر و تقریر اور نظریات کا ہالہ ایک جمہوری معاشرہ کا اہم حصہ ہے۔
فرض کر لیتے ہیں کہ اہرام سے متعلق ان کے تمام نظریات غلط ہیں ان کی تحقیق کے نتائج
ٹے ہیں اور گمراہ کن ہیں مگر ان کے اس مطالعہ سے کسی کو کیا نقصان پہنچا ہے؟ اسمتھ اور اس جیسے
رے لوگوں نے اہرام کی پیائش اور تحقیق میں اپنی عمروں کا بڑا حصہ قربان کیا ہے۔ ماہرین آثارِ
یمہ نے تو انہیں برسوں تک نظر انداز کئے رکھا تھا۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ مغربی
شرے میں ایسے لوگ موجود ہیں جو تحقیق کے بعد نظریات قائم کرتے ہیں اور ان پر قائم رہتے
ں۔ اسمتھ کے نظریات غلط ہو سکتے ہیں بالکل غلط بہر حال اس کا دارومدار تو پڑھنے یا سننے والے پر ہے
وہ ان پر یقین کرے یا نہ کرے۔ یہ نظریات غلط ہیں یا درست اہم بات یہ ہے کہ ہم بات کا انتخاب
نے میں آزاد ہیں۔
یا یہ اہرام صرف مصری فرعونوں کی باقیات ہیں؟ یا یہ سنگی یادگاریں اس سے کہیں زیادہ اہمیت کی
ں ہیں جتنا کہ یہ دکھائی دیتی ہیں؟ فیصلہ آپ پر ہے۔

☆

ایٹلانٹس کے اہرام

اگنیشس ڈونیلی (Ignatius Donnely) منی سوٹا کا ایک متحرک، شیریں زبان مقرر مصنف اور صوفی تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ازمنۂ قدیم کے تحقیقی میدان کا ایک ان تھک مسا بھی تھا۔ جب اس نوجوان آئرش مین نے دیکھا کہ اس کے پاس کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے رقم اور ذرائع نہیں تو اس نے ایک اٹارنی کی ماتحتی میں قانون کی تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی اور آخر کار قانون کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وکیل بننے کے بعد ڈونیلی کو منی سوٹا کا لیفٹیننٹ گورنر منتخب کر لیا گیا۔ جب اس نے اس عہدے کا حلف اٹھایا تب اس کی عمر ۸ سال تھی۔ وہ ایک مثالیت پسند انقلابی اور سیاست میں اصلاحی نظریات کا حامل تھا بعد میں وہ ایس کانگریس کے لئے منتخب ہو گیا۔ ۱۹۰۱ء میں وہ اپنی موت کے وقت پاپولسٹ پارٹی کے ٹکٹ امریکہ کے نائب صدر کا انتخابات بھی لڑنے والا تھا۔

سیاسی مصروفیات کے باوجود ڈونیلی نے تحقیق کے لئے بھی وقت نکال لیا تھا اور کئی کتابوں مصنف تھا۔ ان کتابوں میں اس کی مشہور زمانہ کتاب Atlantis: The Antidiluvian "World" بھی شامل تھی جو ہارپر اینڈ رو نے ۱۸۸۲ء میں شائع کی تھی۔ اشاعت کے فوراً بعد اس کتاب نے علمی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ کئی علمی اداروں کے اراکین نے ڈونیلی کو پاگل اور سنکی کہہ کر رد کر د مگر شدید مخالفت کے باوجود اس کی یہ کتاب افسانوی براعظم ایٹلانٹس پر ایک مستند کام مانی جاتی رہی اگر واقعی ایٹلانٹس کا وجود تھا اور ڈونیلی نے بڑے سحر انگیز انداز میں اس پراسرار براعظم کے وجود ثابت کرنے کی کوشش کی تھی تو اسے یقین تھا کہ وہ بحر ایٹلانٹک کے وسط میں واقع تھا۔ اپنی اس علم تحقیق میں ڈونیلی نے ایٹلانٹین روایات کی سچائی کے لئے اہراموں کو ثبوت کے طور پر پیش کیا تھا ڈونیلی کا خیال تھا کہ عیسائیوں کی صلیب، باغ عدن اور اہراموں کی بنیاد ایٹلانٹس ہی ہے۔ وہ لکھتا ہے :

''ہم اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ فونے شین (Phoenician) کی دیوی استی نو (اشترنوایما) جسے یونانی ماں کہتے ہیں، لامیش کے تین بیٹوں کی اکلوتی بہن تھی جسے تورات کی پہلی کتاب ''کتاب تخلیق'' میں ناایمایا ناآما کے نام سے پکارا گیا ہے۔ اگر یہ بات ہے تو پھر ہیبریوز اور فونے شینز کا اصل مقام یورپ کے مغرب میں واقع باغ عدن ہے اور اگر فونے شینز کا تعلق وسطی امریکہ کے باشندوں سے ہے جیسا کہ ان کے ابجد کی مماثلت سے ظاہر ہوتا ہے جو خود کو مشرقی سمندروں کے

ایک جزیرے کا باسی بتاتے ہیں تو پھر اس بات میں کوئی شبہ ہی نہیں رہ جاتا کہ باغ عدن اور ایٹلانٹس ایک ہی جگہ کے دو نام ہیں۔

اہرام: نہ صرف صلیب اور باغ عدن میں ایٹلانٹس سے بڑی مماثلت ہے بلکہ ایٹلانٹس میں جو دیوتاؤں کا مسکن ہے ہمیں اہراموں کے اصل ماڈل بھی ملتے ہیں جن کا سلسلہ ہندوستان سے پیرو تک پھیلا ہوا ہے۔

انوبس: قدیم مصریوں کا عقیدہ تھا کہ مردہ جسم میں مسالے اور خوشبوئیں بھر کر اسے محفوظ کرنے کی ذمہ داری دیوتا انوبس کی تھی اس دیوتا کا لقب یہ بھی تھا کہ ایسا دیوتا جو خوشبوؤں اور مسالوں کی دنیا میں رہتا ہے اس نقش میں انوبس مردے کو حنوط کرنے کے آخری مراحل سے گزر رہا ہے۔

یہ منفرد تعمیرات انسانی تاریخ کی ابتداء سے بہت پہلے کے زمانے کی ہیں ہندوؤں کی کتاب ''پرانا ز'' کے مطابق ان اہراموں کا تعلق اس قدیم ترین دور سے ہے جن کی باقیات اب کھنڈروں کی صورت میں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ شی اوپس کا شمار بھی انہی بے شمار عمارتوں میں ہوتا ہے جنہیں مرورِ زمانہ نے ملبے کی صورت میں ڈھال دیا ہے۔

پچاس سال قبل مسٹر فیبر (Mr.Faber) نے اپنی "Origin of Pagan Idola-try" نامی کتاب میں ان قبرستانی ٹیلوں، اہراموں اور پگوڈاز کو اسی صف میں شامل کیا ہے جس میں وہ وسط عدن میں ایستادہ مقدس پہاڑوں کو سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے یہ اہرام اور پگوڈا اس عدنی مقدس پہاڑ کی نقل ہیں جن کا تذکرہ ایک سے زیادہ جگہ زبور میں ملتا ہے۔ باغ خود بھی ایک بڑی ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔ (زبور باب سوئم، آیت چہارم اور باب ۱۸ آیتیں ۱۵، ۱۶، ۱۸) اہرام ان بے شمار حیرت انگیز مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے جن سے ہمیں ہر جگہ واسطہ پڑتا رہتا ہے اور جو ایٹلانٹس کے بغیر حل ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ عربی داستانوں میں اہراموں کا سلسلہ عظیم سیلاب سے جا ملتا بتایا گیا ہے، بوڈلین لائبریری "Bodleian Library" میں موجود ایک قدیم نسخے میں جس کا ترجمہ ڈاکٹر اسپرینگر نے کیا ہے، ابو بلخی کہتا ہے

''سیلاب سے پہلے ہی داناؤں نے چند الوہی علامات سے یہ جان کر کہ آگ یا پانی کا ایک ایسا طوفان آنے والا ہے جو کرۂ ارض پر موجود ہر جاندار کو چاٹ جائے گا، اس آنے والی آفتِ عظمیٰ سے بچنے کی خاطر بالائی مصر کے پہاڑوں پر پتھروں کے اہرام تعمیر کر لئے تھے ان میں سے دو عمارات باقی ساری عمارتوں سے بہت بڑی تھیں۔ ان عمارات کی بلندی چار سو کیوبٹ تھی اور لمبائی اور چوڑائی بھی اتنی ہی تھی۔ یہ عمارتیں سنگ مرمر کے بھاری بھرکم بلاکوں سے بنائی گئی تھیں۔ ان بلاکوں کو اس نفاست سے چنا گیا تھا کہ جوڑ کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ عمارت کے بیرونی پتھروں پر عجیب و غریب جنتر منتر کندہ کر دیئے گئے تھے۔''

ان روایتوں میں یہ جناتی عمارتیں بالائی مصر کے پہاڑوں پر بنائی گئی تھیں مگر پورے مصر

میں اس قدر وسیع عمارتوں کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ باتیں طوفانِ نو
کے حوالے کے طور پر بیان کی گئی ہوں ؟ کیا امریکہ اور مصر کے اہرام ایٹلانٹس کی تعمیرات
نقل تو نہیں تھیں ؟ ایسی عظیم الشان وسعت و بلندی کی عمارتوں کی وجہ سے ہی کہیں مینار بابل
داستانیں تو نہیں مشہور ہو گئیں ؟

پھر آخر انسانی ذہن نے اہرام میں عمارت کیسے کھڑی کر دی ؟ وہ ترقی کے اس معیار
کیسے پہنچا ؟ دریائے نیل کے کنارے اور امریکہ کے جنگلات اور میدانوں میں کہاں سے یہ
معمولی عمارتیں ابھر آئیں ؟ اور آخر کیوں دونوں ممالک میں ان عمارتوں کی تعمیر میں کپاس
چاروں کونوں پر مربع ساخت ہی کیوں ہے ؟ کہیں یہ صلیب کے چاروں کونوں کی یاد میں تو نہ
بنائی گئیں یا ان کی تعمیر کے وقت معماروں کے ذہن میں ایٹلانٹس کے وہ چار دریا تو نہیں تھے
مشرق، مغرب، شمال اور جنوب کی طرف بہتے ہیں۔ ایک اور امتزاج ہے جو خصوصی توجہ
طالب ہے وہ ہے متقاطع نشان جو کسی ٹیلے یا کون نما عمارت میں بنا ہوتا ہے اور جسے عیسائی ماہر
آثارِ قدیمہ گول گوتھا (صلیب کے منظر کا مجسمہ جو کسی کھلی جگہ یا گرجا میں نصب کیا جاتا ہے)۔
تعبیر کرتے ہیں۔ جزیرہ لیوس میں کیلرنش کی تعمیر اس کی بہترین مثال ہے جو یورپ میں ا
تک رائج ہے۔ اس پہاڑی کو آج تک بڑا محفوظ رکھا ہوا ہے۔ کلدانیوں (جنوبی بابل کے لوگ
سے لے کر غناسطیوں (Gnostic) (غناسطیئے قدیم عیسائیوں کا ایک فرقہ جو روحانی عل
میں برتری کا دعوے دار تھا اور جس کا یہ نظریہ تھا کہ کائنات الوہیت کے جلووں یا قو
و قدرت کے مظاہر کی تخلیق ہے) اور قدیم مہذب دنیا کی انتہاؤں سے لے کر جدید مہذب ا
تک ایک مخصوص قدیم سچائی یا اسرار کے اظہار کا روایتی انداز ہے۔ یہی بات اسکینڈی نیویا
ناروی اساطیری (ایک عظیم جنگلی درخت جو اپنی شاخوں اور جڑوں سے کائنات کو ایک
باندھے رکھتا ہے۔ جس کی شاخیں اور جڑیں زمین سے آسمان اور پاتال تک پھیلی ہوئی سمجھی جا
ہیں) اور اس برگد کے درخت کے بارے میں سمجھی جاتی ہے جس کے نیچے بیٹھ کر مہاتما گوتم بد
تپسیا کیا کرتے تھے۔ اس کے ابتداکار مصری نہیں بابلی (بے بی لونین) تھے ان کی دستہ دار صلیب
(T کی شکل کی جس کے اوپر ایک پھندا ہوتا ہے) مخروطی سہارے پر ایک بیضوی یا گول مٹھ
مشتمل تھی۔ غناسطی جو قدیم عیسائیت اور کفر و الحاد کی درمیانی متضاد حیثیت کے حامل تھے ا
نشان کو اپنے مقبروں پر کندہ کرتے تھے ان کے نزدیک کون موت کے ساتھ ساتھ زندگی
بھی علامت تھی۔ الحادی اساطیر میں یہ دیوی یا آسمان کی ماں کا علامتی نشان تھا اس دیوی کو
ناموں سے پکارا جاتا تھا جن میں مائی لیٹا، استارتی، ایفروڈائٹ، آئی سس، ماتایا وینس زیادہ قا
ذکر تھے۔ رومیوں کے دیوتا جیوپیٹر کی طرح اس دیوی کا امتیازی نشان بھی مخروطی یا اہرامی
ہی کا تھا۔ اس کے علاوہ آشوریوں کے زرخیزی کے دیوتا کی قربان گاہ کی ساخت میں بھی مخرو
یا اہرامی شکل کا بڑا خیال رکھا گیا تھا۔ خاص خاص مواقع پر اس شکل کو اور ممتاز بنانے کے لئے ا
کے ایک جانب عارفانہ درخت بھی بنا دیا جاتا تھا۔ اس مصنف کو یہ بھی یقین ہے کہ مسٹر فیر کی

رائے بالکل درست ہے کہ اہرام اس مقدس پہاڑی کی نقل ہے جو عدن کے وسط میں ایستادہ ہے جسے اٹلانٹس کا اولپس بھی کہا جاتا ہے۔

تھامس مورس(Thomas Maurice) بھی جو کسی طرح بھی کم تر درجہ کی اتھارٹی نہیں ہے انہی خیالات کا حامل ہے۔ اس نے اہرام کی تعمیر کے تین مقاصد گنوائے ہیں۔ مقبرے، منادر اور رصد گاہیں اور یہ خیالات اس نے اپنی کتاب عتیقِ ہند(Indian Antiquities) میں تحریر کئے ہیں۔ اب چاہے ان کی تعمیر کسی بھی دور میں ہوئی' ان کی تعمیر کرنے والے کوئی بھی لوگ ہوں، چاہے یہ افریقہ میں ہوں یا ایشیا میں، نیل کی وادئ زیریں میں ہوں یا کلدانی میدانوں (فلسطین و بابل) میں مصر کے اہراموں کی تعمیر کے مقاصد بلاشبہ کچھ اور ہی تھے، ہیروڈوٹس کے مطابق ان کو متعارف کرانے والا بابحسوس تھا اور ایک افلاطونی فلسفی پروکلس نے تو ان کا تعلق علم ہیئت سے بتایا ہے۔ وہ علم جو مصریوں نے کلدانیوں سے سیکھا تھا۔ بہر حال ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ عمارات ارضی پرستش کے منادر کے ساتھ ساتھ رصد گاہوں کا کام بھی دیتی تھیں۔ گڈریوں کی ان کمین گاہوں پر پھر بادشاہوں نے قبضہ کر لیا۔ یہ نہ صرف ان کے لئے فخر واوہام کا باعث بنیں بلکہ ان کے خاص کمرے ان بادشاہوں کے مدفنوں کے لئے مخصوص ہو گئے۔ یہی مصنف آگے جا کر لکھتا ہے "اہراموں کی یہ نقلیں، مقدس پہاڑ کے آبادکاروں کو جی جان سے عزیز تھیں کیونکہ یہ ان کے دیوتاؤں کے مسکنوں کے مماثل تھیں بلکہ شاید یہاں مقدس پہاڑ کی طرح آگ اور سورج کی پوجا بھی کی جاتی تھی۔"

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ سبینین(Sabian)(وسطی اطالیہ کی ایک قدیم قوم جو خصوصاً روم کے شمال مشرقی اپینائن میں آباد تھی اور جسے رومنوں نے ۲۹۰ ق م کے قریب مغلوب کر لیا تھا) کی مذہبی عبادات پوری نئی دنیا(New World) پر غالب تھیں۔ اب بھی عبادت کے یہ طریقے کسی حد تک شمالی براعظم کے آوارہ گرد قبائل میں رائج ہیں اور مفتوح ہونے سے قبل پیروویَن قوم کا قومی مذہب بھی یہی تھا۔ خط استوا کے جنوب میں آباد ان کے انتہائی مہذب پیشروؤں نے بھی یہی مذہب اختیار کر رکھا تھا۔ اس کے ثبوت وہاں کی گول اور چورس آتشی قربان گاہیں ہیں جو اوایو اور ٹیٹی کاکا (امریکہ کی جنوبی ریاستیں) کی جھیلوں کے کنارے پھیلی

مردے کا منہ کھولنے کی رسم: قدیم مصر میں جب کوئی مر جاتا تو پادری انوبس دیوتا کا ماسک لگا کر لاش کو سیدھا کھڑا کر دیتا تھا اور اس کے سامنے اس کے لواحقین آہ و بکا کرتے ہوئے اسے کھلاتے پلاتے تھے۔ اس تصویر میں پادری انوبس دیوتا کا ماسک پہنے ہوئے ایک مردے کی لاش کو پیچھے سے پکڑے کھڑا ہے جبکہ اس کے سامنے اس کی بیٹی بیٹھی ہے دیگر پادری حنوط شدہ لاش کو مقدس پانی پلا رہے ہیں اور پچھلی صف میں حنوط شدہ مردہ باپ کا بڑا بیٹا کھڑا ہے جس نے آگ جلائی ہوئی ہے اور ہاتھ میں آلات لیئے ہوئے ہے ساتھ ہی وہ المیہ گیت بھی گا رہا ہے۔

ہوئی ہیں اور جو بحیرۂ کیسپین پر معلق عبادت گاہوں سے بڑی مماثلت رکھتی ہیں۔ ازمنۂ قدیم کی ایسی اور اس قسم کی دیگر ان نشانیوں میں جو قدیم وجدید دنیا کی معدوم آبادیوں کا پتا دیتی ہیں ایک نشانی مالٹیز کراس (Maltese Cross) ہے۔ یہ کہ اس ایک کثیر الاضلاع گرینائٹ پر کھدا ہوا ہے جو شبیہہ سازی یا ہلکی ابھر واں نسبت کاری کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ یہ گرینائٹ ایک جناتی دیوار میں جڑا ہوا ہے۔ کراس کے گرد ایک دائرہ ہے اور چاروں کونوں پر پھندنے یا جھالریں کندہ ہیں۔ کراس کے چاروں کونے کارڈینل کوارٹرس کی ٹھیک ٹھیک نشان دہی کرتے ہیں۔ ایسی ہی ایک اور حیرت انگیز چیز کچھ عرصہ قبل پیرووین کے ہوکین (زمین دوز قبرستان) سے ملی ہے۔ یہ ایک مرلی یا بانسری نما چیز ہے جسے ٹھوس لاجورد سے تراشا گیا ہے۔ ماہر کاریگر نے اس کے چاروں طرف مالٹیز کراس کندہ کر کے اسے بے حد حسین بنادیا ہے۔ کراس کے علاوہ اس پر اور ایسے نقوش بھی دیکھے جاسکتے ہیں جو مصر کے چہار پہلو سنگی گاؤدم ستونوں پر اور اس ملک کے یک سنگی ستونوں پر کھدے ہوئے ہیں۔ اس قسم کی تصاویر قدیم اوٹرسکو کے سیاہ مٹی کے برتنوں پر بھی ملی ہیں۔ میکسیکن فیروہر میں اور بھی کئی ایسی نادر اشیاء ملی ہیں جن میں جپسم کی ایک ٹیبلیٹ، ایک شیلڈ، ایک ہیلمٹ اور دو پتھر کی مالائیں وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے بارے میں خیال ہے کہ یہ آشوریوں کی یادگاریں ہیں۔

اہرامی کراس کے اظہار کے معاملے میں دنیا کا کوئی بھی ملک ہندوستان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ انھوں نے بلاشبہ اس معاملے میں مصریوں کی طرح ہی محنت کی ہے اور بعض اوقات ان سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ تاہم یہ صبر آزما اور محنت طلب ہنر زمانے کی دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکا اس کے باوجود ان کی داستانیں پوری سینا کے مقبرے کی طرح ناقابلِ یقین لگتی ہیں۔ گنگا کے کنارے آباد بنارس شہر میں اب چند ایک باقیات عظمتِ رفتہ کی علامت کے طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان میں ایک مندر کا حوالہ ہی کافی ہے جو بندھ مادھو کا مندر کہلاتا تھا اور جسے سترھویں صدی عیسوی میں اورنگ زیب نے مسمار کروادیا تھا۔ ایک فرانسیسی بیرن ٹیورنر (Tavernier) نے جو ۱۶۸۰ء میں اس علاقے میں گیا تھا اس مندر کے بارے میں چند تفصیلات بتائی ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ مندر ایک عظیم کراس کے طرز پر تعمیر کیا گیا تھا جو سینٹ اینڈریو کے کراس سے ملتا جلتا تھا۔ اس کے مرکز میں ایک بڑا گنبد تھا جو بلندی پر اہرام کے طرزِ تعمیر کے مماثل تھا۔ کراس کے چاروں کناروں پر متناسب وسعت والے چار اور اہرام تھے جن تک رسائی کے لئے باہر سے زینے بنے ہوئے تھے۔ ان میں بالکونیاں تھیں جو شاید راہبوں کی آرام گاہیں تھیں۔ یہ عمارت، بیلوس (Belus) کے مندر کی یاد دلاتی ہے جس کا تذکرہ ہیروڈوٹس کی کتاب میں بھی موجود ہے۔ جس کا تذکرہ ہیروڈوٹس کی کتاب میں بھی موجود ہے۔ جمنا کے کنارے پر متھرا میں بھی اسی طرز کی ایک عمارت کے آثار ملے ہیں یہ اور اس قسم کے دوسرے باقیات جن میں الفانٹا کے زیرِ زمین منادر اور ایلورا اور سیلسیٹی کے غار شامل ہیں مورس کی مشہورِ زمانہ کتاب میں بڑی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ان کے علاوہ بھی ہندوؤں کی مہارت کے اور کئی ثبوت ملے ہیں ان میں متقاطع اہرامی مینار نمایاں ہیں۔ کارومنڈل کے ساحل پر چیلم برم مندر میں اندرونی مستطیل کے گرد ایک دوسرے میں پیوست سات بلند وبالا

دیواریں ہیں جن میں ہر جانب اہرام کی صورت کے دروازے بنے ہوئے ہیں ان دروازوں میں ایک وسیع کراس کے بازوؤں کا تاثر ملتا ہے۔

بغیر پٹیوں کے مردے کی لاش ملاحظہ کیجئے جس کو مائع نیٹرون میں بھگویا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ لاش گلنے سڑنے سے بچ گئی ہے یوں سر سے لے کر پاؤں تک پوری لاش صحیح سلامت ہے حتیٰ کہ اس کے ہاتھوں اور پیروں کے ناخن تک نہیں ٹوٹے بعد ازاں اسے پٹیوں میں لپیٹ کر حنوط کیا جاتا اور پھر اہرام میں مدفون کیا جاتا۔

میکسیکو میں تقریباً ہر جگہ اہرام موجود ہیں۔ کورنز نے چارلس پنجم کو ایک خط لکھا کہ صرف چولولا کے علاقے میں چار سو اہرام گنے ہیں۔ ان کے منادر بلند مقامات پر بنے ہوئے ہیں۔ میکسیکو کا قدیم ترین اہرام ٹیوٹی ہوکن میں ہے جو میکسیکو شہر سے آٹھ لیگ کے فاصلے پر ہے۔ دو بڑے اہرام سورج اور چاند کے لئے مخصوص ہیں ان میں سے ایک پتھروں کو تراش کر بنایا گیا ہے انہیں چار منزلوں میں چوٹیوں پر بنایا گیا ہے۔ ان میں بڑا والا ۶۸۰ مربع فٹ وسیع بنیاد پر ایستادہ ہے۔ اس کی بلندی ۲۰۰ فٹ ہے اور اس پوری عمارت نے تقریباً گیارہ ایکڑ رقبہ گھیرا ہوا ہے۔ چولولا کے اہرام کی پیمائش ہمبولٹ نے کی تھی۔ اس کے مطابق وہ ۱۶۰ فٹ بلند اور اس کی بنیاد کا رقبہ ۱۴۰۰ مربع فٹ ہے اور یہ ۴۵ ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ مصر کے عظیم اہرام شی اوپس ۷۴۶ مربع فٹ نبیاد پر ایستادہ ہے، اس کی بلندی ۴۵۰ فٹ ہے اور اس اہرام نے گیارہ سے تیرہ ایکڑ تک کا علاقہ گھیرا ہوا ہے۔ اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیوٹی ہوکن اہرام کی بنیادی ساخت شی اوپس کے اہرام کے مساوی ہے جب کہ چولولا ان سے چار گنا علاقے میں پھیلا ہوا ہے تاہم بلندی میں شی اوپس کا اہرام ان دونوں امریکی اہراموں سے بازی لے گیا۔ سینور گریشیا کیوبس کا خیال ہے کہ ٹیوٹی ہوکن (میکسیکو) کے اہرام کی تعمیر کے مقاصد بھی وہی تھے جو مصری اہراموں کے تھے۔ اس کے خیال میں ان دونوں میں تقریباً گیارہ عدد مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔

۱۔ دونوں کا محل وقوع یا منتخبہ علاقہ یکساں ہے۔

۲۔ دونوں کی سمت بندی میں بہت تھوڑا سا فرق ہے۔

۳۔ دونوں عمارتوں کا مرکزی خط فلکی خط نصف النہار پر واقع ہے۔

۴۔ درجہ اور قدمچوں کے حساب سے دونوں کی ساخت یکساں ہے۔

۵۔ دونوں علاقوں میں بڑے اہرام سورج دیوتا کے لئے وقف ہیں۔

۶۔ دریائے نیل کی ایک وادی "موت کی وادی" کے نام سے موسوم ہے جب کہ ٹیوٹی ہوکن میں موت کی گلی "a street of the dead" نامی موجود ہے۔

۷۔ دونوں مقامات پر کچھ یادگاریں قلعہ بند صورت میں پائی جاتی ہیں۔

۸۔ چھوٹے ٹیلوں کی ساخت اور مقاصد تقریباً یکساں ہیں۔

۹۔ دونوں اہراموں میں ایک ایک چھوٹا ٹیلہ ہے جو ان کی ایک سمت سے منسلک ہے۔

۱۰۔ چاند کے اہرام میں جو داخلی دروازہ دریافت ہوا ہے ویسے ہی دروازے مصری اہراموں

میں بھی ملے ہیں۔

۱۱۔ اہراموں کی اندرونی ترتیب میں بھی بڑی حد تک مشابہت موجود ہے۔

یہ اعتراض بھی کیا گیا ہے کہ امریکی اہرام مصری اہراموں سے ساخت میں مختلف ہیں اس طرح کہ ان کی چوٹیاں مسطح ہیں جب کہ اہراموں کی تعمیر میں یہ کوئی آفاقی اصول نہیں ہے۔

یوکتان کے کئی شہروں کے کھنڈرات میں ایک سے زیادہ اہرام چوٹیوں پر دریافت ہوئے مگر ان کے گرد کسی اور عمارات کے آثار نہیں ملے حالانکہ دیگر اہراموں کے پاس دوسری عمارات کے کھنڈرات بھی موجود ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی اسباب ہیں جن کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ امریکہ کے اہراموں کو مکمل اہرام کہا جا سکتا ہے۔ والڈیک کو پیلنک (Palenque) کے قریب دو ایسے اہرام ملے ہیں جو مکمل محفوظ حالت میں ہیں۔ ان کی بنیادیں چورس اور چوٹیاں نوکیلی ہیں ان کی بلندی اکتیس فٹ اور اطراف مساوی الاضلاع ہیں۔ بریڈ فورڈ کا خیال ہے کہ کچھ مصری اہرام خاص طور پر وہ جنہیں انتہائی قدیم سمجھا جاتا ہے، میکسیکو کے انڈین معبدوں (Teocalli) سے بے حد مماثلت رکھتے ہیں اور مصر میں ایک اور قسم کے اہرام بھی دریافت ہوئے ہیں جنہیں مصطبہ-Mas (taba کہا جاتا ہے جو میکسیکنوں کی طرح اوپر سے سپاٹ ہوتے ہیں۔ جب کہ آشوریوں کے ہاں بھی یہ طرز تعمیر نظر آتا ہے۔ "درحقیقت" ایک مصنف رقم طراز ہے "منادر اور معبدوں کا یہ طرز تعمیر (سپاٹ چوٹی والے) میسوپوٹیمیا سے لے کر بحر الکاہل کے جزائر تک میں پایا جاتا ہے۔ فونیشیا کے لوگ بھی اہرام تعمیر کرتے تھے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں ڈومینکن بروکارڈ نے فونیشیا کے شہر مرتھیا میراتھوس کے کھنڈرات کا دورہ کیا تھا۔ وہ وہاں موجود اہراموں کی شوکت و سطوت دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا تھا اس کے خیال کے مطابق وہ عظیم اور حیرت انگیز تعمیرات کا نمونہ تھے۔ یہ اہرام چھبیس سے اٹھائیس فٹ لمبے اور آدمی جتنی موٹائی والے بلاکوں سے تعمیر کئے گئے تھے"۔ "اگر فرگوسن کہتا ہے۔" اب بھی ہم یہ بات تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں کہ سوکو اور اوجا کے اہراموں کے معماروں یا ژوکیالکو اور بورو بوڈر کے منادر میں کوئی تعلق تھا تو بھی کم از کم ہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے ہیں کہ ان کی مماثلت بے حد حیرت انگیز اور چکرا دینے والی ہے اور اسے محض حادثاتی اتفاق نہیں سمجھا جا سکتا"۔

سارے مصری اہرام کی عمارتیں نقاط اصلیہ (قطب نما کے چار خاص نقاط) پر ایستادہ ہیں اور یہی حال میکسیکو کے اہراموں کا ہے۔ مصری اہراموں میں چھوٹی چھوٹی راہ داریاں اندر تک اتر رہی ہیں تو میکسیکو کے اہراموں میں بھی ان چھوٹی راہ داریوں کا جال سا بچھا ہوا ہے۔ المریز کے مطابق ٹیو ہیو کن کے اہرام میں بنیاد سے انہتر فٹ کے فاصلے پر ایک گیلری ہے جس کی چوڑائی بس اتنی ہی ہے کہ آدمی ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل ہی وہاں پہنچ سکتا ہے۔ آگے ڈھلان ہے پھر پچیس فٹ کے فاصلے دو کمرے یا مربع کنویں ہیں ان میں سے ایک پانچ مربع فٹ ہے اور ایک کنویں کی گہرائی پندرہ فٹ ہے۔ مسٹر لووینسٹرن (Lowenstern) کا کہنا ہے کہ یہ گیلری ایک سو ستاون فٹ لمبی ہے اور جیسے جیسے یہ اہرام کی اندر اترتی جاتی ہے اس کی چوڑائی بڑھتی جاتی ہے اور اس کی بلندی ساڑھے چھ فٹ

تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کے مطابق کنویں کا رقبہ چھ مربع فٹ سے زیادہ ہے۔ اس گیلری سے ضمنی گیلریاں بھی نکلتی ہیں مگر وہ ملبے سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ شی اوپس کے اہرام میں بنیاد سے انچاس فٹ اوپر اسی طرح کی راہداری یا خلاء ہے۔ یہ تین فٹ گیارہ انچ بلندی اور تین فٹ ساڑھے پانچ انچ چوڑی ہے۔ یہ ڈھلانی راستہ ہمیں کنویں یا تدفینی کمرے تک لے جاتا ہے۔ اس سے منسلک ضمنی راہداریاں اہرام کے اندرونی حصے تک لے جاتی ہیں مصری اور امریکی اہراموں کی بیرونی سطح پر موٹا، ہموار اور چمکدار سیمنٹ کا پلاستر چڑھا ہوا ہے۔ ہمبولٹ کا خیال ہے کہ چولولا کا اہرام بالکل اسی طرز کا ہے جس طرح جیو پیر بیلوس کا مندر میدون ڈیکور کے اہرام یا مصر میں سکارا کے اہرام ہیں۔

امریکہ اور مصر میں اہراموں کو مدفنوں کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور بڑی قابل ذکر بات ہے کہ اہراموں سے منسلک مٹی سے بنائی ہوئی دیگر عمارتیں اور ٹیلے اپنی ساخت کے لحاظ سے انگلینڈ میں موجود چند آثاروں سے بڑی مشابہت رکھتے ہیں۔ ایوبری میں سالسبری پہاڑی ایک مصنوعی ٹیلا ہے جو ایک سو ستر فٹ بلند ہے اس کے گرد دمدمہ یا پشتہ گزرگاہیں ہیں جو ۱۴۸۰ گز طویل ہیں۔ گول گڑھے ہیں، پتھر کے دائرے ہیں اور بالکل ویسے ہی ہیں جیسے مسی سی پی کی وادی میں پائے گئے ہیں۔ آئرلینڈ میں مرنے والوں کو پتھر کی کوٹھریوں میں دفن کیا جاتا تھا ان پر اہرام کی شکل میں مٹی کا ٹیلا بنا دیا جاتا تھا مگر چوٹی سپاٹ رکھی جاتی تھی۔ وہاں کے لوگ انہیں موٹس (Moats) کہتے تھے۔ اوہائیو میں بھی ایسی ہموار چوٹی والے مخروطی ٹیلے ملے ہیں جن کے نیچے سنگی مدفن موجود ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دراصل مخروطی ٹیلے ہی ہیں جنہیں اہرام کی شکل دے دی گئی ہے اور ان عجیب و غریب تعمیرات کی اصل بنیاد یا محرک سالسبری ہل اور وسطی امریکہ اور مسی سی پی کی وادی میں موجود مٹی کے ٹیلے ہی ہیں۔ کراس کا نشان قبل مسیح میں بھی موجود تھا کیونکہ مقدس علامت یا نشان کے طور پر یہ ایٹلانٹک کے دونوں جانب ملا ہے۔ اس نشان کی مدد سے ہمیں ان چار دریاؤں کا پتا بھی ملتا ہے جو اس نسل کے تہذیب و تمدن کے مرکز ہیپی آئی لینڈ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ عدن کی اس نسل کی یادگاریں ہمیں یورپ اور امریکہ میں جا بجا بکھری نظر آتی ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ابتدائی دور کے انسان امن و سکون سے رہتے تھے اور جو بعد میں چڑھتے پانیوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ یہ اہرام ہمیں ایٹلانٹک کے دونوں جانب ملتے ہیں جن کے چاروں کونے کراس کے بازوؤں کی طرح قطب نما کے چار خاص نقاط کی علامت ہیں۔ یہ اولپس کی یاد دلاتے ہیں اور یہ اہرام اولپس (ازلان) کی مخصوص اور مرکزی علامت ہے۔ کیا یہ تمام آثار کسی حادثاتی اتفاق کا نتیجہ ہیں؟ اس سلسلے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ امریکہ اور برطانیہ میں حکومتوں کی مماثلت کی وجہ سے تو شاید یہ تعلق بھی بنتا ہو مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یکساں حالات اور ضروریات کی وجہ سے ان مقامات کی انسانی آبادیوں کی سوچ میں یکسانیت پیدا ہو گئی ہو اور نتیجے میں ان کی کاوشوں نے مماثل صورت اختیار کر لی ہو۔

☆

ڈاکٹر اینڈرسن : اہرام اور خفیہ سرنگیں

ان چند علماء اسرار (Occulists) میں جنھوں نے اہرام اور تبت کی خفیہ سرنگوں کی تحقیق و جستجو میں اپنی زندگیاں گزار دیں، ڈاکٹر آرسی اینڈرسن (۳۰۲ گورڈن ایونیو' روزول' جارجیا) ایک خاص مقام کا حامل ہے۔ ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ غیب بین' پیش گو و حاضراتی کی حیثیت سے اینڈرسن اپنے ESP اسٹوڈیو سے جو چیٹانوگا' ٹنی سی' میں واقع ہے تیس برسوں سے زیادہ عرصے تک ضرورت مندوں کے لیے مشاورت کے فرائض سرانجام دیتا رہا ہے۔ چھ فٹ دو انچ لمبا' تین سو پونڈ وزنی دیوزاد ڈاکٹر اینڈرسن لوگوں میں 'زندہ ایڈگر کائس' کے نام سے مشہور ہے۔

حالانکہ ڈاکٹر اینڈرسن کی عمر ساٹھ سے تجاوز کر چکی ہے تاھم اب بھی وہ جوانوں کی طرح طاقت ور اور مستعد ہے۔ اپنی نوجوانی کے زمانے میں اس نے دنیا بھر کی سیاحت کی۔ اس عرصے میں وہ بُل فائٹر' ریسلر' باکسر' بحری تاجر اور تماشہ باز کی حیثیت سے اپنی روزی کماتا اور اخراجات پورے کرتا رہا۔

اس عالمی سیاحت کے دوران میں اس نے ماورائی علوم کے بے شمار مراکز کا بھی دورہ کیا اور وہاں سے بصیرت و آگہی اور وسعت نگاہی میں کمال حاصل کیا۔

''مشرق کے ایک سفر کے دوران ہی میں مجھے سرنگوں اور کھوکھلی زمین کے اسرار کے بارے میں علم ہوا۔'' اینڈرسن نے بتایا۔ ''کئی لوگوں کو یقین ہے کہ زمین کے نیچے وسیع سرنگوں کا جال بچھا ہوا ہے اور یہ سرنگیں دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اہراموں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہیں۔ اس بات کا احتمال بھی ہے کہ یہ سرنگیں اگارتھا سے بھی منسلک ہیں جو زمین کی گہرائیوں میں موجود ہے۔ شمبالا وہ افسانوی شہر ہے جہاں اس زیرِ زمین مملکت کے بیشتر باشندے رہتے ہیں۔ اس افسانوی جنت کا حکمران ایک انتہائی سلیم الطبع شخص ہے جو ''دنیا کا بادشاہ'' کہلاتا ہے۔ ماورائی علوم میں براعظموں کو ملانے والی ان زیرِ زمین سرنگوں کے جال کا یقین ایک بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ ہر تہذیب و تمدن کی روایات میں ان سرنگوں کی داستانیں موجود ہیں۔ تبت کی مہم کے دوران میں لاماؤں نے اینڈرسن کو بتایا کہ یہ سرنگیں سمندروں کے نیچے سے گزرتی ہیں۔ ان سرنگوں کی تخلیق کا سرا قدیم نسلِ انسانی کے سر ہے جن میں ایٹلانٹین (Atlanteans) سرفہرست ہیں۔ یہ سرنگیں دور دراز کے علاقوں میں جانے والی تجارتی شاہراہیں تھیں۔'' ان لاماؤں نے مجھے ان زیرِ زمین شاہراہوں کا ایک نقشہ بھی دکھایا جو ایٹلانٹک کے وسط میں ایک وسیع و عریض جزیرے تک جاتی تھیں۔ ان سرنگوں کے کچھ راستے یورپ' افریقہ' ایشیا اور امریکاؤں تک بھی جاتے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ نقشہ بے حد قدیم ہے۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نقشے میں افریقی سرنگ کا خاتمہ مصر کے عظیم اہرام پر ہوتا تھا۔"
تقریباً ایک سو سال پہلے میڈم ہیلن پی بلاوٹسکی نے دعویٰ کیا تھا کہ اس کے پاس بھی ایسا ہی ایک نقشہ تھا۔ وہ کہتی ہے۔ "اس نقشے میں سرنگیں 'مدفن' خزانے سے بھرے کمرے اور گھومنے والے پوشیدہ چٹانی دروازے بڑے درست انداز میں دکھائے گئے تھے۔ ہمیں یہ نقشہ ایک بوڑھے پیرو وین نے دیا تھا۔ ان پوشیدہ خزانوں تک پہنچنے کے لیے پیرو وین اور بولیوین حکومتوں کی وسیع پیمانے پر مدد کی ضرورت تھی۔ طبعی رکاوٹوں کے علاوہ کوئی ایک فرد یا پارٹی اس مہم کو سر کرنے نکلتی تو اسے قزاقوں اور اسمگلروں کی فوج سے سامنا کرنا پڑتا جن سے وہ علاقہ بھرا پڑا تھا بلکہ اس ساحلی علاقے کی ساری کی ساری آبادی ہی اس کارِ شر میں مبتلا تھی۔ صدیوں سے بند ان سرنگوں کی متعفن فضا کی صفائی ہی جان جوکھوں کا کام تھا جہاں وہ خزانہ دفن ہے اور روایات کے مطابق یہ خزانہ اس وقت تک مدفون رہے گا جب تک کہ پورے شمالی اور جنوبی امریکا سے اسپین حکومت کے آخری آثار تک معدوم نہیں ہو جاتے۔ آیا ان زیرِ زمین سرنگوں کا وجود ہے یا نہیں یا یہ سرنگیں عظیم اہرام کو دنیا کے دوسرے علاقوں سے ملاتی ہیں یا نہیں' ایک غور طلب مسئلہ ہے۔ مگر ڈاکٹر اینڈرسن کے مطابق "دنیا کے کسی حصے میں آپ چلے جائیں ان سرنگوں کا تذکرہ ضرور سننے میں آئے گا۔ حال ہی میں ٹیکساس کا آئل مین جون شا اور میں غزہ کے عظیم اہرام کو دیکھنے گئے تھے۔ ہمارے گائیڈوں میں سے ایک عرب گائیڈ سطح مرتفع غزہ کے نیچے سرنگوں کی تلاش میں سرگرداں رہ چکا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کے پاس ایک قدیم نقشہ تھا جو سرنگوں میں داخل ہونے کے مقام کی ٹھیک ٹھیک نشان دہی کرتا تھا۔ گائیڈ کا خیال تھا کہ یہ مقام دراصل زیرِ زمین دنیا میں داخل ہونے کا دروازہ تھا۔"
ڈاکٹر اینڈرسن نوجوانی ہی سے اہراموں' سرنگوں اور ماورائی داستانوں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ "میں

ممی کا تابوت: جب لاش کو لینن کے نفیس کپڑے میں لپیٹا جاتا تھا تو وہ گلنے سڑنے سے محفوظ ہو جاتی تھی اور پھر مردے کے گھر والے اُسے خوشبو اور مصالحے لگا کر حنوط (Mummy) کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے تابوت کے اندر غیب کی دنیا کے دیوتاؤں کی تصاویر نقش کی جاتی تھیں اور اوپر سے رنگین تصاویر اور تحریروں سے منقش کیا جاتا تھا تاکہ مرنے والے کو اوسرس کی سلطنت میں پہنچایا جائے اور اس کی تقدیر کا فیصلہ اس کے حق میں ہو۔

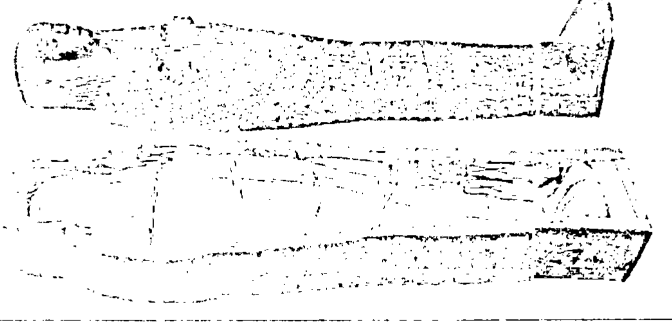

اس وقت ایک خوش مزاج' خوش حال آوارہ گرد تھا۔ مجھ میں چھ جوانوں جتنی طاقت تھی اور ایک درجن بچوں جتنا تجسس تھا۔ میرا ایک دوست غیر ملکی زبانوں اور لہجوں میں خاصی واقفیت رکھتا تھا۔ ہمیں توقع تھی کہ ہم دنیا بھر کو کھنگال ڈالیں گے اور پھر عرصہ دراز بعد جب ہم نے سیاحت ترک کر کے قیام کا فیصلہ کیا تو اس وقت تک ہر وہ چیز دیکھ چکے تھے جس کا تصور کیا جا سکتا تھا بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی مقامات کی سیر ہو چکی تھی۔" اس سیاحت کا سبب اینڈرسن کی غیب بینی یا روحی قابلیت تھی۔ اس بے مثال صفت کا اظہار اس وقت سے ہی ہونے لگا تھا جب وہ ایک نوجوان لڑکا تھا اور گرینگر آئیوا میں اپنے خاندانی گھر میں رہتا تھا یہ ۱۹۱۸ء کی بات تھی۔ میں ہمیشہ سے ہی اپنے بھائی نیلسن سے بے حد قریب رہا۔" اینڈرسن نے بتایا۔" بھائی نے گھر چھوڑ کر کینیڈین آرمی میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ وہ یورپ میں تھا اور مورچے میں بند جرمنی کے خلاف ایک خونی جنگ لڑ رہا تھا۔

اس وقت اینڈرسن اپنے گھر میں فرش پر کھیل رہا تھا کہ خود بخود اس کی نظریں دیوار پر ٹنگی اپنے بھائی کی تصویر پر جا کر ٹھہر گئیں۔" کوئی مجھے نیلسن کی تصویر پر نظر جمائے رکھنے پر مجبور کر رہا تھا۔" اینڈرسن نے بتایا۔" میرے جسم میں ایک عجیب سی لہر یا سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ پھر میں نے نیلسن کو دیکھا وہ میدان جنگ میں بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک اس کے چہرے پر ایک گولی لگی اور اس سے پہلے کہ وہ زمین پر گر پڑتا میں جان گیا کہ گولی کا زخم بڑا کاری تھا۔ اور جب یہ منظر معدوم ہوا تو اسی وقت نیلسن کی تصویر پر لگا شیشہ زور سے تڑخا اور اس کی کرچیاں زمین پر بکھر گئیں۔ چھوٹا بوبی اینڈرسن دوڑتا ہوا اپنی ماں کے پاس باورچی خانے میں گیا اور چلایا" نیلسن مر گیا۔ اسے گولی لگی ہے۔" مسز اینڈرسن نے غصے میں آکر ننھے اینڈرسن کے گال پر تھپڑ رسید کر دیا۔ بچہ پہلے ہی بے حد خوفزدہ ہو رہا تھا۔ ماں نے اپنی انگلیاں اس کے شانوں میں گاڑ کر اسے بری طرح جھنجھوڑ دیا۔" ایسی باتیں مت سوچو' بوبی۔" ماں نے اس کی منت کی۔" اپنے بھائی کے بارے میں ایسی باتیں مت کہو۔"

بد قسمتی سے بوبی اینڈرسن کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔ چند روز بعد کینیڈین آرمی کی طرف سے ایک ٹیلی گرام آیا جس میں نیلسن اینڈرسن کی موت کی خبر تھی۔ نوجوان اینڈرسن کے چہرے پر ایک گولی اچٹتی ہوئی لگی تھی اور وہ جاں بر نہیں ہو سکا تھا۔" اس تجربے نے میرے ذہن پر بڑے خوفناک اثرات مرتب کئے"۔ اینڈرسن نے کہا۔" میں عمر کے ساتھ ساتھ اس صفت کو بھلانے کی کوشش کرتا رہا۔" اس منظر کا تاثر برسوں تک میرے ذہن پر غالب رہا مجھے علم نہیں تھا کہ غیب بینی یا پیش گوئی کی یہ صفت خدا کی طرف سے کوئی تحفہ تھی یا کوئی شیطانی چکر تھا۔ میں نے کبھی خدا سے ESP کی دعا نہیں مانگی تھی جو اس زمانے میں" دوسری نظر" کہلاتی تھی۔ میں معمول کی زندگی جینا چاہتا تھا۔ اُن دنوں میں ESP کے حامل لوگوں کو غیر معمولی اور کسی قدر عجیب سمجھا جاتا تھا۔ پھر جب اینڈرسن جوان ہوا تو اس کے دل میں غیب دانی یا روحی قابلیتوں کے بارے میں تجسس پیدا ہوا" جب میں دنیا میں گھوم رہا تھا۔" اس نے کہا۔" تو میں اس علم کے کئی ماہرین سے ملا۔ میں اور میرا دوست ہر معاملے سے دلچسپی رکھتے تھے مگر نامعلوم چیزوں کو احاطۂ علم میں لانے سے

ہمیں کچھ زیادہ ہی بلکہ بہت ہی زیادہ دلچسپی تھی۔"

اینڈرسن اور اس کا دوست فرینک شیرر ہندوستان جانے والے ایک تجارتی جہاز پر جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ پراسرار سرزمین اس وقت برطانیہ کے زیرِ تسلط تھی۔ سائی کک اینڈرسن نے بتایا۔ "ہم اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے برطانوی فوج کی مختلف پوسٹوں (چوکیوں) پر مشق کیا کرتے تھے۔ میں اس وقت اتنا طاقت ور تھا کہ گاڑی کو اکیلا ہی ایک طرف سے اٹھا لیتا یا اسے پکڑ لیتا تو ہلنے نہیں دیتا تھا۔ جہاں کہیں ہم جاتے ہماری شاندار پذیرائی ہوتی۔ ایک چھوٹی سی پوسٹ پر میں اس طرح اسٹیج پر آیا کہ ایک ٹٹو میرے کاندھوں پر تھا۔" ہندوستان میں قیام کے دوران اینڈرسن اور اس کے دوست نے ہمالیہ اور اس کی برف پوش چوٹیوں کے پاس پراسرار سرزمین کے بارے میں سنا۔ "ہم نے کیمپنگ کا سامان جمع کیا اور ایک بوڑھے کرنل نے ہمیں ایک پاس دیا جس کی مدد سے ہم ریل گاڑی کے ذریعے کسی بھی جگہ جا سکتے تھے۔" اینڈرسن نے بتایا۔ "پھر ہم پہاڑوں کے پار کی سرزمین کے سفر پر روانہ ہو گئے۔"

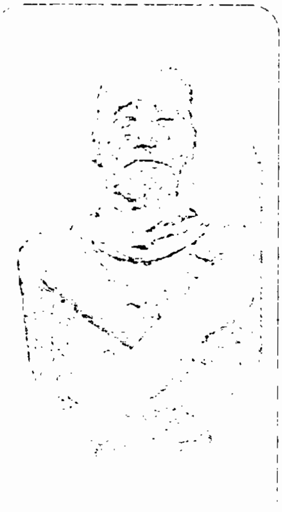

وحشت ناک ہیرو: فرعون رعمیس سوئم کا حنوط شدہ جسم جس نے مصر پر بارہویں صدی قبل مسیح میں حکمرانی کی اس کی آنکھیں لینن کے نفیس کپڑے سے باندھی گئی ہیں اور اس کے ہاتھ ابھی تک سینے سے لگے ہوئے ہیں یہ تصویر اداکار بورس کارلوف کی ہے جس نے فلم "دی ممی" کے لیے فرعون رعمیس کے انداز کو اپنایا تھا جسے دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔

یہ وہ دور تھا جب چین، منگولیا اور تبت کے الگ تھلگ علاقوں پر جنگی آقاؤں یعنی وار لارڈز (Warlords) کی حکمرانی تھی۔ یہ جنگجو سردار نہ کسی بادشاہ کو خراج دیتے تھے نہ ہی کسی اور کی حکومت تسلیم کرتے تھے۔ وہ لوگ اپنے اپنے علاقوں کے مطلق العنان حکمراں تھے۔" اینڈرسن نے بتایا۔ "ان کی اپنی فوجیں تھیں۔ اپنے خدام تھے، اپنے پیروکار تھے وہ لوگوں سے بندوق کی نال پر ٹیکس وصول کرتے تھے۔ وہ فوجوں کی قوت کے بل بوتے پر زندہ رہتے اور اسی پر مر جاتے۔ بعض سرداروں کی فوجوں کی تعداد ہزاروں میں تھی تاہم ان کی حیثیت قزاقوں سے ذرا ہی برتر تھی۔ مجھے میری جسمانی قوت پر اور فرینک کو ذہانت اور زبان دانی پر بھروسہ تھا جس کی مدد سے ہم ہر رکاوٹ کا سامنا کر سکتے تھے اس کے باوجود ایک دو مواقع ایسے آ ہی گئے تھے کہ گردن بچانی مشکل ہو گئی تھی۔ میرا مطلب واقعی گردن زنی سے ہے کیونکہ ان لوگوں کے ہاں ایک جناتی تلوار سے اپنے دشمنوں کی گردنیں اڑا دینے کا رواج تھا۔

ایشیا اس زمانے میں افراتفری اور ہنگاموں کے گرداب میں پھنسا ہوا تھا۔ جنگی سردار بیرونی علاقوں پر قابض تھے اور زمین داروں اور دیہاتیوں سے خراج وصول کرتے تھے۔ زمین راہبوں، بھکشوؤں،

سفید روسی پناہ گیروں اور لمبی لمبی مونچھوں والے تاتاریوں سے بھری ہوئی تھی جو کمیونسٹ روس سے اپنی بیویوں' خاندانوں اور مویشیوں کے ساتھ بھاگ آئے تھے۔ کرائے کے فوجی اور مہم جو مشرق بعید میں دولت کی حفاظت یا چند روز آرام کی خاطر کسی گرم علاقے کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ ''فرینک چونکہ کئی زبانوں کا ماہر تھا۔ اس لیے ہمارا ان لوگوں کے ساتھ اچھا خاصا گزارا ہو جاتا تھا۔'' اینڈرسن نے بتایا۔ ''ہر شخص سے گفتگو کرنے کا اس میں عجیب و غریب وصف تھا۔ وہ صحرائے گوبی کے کسی قبائلی سے ملتا اور چند ہی گھنٹوں میں اس کا لہجہ اور زبان اپنا لیتا۔''

کھو کھلی زمین کی داستان اینڈرسن کو سب سے پہلے تبت کے سفر کے دوران میں سننے کو ملی۔ ''ہم لہاسا جانے کا سوچ رہے تھے جو وہاں کا صدر مقام تھا تاکہ 'زندہ بدھا' کو سن سکیں۔'' اینڈرسن نے بتایا۔ ''اس وقت ہم چین کے صوبے سنکیانگ سے آ رہے تھے۔ جنگی سرداروں کا ایک گروہ آپس کے جھگڑوں میں الجھا ہوا تھا اور وہ خوفناک مشرقی انتقامی جذبے کے تحت ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ چنانچہ ہمارے زندہ رہنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہاں سے بھاگ نکلیں۔'' اینڈرسن اور فرینک لہاسا جانے والے ایک ویران راستے پر سفر کر رہے تھے۔ ''اچانک اپنے عقب سے ہم نے خوفناک بگلوں کی آواز سنی۔ ہم نے مڑ کر دیکھا اور دوست! یقین کرو یا مت کرو وہ ایک گاڑی تھی (آٹو موبائل) جو سڑک پر چلی آ رہی تھی۔ ایک ٹھکی پٹی پرانی اسٹینلے اسٹیمر جسے دو بیل کھینچ رہے تھے کار میں ایک انتہائی موٹا وارلارڈ (جنگی سردار) بیٹھا ہوا تھا۔

اس نے اپنا روایتی فر کا لباس پہنا ہوا تھا اور ایشیائی شراب کے نشے میں دھت تھا۔ ہمیں پتا چلا کہ وہ اسی علاقے کا سردار تھا۔ جنگی سردار کا قافلہ ان دونوں امریکنوں کے قریب آ گیا۔ ''کار میں صرف سردار ہی بیٹھ سکتا تھا۔'' اینڈرسن نے بتایا۔ ''اس کی بیویاں اور بچے بھی پیدل چل رہے تھے۔ یہ بوڑھا سردار ان لوگوں میں سے تھا جو عورتوں کی آزادی پر ذرا یقین نہیں رکھتے۔'' منگول سردار نے کار سے اتر کر دونوں امریکنوں کا مسکرا کر استقبال کیا اور بڑی گرم جوشی سے معانقہ بھی کیا۔ ''وہ ہمیں دیکھ کر بے حد محظوظ ہو رہا تھا۔ اس نے یہ کار حال ہی میں کسی کو قتل کر کے حاصل کی تھی۔ یہ مالِ غنیمت اس کے لیے بڑی مسرت اور فخر کا باعث تھا۔ اس کے راہبوں میں سے ایک اس کا چیف مکینک تھا مگر وہ بھی اتنا ہی بڑا مکینک تھا کہ کار کو چلانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔'' ان کا کار چلانے کا طریقہ بھی بڑا وحشیانہ تھا۔'' اینڈرسن نے ہنستے ہوئے بتایا۔ ''مکینک راہب نے کئی لوگوں کو ڈنڈے پکڑ کر کار کے گرد کھڑا کر دیا اس کا اشارہ پاتے ہی یہ لوگ ڈنڈوں سے کار کو پیٹنے لگے اس کے بعد راہب نے 'دنیا کے بادشاہ' سے مدد کی دعا کی مگر دنیا کا بادشاہ بھی کار چلانے میں ان کی مدد کو نہ آیا۔''

فرینک کو مشینری میں بھی ورک حاصل تھا۔ ہم نے کار کے کچھ پرزے ادھر ادھر کیے دو گھنٹوں کی محنت کے بعد بوائلر بھر گئے اور کار چلنے لگی۔ سردار کچھ دیر تک اسے ادھر ادھر دوڑاتا رہا۔ اس نے بہ اسرار ہمیں بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ کار کا انجن ایک بار پھر خاموش ہو گیا اور دونوں بیلوں کو دوبارہ اس کے آگے جوت دیا گیا اور سفر شروع ہو گیا۔ بڑی دیر بعد سردار اچانک چلایا اور کارواں ٹھہر

گیا۔ کارواں میں شامل اونٹوں اور گھوڑوں کو کار کے چاروں طرف باندھ دیا گیا۔ ایشیائی میدانوں میں پراسرار خاموشی اتر آئی۔ سردار اور اس کے ساتھی کھڑے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ جانوروں کے حلقوں سے دھیمی دھیمی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے وہ خوف زدہ ہوں۔

"دنیا کا بادشاہ بول رہا ہے۔" منگول سردار نے ذرا دیر بعد کہا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر پہاڑی کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔ "وہ' جو سب کو دیکھتا ہے' بولے گا۔"

دونوں امریکی بے یقینی کے انداز میں اپنے میزبانوں کو دیکھ رہے تھے جو اب ایک ساتھ بڑبڑا رہے تھے۔ "اوم' اوم' منی پدم ہونگ!" پھر راہبوں نے سر جھکا دیئے اور زور زور سے وہی منتر دہرانے لگے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اینڈرسن نے کہا اور اپنے دوست کی طرف مڑا۔ "کیا ہو رہا ہے یہ؟"

"اوم' اوم۔" منگول سردار کی آواز گونج رہی تھی۔ "اوم' منی پدم ہونگ۔ کنول کے پھولوں کے عظیم لاما کی خدمت میں سلام۔" کئی منٹ کی پرجوش دعاؤں کے بعد کارواں نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر سفر شروع ہو گیا۔ راہب نے' جس نے سرخ لباس پر زرد پٹکا باندھ رکھا تھا ان دونوں سفید فام امریکیوں کو بتایا۔ "جب 'دنیا کا بادشاہ' لوگوں کے مقدر کے لیے دعا گو ہو تو ہر جاندار کو اپنی حرکات بند کر کے ساکت ہو جانا چاہیئے۔ ہم لوگ جو زمین کے اوپر رہتے ہیں دنیا کے بادشاہ کے ساتھ دنیا کی ہر مخلوق کی نجات کے واسطے اس کی دعاؤں میں شریک ہونا چاہیئے۔"

"یہ بادشاہ کہاں رہتا ہے؟" فرینک نے دریافت کیا۔

"اپنے زیرِ زمین عالی شان شہر میں۔" راہب نے انگلی سے زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "زمین کے نیچے بہت بڑے بڑے اور عالی شان شہر آباد ہیں۔ زیرِ زمین سلطنتیں جہاں مقبول و

تجہیز و تکفین کی کشتی: تجہیز و تکفین کے لیئے مختص کشتی کا ڈیزائن خصوصی طور پر سورج دیوتا کے آخرت کے سفر میں چلانے کے لیئے بنایا جاتا تھا جس میں پیپرس کے نوادرات موجود ہوتے تھے۔ ممی کو کشتی میں بٹھا کر دو عورتیں آہ و زاری کیا کرتیں ان دو عورتوں کو دو چنگیں کہا جاتا اور یہ قتل کیے جانے والے دیوتا اوسرس کے لیئے آہ و بکا کرنے والی دو دیویوں اسس اور نیفرس کی نمائندگی کرتی تھیں اس میں دو منقش چپو ہوا کرتے تھے اور ساتھ ہی چپو چلانے والے کھیون ہار کے لیئے ایک جگہ مقرر ہوتی تھی۔ کشتی کی ایک سائیڈ پر سبز رنگ کیا ہوتا یہ وہی رنگ ہے جو حنوط شدہ لاش کا ہوتا تھا جو بعد از مرگ حشر میں اٹھنے کی علامت ہے۔

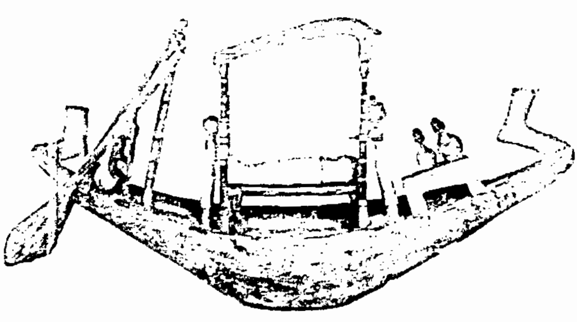

مبارک لوگ جنت میں رہتے ہیں۔"
"تم ان شہروں تک کس طرح جاتے ہو؟"
"بوڑھا لاما راستہ جانتا ہے۔" راہب نے جواب دیا۔ "یہ کوئی ایسا راز نہیں ہے جس میں نامبارک لوگوں کو شریک کیا جا سکے۔ میں نے سنا ہے کہ ایک زیرِ زمین سرنگ ہے جو "اگار تھا" مقدس مقام تک جاتی ہے۔ یہ سرنگیں لہاسا کی قدیم خانقاہوں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہیں۔"

ڈاکٹر اینڈرسن اور فرینک شیرر نے ان باتوں کو مشرقی اوہام کا حصہ سمجھ کر مسترد کر دیا۔ "ہم نے اپنا سفر جاری رکھا اور سہ پہر تک ایک ہموار میدانی علاقے میں پہنچ گئے۔" اینڈرسن نے بتایا۔
"راہب بہت پرجوش دکھائی دے رہا تھا کیونکہ اس نے گویا کہ دنیا کے بادشاہ کا پیغام سن لیا جس میں اس کے ساتھ ہماری شمولیت پر خوشی کا اظہار کیا گیا تھا۔ اگلی صبح اس نے ہمیں جلدی جگا دیا۔ اپنی بگل بجائی اور اعلان کیا کہ اس میدان میں اسٹینلے اسٹیمر کار وہ خود دوڑائے گا۔ میرا اور فرینک کا خیال تھا کہ وہ کار کا جائزہ لینا چاہتا تھا چنانچہ اس نے کار اسٹارٹ کرنے میں اس کی مدد کی۔ وہ جنگی سردار اس کار میں سوار ہو گیا اور۔ زوں زوں۔ وہ کار کو میدان میں دوڑا لے گیا۔ ہر لمحہ وہ اس کی رفتار بڑھائے جا رہا تھا اور اسٹیم ذرا کم نہیں کر رہا تھا۔ اسٹینلے اسٹیمر ہوا کی طرح دوڑتی ہے اور اس نے اُسے ڈھیل دے رکھی تھی۔ پڑاؤ سے تین میل دور مٹی کا ایک طویل اور بلند پشتہ تھا۔ اس نے اسپیڈ بڑھا کر کار اس پشتے پر چڑھا دی۔
اینڈرسن اور دوسرے منگول چونک اٹھے۔ کار کے پہیے اب ہوا میں گھوم رہے تھے "اومیگوش!" فرینک چلایا "کہیں وہ خود کو مار نہ لے۔" پھر وہ اس طرف دوڑ پڑا۔
"گھڑ سوار منگول اس سے پہلے وہاں پہنچ گئے۔ ذرا ہی دیر بعد وہ کار کو سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔" اینڈرسن بتا رہا تھا "بوڑھے چیف کی بڑی بری حالت تھی۔ جب کار پشتے سے ٹکرائی تھی تو کچھ دیر میں اڑتی ہوئی دکھائی دی تھی پھر اس سے پہلے کہ وہ زمین سے ٹکرا کر گرتی بوڑھا ایک جھٹکے سے باہر گر پڑا تھا۔ خوش قسمتی کی بات تھی کہ وہ زندہ تھا۔ بعد میں ہمیں پتا چلا کہ اس نے اس سے پہلے زندگی میں صرف ایک بار کار چلائی تھی۔ اس نے فرینک سے درخواست کی کہ وہ پھر اسے اسٹارٹ کر دے مگر فرینک نے راہب کو بیچ میں ڈال دیا جس نے ذرا دیر کے مراقبے کے بعد اعلان کیا کہ دنیا کے بادشاہ نے کہا ہے کہ بوڑھا چیف پھر کبھی کار نہیں چلائے گا۔"
اینڈرسن اور فرینک کئی ہفتوں تک اس وار لارڈ کے ساتھ رہے پھر ایک رات پڑاؤ سے نکل گئے "بوڑھا فرینک کے پیچھے ہی پڑ گیا تھا کہ کار کو اسٹارٹ کر دے۔" اینڈرسن نے بتایا۔ "اس سے بھی خوفناک بات یہ ہوئی کہ وہ اپنی بیٹی سے میری شادی کرنے پر ضد کرنے لگا۔ وہ واقعی شادی کی رسوم ادا کرنا چاہتا تھا۔ اس کی یہ بیٹی پانچ فٹ لمبی اور کم از کم تین سو پونڈ وزنی تھی اور اس میں بکریوں جیسی بو آتی تھی۔ اس کے علاوہ یوں لگتا تھا جیسے اس کے چہرے کو سینکڑوں ہتھوڑوں سے پیٹا گیا ہو۔ سفر کے دوران میں ہم دونوں نوجوان مہم جو دنیا کے بادشاہ اور زیرِ زمین جنت کے بارے میں

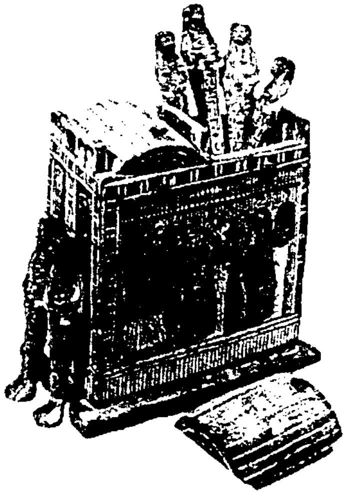

ماڈل خدمت گار: مصریوں کا عقیدہ تھا کہ بعد از مرگ دیوتا اوسرس کو کسی بھی مردے کے دنیا میں کیے گئے کام کی تفاصیل درکار ہوں گی اگر آپ پادری نہیں تو پھر آپ کو اپنی نعش کے ساتھ دیگر زروجواہر کے ساتھ خدمتگاروں کے پتلے بنا کر رکھنے ہوں گے جس سے آپ دیوتا اوسرس کو اپنے کارناموں اور اہمیت کو باور کرواکر آخرت میں نروان حاصل کر سکتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی قبروں میں سینکڑوں کی تعداد میں خدمتگاروں کے پتلے دفن کرواتے تھے حتیٰ کہ فرعون بھی اپنے آپ کو آخرت میں سرخرو کرنے کے لیئے اسی رسم کا اتباع کرتے تھے۔

گفتگو کرتے رہے۔ ہم اس کے بارے میں پوچھتے رہے۔ اینڈرسن نے کہا۔ "چند لوگ کھلم کھلا اس کے بارے میں باتیں کرتے تھے۔ چند ایک نے دعویٰ کیا کہ وہ اس جگہ سے واقف ہیں جہاں سرنگ واقع تھی اور یہ راستہ سیدھا اس خفیہ شہر کو جاتا تھا۔ تاھم ہمیں ایسا آدمی کبھی نہ مل سکا جو واقعی اس جگہ کی نشان دہی کر سکتا۔ بے شمار راہبوں نے' جب ہم نے ان سے اس بارے میں دریافت کیا تو دانتوں تلے زبان دبائی۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ اس راز کو جاننے کے لیے ان کی خانقاہوں کے شہر کے ایک دو بڑے راہبوں سے ملا جائے۔"

اسی زمانے میں اہم ترین لاما تبت کے دارالحکومت لہاسا کے ایک محل میں رہتا تھا۔ دلائی لاما کو تبت میں ایک دیوتا کی طرح پوجا جاتا تھا۔ وہ لاکھوں ماہایانا بدھوں کا روحانی اور دنیاوی پیشوا تھا اور اسے گوتم بدھ کا اوتار سمجھا جاتا تھا۔ ایک اور مذہبی اور سیاسی رہنما تاشی لاما تھا اس کی روحانی سلطنت منگولیا' تبت' منچوریا اور انڈیا کے چند علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ "تاشی لاما شمال مشرقی تبت میں واقع کم بم کی خانقاہ سے حکمرانی کرتا تھا۔" اینڈرسن نے بتایا۔ "پورے ایشیا میں وہ اس وقت دوسرا سب سے زیادہ طاقت ور آدمی تھا۔" "ایک اور ہائی لاما اُرگا سے جو اس دور دراز علاقے کا مرکز تھا' منگولیا کے ایک حصے پر حکومت کرتا تھا۔" "ہمیں کئی بار بوگڈوس (بھگت' پاکباز لوگ) نے یہی بتایا کہ زیرِ زمین سلطنت کا راز اسی وقت کھلے گا جب شینسی (Shensi) کے سات اہراموں کے دروازے کھلیں گے۔" اینڈرسن نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ "بوڑھا بوگڈو ہمارا بہت اچھا دوست بن گیا۔ ہم نے بھی مصر کے اہراموں کے بارے میں سنا ہوا تھا مگر ایشیا کے اہراموں کی بات ہی اور تھی۔ یہ اہرام شینسی صوبے کے دارالحکومت سمیانفو کے مغربی علاقے میں تھے۔"

دونوں نوجوان عظیم کاروانی شاہراہ پر جو پیکنگ' چین سے ہوتی ہوئی بحیرۂ روم کے ساحلوں تک جاتی تھی۔ سفر کرتے رہے۔ "ہم نے ہر گاؤں میں اہراموں کے بارے میں پوچھا۔" اینڈرسن نے بتایا۔ "فرینک مقامی زبان نہیں بول سکتا تھا مگر عام طور پر ہر جگہ ایک ایسا سردار ہوتا تھا جو خاص چینی

زبان بول اور سمجھ سکتا تھا۔ ایک جگہ ایک بوڑھے نے بتایا کہ اہرام اس گاؤں سے دو دن کی مسافت پر تھے۔

یہ کاروانی شاہراہ گردآلود راستہ تھا جس پر برسوں سے تجارتی قافلے گزرتے رہے تھے۔ اس راستے پر مصالحے کمیاب خوشبوئیں (عطریات) اور مشرق کے دیگر خزانے اونٹوں کے قافلوں پر لے جائے جاتے تھے۔ "مشرقیوں کو ایشیا میں اہراموں کی موجودگی پر ذرا بھی حیرت نہیں ہے۔" ڈاکٹر اینڈرسن نے کہا۔ "یہ علم ان کے لیے بڑی تقویت کا باعث تھا کہ دیوتاؤں نے انھیں الوہی روشنی سے نوازا ہوا تھا۔ بوگڈوس کا ایمان تھا کہ ان کا تعلق دنیا کے ابتدائی راہبوں کی نسل سے تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ تبت اور ایشیا کا ارضِ مرتفع (پہاڑی یا کوہستانی علاقہ) دنیا کی قدیم ترین سرزمین تھا۔ چند ریکارڈ اور دستاویزات دیکھ کر میں بھی ان کے اس خیال سے متفق ہو گیا تھا۔

اہراموں کے اطراف کی زمین وسیع تھی۔ پورے علاقے سے جنگلات کا صفایا کر کے اسے زراعت کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ وہاں چپٹی چوٹیوں والے سات اہرام تھے بیرونی حد پر تین دیو قامت مجسمے نصب تھے۔

"بڑے اہرام سے دو میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔" اینڈرسن نے بتایا۔ "ہم نے وہاں کے بوڑھے لاما سے اہراموں کے متعلق پوچھا تو وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ یہ اہرام ایشیا کا ایک اور چیستاں تھے۔ مندروں کے پرانے کاغذات میں ان اہراموں کا تذکرہ موجود تھا۔ اسے یقین تھا کہ ان میں پانچ یا شاید چھ اہرام ہزاروں سال پرانے تھے۔ یقینی طور پر کسی کو علم نہ تھا کہ انھیں کس نے تعمیر کیا یا کروایا تھا۔ کیوں کروایا تھا اور اس ہموار میدانی علاقے میں انھیں کس طرح تعمیر کیا گیا تھا۔"

اینڈرسن فرینک اور بوڑھا لاما سب سے بڑے اہرام کے معائنے کے لیے چل دیے۔ "یہ اہرام دنیا میں انسانی ہاتھوں سے تعمیر کی گئی سب سے بڑی عمارت بھی ہو سکتی تھی۔" اینڈرسن نے کہا۔ "ہم نے اندازہ لگایا کہ اس کی بنیاد کا رقبہ دو ہزار فٹ اور بلندی بارہ سو فٹ تھی۔ اس طرح ایشیا کا یہ اہرام مصر کے اہرام سے تقریباً دگنا بڑا تھا۔ (اینڈرسن نے ۱۹۷۰ء میں غزہ میں مصری اہراموں کی سیاحت بھی کی تھی اور اسے یقین تھا کہ وہ دنیا کا واحد آدمی ہے جس نے ایشیا اور مصر دونوں کے اہراموں کو دیکھا ہے۔)

"ہمارے پاس ایک کمپاس بھی تھا اور ہم نے دیکھا کہ اہرام کی چاروں سمتیں کمپاس (قطب نما) کے چاروں نقاط کی طرف تھیں۔ وہ لوگ بلاشبہ اپنے کام کے بڑے ماہر تھے۔ اینڈرسن نے بتایا۔ "چاروں جانب کی دیواروں پر اب بھی کہیں کہیں رنگ جھلک رہے تھے جس سے پتا چلتا تھا کہ ہر جانب کی دیوار رنگ دار تھی۔ مشرقی دیوار سبز تھی۔ جنوبی سرخ اور مغربی دیوار پر کالا رنگ کیا گیا تھا۔ شمالی دیوار کا رنگ سفید تھا۔ ان اہراموں کی چوٹیاں ہموار تھیں اور ان پر زرد رنگ کی جھلک موجود تھی۔"

اینڈرسن اور اس کا ساتھی جب اس جناتی اہرام کو حیرت سے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے تو بوڑھے راہب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ "کیا اب بھی تمھیں یقین ہے کہ سفید چمڑی والے

غیر ملکی شیطان ہی دنیا کی واحد ذہین مخلوق ہے ؟اس نے دریافت کیا۔
''یقیناً کوئی جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہے تھے۔''حیرت زدہ اینڈرسن بولا
''پتا نہیں کون تھے وہ لوگ ؟''فرینک بڑبڑایا۔
راہب نے اپنے شانے اچکائے' جانتا ہوں کہ قدیم ترین کتابوں کا دعویٰ ہے کہ جب وہ طومار لکھے گئے تھے تو وہ بہت بوڑھے تھے۔ان کے بارے میں حقیقتاً کوئی نہیں جانتا۔''
''آخر کسی نے انہیں کھولنے کی کوشش کیوں نہیں کی ؟''
''شاید یہ کام ہم لوگ کسی دن کر ڈالیں۔''راہب نے کہا''ابھی اس کام کے کرنے کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔ہمارے پاس لامتناہی زمانہ ہے۔''
''کیا کسی اور سفید چمڑی والے نے انھیں پہلے دیکھا ہے۔''
''چند ایک نے''۔''بوڑھے راہب نے بتایا۔''گاؤں کے سردار کا کہنا ہے کہ جب وہ بچہ تھا ایک سفید شیطان اس طرف آیا تھا۔''
ڈاکٹر اینڈرسن مسلسل جناتی اہرام کو گھور رہا تھا' کیا ان چیزوں کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔''وہ بولا
''یقیناً اس ملک میں کہیں تو کوئی ایسا آدمی ہو گا جو ان کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔''
''سب سے طاقت ور لاما۔زندہ بدھا ہی جانتا ہو گا۔''راہب نے کہا۔''مگر میں نہیں سمجھتا کہ وہ کسی سفید شیطان کو اس راز کے بارے میں سب کچھ بتائے گا۔''
''تمھارا ان کے بارے میں کیا خیال ہے ؟''فرینک نے پوچھا
''یہی کہ دنیا کے بادشاہ کے تمام راز اندر ہی دفن ہیں۔''راہب بولا۔''ہمارے لوگوں کے قدیم ریکارڈ اور ان سے پہلے لوگوں کے اور ان سے بھی پہلے لوگوں کے سب یہیں موجود ہیں۔جب وقت آئے گا اور جب دنیا کا بادشاہ اپنی موجودگی کا اعلان کرے گا تو یہ سارے زیرِ زمین مقامات کھل جائیں گے۔''
''اس کہانی کے بارے میں کیا خیال ہے جو مجھے ایک بوڑھے بوگڈو نے سنائی تھی ؟''اینڈرسن نے پوچھا۔''اس نے کہا کہ ان اہراموں کے نیچے داخلی سرنگیں ہیں۔یہ سرنگیں مصر کے اہراموں سے اور بلند ترین خانقاہوں سے بھی منسلک ہیں اور سمندروں کے نیچے سے بھی گزرتی ہوئی دنیا کے تمام علاقوں کو آپس میں ملاتی ہیں۔''
''مجھے علم نہیں ہے۔''بوڑھا راہب بولا۔''ان کی طرف حیرت سے دیکھنا ہی کافی ہے۔آدمی کو اس قدر متجسس نہیں ہونا چاہیئے۔کسی کو بھی زیرِ زمین جنت میں جانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔میں نے کچھ لوگوں کے بارے میں سنا ہے جنھوں نے وہاں جانے کی کوشش کی تھی اور ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئے تھے۔''
تینوں آدمی اس یادگار عمارت سے دور چلتے جا رہے تھے۔اس وقت سورج اپنے اختتامی سفر پر تھا اور افق میں ڈوب رہا تھا۔''میں نے پھر ان اہراموں کو نہ دیکھا اور نہ ہی ۱۹۵۰ء تک ان کے بارے میں کچھ

سنا۔" ڈاکٹر اینڈرسن نے بتایا۔ "پھر ایک میگزین میں ان کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا۔ ان پچھلے تمام برسوں میں کچھ پرانے دوست ان ایشیائی اہراموں کے بارے میں میری پراسرار داستانوں کا مذاق اڑاتے رہے تھے۔ اب مجھے ان کا منہ چڑانے کا موقع مل گیا جب میرا نائب وہ میگزین جس میں مضمون چھپا تھا لے کر میرے پاس آیا۔ وہ بہت پرجوش ہو رہا تھا۔ مضمون کے ساتھ ان اہراموں کی تصویر بھی تھی جو یو ایس آرمی کے طیارے نے ۱۹۴۶ء میں اتاری تھی۔ وہ عمارات ہمیشہ کی طرح بڑی گھمبیر نظر آ رہی تھیں۔ میں یہ ثبوت پا کر بہت خوش ہو رہا تھا کیونکہ لوگ مجھے بڑھانکنے والا سمجھنے لگے تھے۔ پھر اس علاقے پر کمیونسٹوں نے قبضہ کر لیا اور اس کے بعد ان انسانی ہاتھوں سے تعمیر شدہ عظیم عمارات کے بارے میں کچھ سننے میں نہیں آیا۔"

لہاسا اور کم بم کی خانقاہوں کی سیاحت کے دوران میں ڈاکٹر اینڈرسن نے زندہ دیوتاؤں کے مورخوں کو بھی ڈھونڈ نکالا۔ "سرخ دیوتا کی مہربانی سے مجھے ان کی لائبریری میں جانے کا موقع مل گیا۔" اس نے بتایا۔ "وہ ہر دن کے واقعات کو ایک بہت بڑی کتاب میں رقم کرتے تھے۔ ان کی ایک تاریخ تھی جو ہزاروں برسوں پر محیط تھی۔ یہ راہب لکھنے کے لیئے چھوٹے چھوٹے برش استعمال کرتے تھے جنہیں روشنائی میں ڈبویا جاتا تھا تحریر کے معاملے میں وہ واقعی جادوگر تھے ان میں چند ایک کتابیں اور طومار (Scrolls) کے بارے میں ان کا دعوٰی تھا کہ وہ دس ہزار سال پرانے تھے مجھے ہمیشہ اس بات کا افسوس رہے گا کہ میں انھیں پڑھ نہیں سکا۔ میں صرف آٹھ کلاس تک پڑھا ہوا تھا اور میری خوش قسمتی تھی کہ میں امریکی زبان پڑھ سکتا تھا مگر وہ کتابیں اور طومار تو مجھے یوں لگ رہے تھے جیسے چینی لانڈری کے ٹکٹ ہوں۔"

ان مقدس خانقاہوں میں سے ایک میں اینڈرسن اور فرینک کو چینی مٹی کے برتن میں رکھی ہوئی چکنی مٹی کی بنی ہوئی کئی ٹکیاں اور طبق (Tablets and discs) دکھائے گئے۔ یہ ساری کی ساری ایسے نشانات سے بھری ہوئی تھیں جیسے کسی نے ان کے گیلے پنے کی حالت میں نوکیلی چیز سے ان پر کھدائی کی ہو۔ ڈاکٹر اینڈرسن نے بتایا۔ "ان پر کئی تصویریں بھی بنی ہوئی تھیں جن میں اہراموں کی تصاویر بھی شامل تھیں۔"

"یہ ٹکیاں (Tablets) کم از کم بیس ہزار سال پرانی ہیں۔" لاما نے بتایا

"کیا میں انھیں چھو سکتا ہوں۔" اینڈرسن نے پوچھا

"کیوں نہیں۔" لاما نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ بڑی شاندار حالت میں ہیں۔"

نوجوان امریکی نے بڑی احتیاط اور نزاکت سے اپنی ایک انگلی ایک ٹکیہ پر پھیری۔

"تمھارے علاوہ آج تک کسی سمندروں پار سے آنے والے نے یہ کام نہیں کیا۔" لاما نے ان کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

"ان پر کیا لکھا ہوا ہے؟" فرینک نے ٹکیاؤں کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ وہ کچھ زیادہ ہی متجسس ہو رہا تھا۔

"یہ تمام ان لوگوں کے بارے میں ہیں جو عظیم سمندروں کے وسط میں واقع زمینوں پر آباد تھے۔

پیشوا نے بتایا۔ ”انھوں نے مندر بنائے تھے' خانقاہیں بنائی تھیں ہمارے آباؤ اجداد سے تجارتی روابط تھے' اور وہ اہرام تعمیر کیے تھے جن کا تم نے ابھی تذکرہ کیا تھا۔“

”وہ لوگ کون تھے ؟“

لاما نے اداسی سے سر ہلایا ”کوئی نہیں جانتا۔“ وہ بولا۔ ”ہماری لائبریری میں اور بھی ایسی تختیاں ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ کس طرح ان کی سرزمین گہرے پانیوں میں غرق ہو گئی تھی۔ پھر ایک مذہبی رہنما انھیں سرنگوں کے ذریعے اگارتھا تک لے گیا اور وہ دنیا کے بادشاہ کے ساتھ شمبالا میں رہنے لگے ہیں۔“ ”کیا ان اہراموں کے نیچے سے سرنگوں کا راستہ جاتا ہے ؟“ اینڈرسن نے پوچھا

”دوسری چیزوں کے علاوہ۔“ لاما کہنے لگا۔ ”پوری دنیا میں کئی مقامات پر اس قسم کی علامات ہیں جو سرنگوں میں داخل ہونے کے راستے کی نشاندہی کرتی ہیں۔ لیکن ان علامات کا علم صرف انہی لوگوں کو ہے جنھیں ہونا چاہئے۔ کیا تم نے پہاڑوں کی سطح زمین (Sides) پر کھدے ہوئے عجیب و غریب نشانات نہیں دیکھے ؟ کیا تمھیں تعجب نہیں ہوا کہ ماضی بعید میں مسطح چٹانوں پر یہ غیر معمولی کندہ کاری کس نے اور کیوں کی تھی ؟ جاہل لوگ ان پراسرار تحریروں کو نظر انداز کر کے ذہن سے نکال دیتے ہیں مگر وہ لوگ جو سرنگوں کے راستے کی جستجو میں ہوتے ہیں انہیں شناخت کر لیتے ہیں کہ یہ وہ نشانات ہیں جو اگارتھا کے دارالحکومت شمبالا کی طرف ان کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔“

کم بم کی اسی خانقاہ میں اینڈرسن کو ٹیلی پیتھی کے سفر کے راز سے آگاہ کیا گیا۔ ”بیٹے، چند بوڑھے راہب اس قدر ذہنی قوت کے مالک ہیں کہ کوئی انسان اسے سمجھ ہی نہیں سکتا۔“ لاما کہہ رہا تھا۔ ”وہ اپنے ذہن کو اِدھر اُدھر ماضی اور مستقبل میں دوڑاتے رہتے ہیں۔ ان کا اپنا الگ الگ گروہ ہے۔ پروفیسر حضرات ان کی اس صلاحیت کی داستانوں پر ہنسا کرتے تھے مگر اب انھوں نے اپنی نفسیاتی لیبارٹریز میں ان کا سائنسی تجزیہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ جو لوگ ان باتوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے اب انسانی ذہن کی لامحدود قوتوں اور وسعتوں کو دریافت کرنے لگے ہیں۔ اگر ہم برے خیالات اور منفی رجحانات کو ذہن سے نکال دیں تو

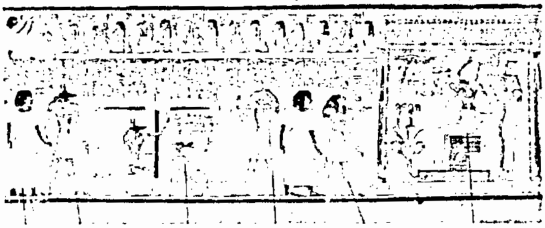

دل کو تولنا: اس تصویر میں مردہ آدمی کے ماضی میں کیے گئے اعمال کا حساب دیکھنے کے لئے اس کے دل کا وزن ناپا جا رہا ہے۔ مصر کے ہر ایک ضلع سے تعلق رکھنے والے دیوتاؤں کا گروہ مردے سے سوال و جواب پوچھتا ہے جو تصویر کے اوپر حصے میں منقش ہیں۔ وہ مردے پر الزام لگاتے ہیں کہ تم نے یہ یہ جرائم کئے ہیں مگر وہ اس کی تردید کرتا ہے اگر وہ سچ کہتا ہے تو ابس کا سر لگائے آزادی کا دیوتا تھوتھ لکھتا ہے کہ اس کی بات سچی ہے اور وہ اوسرس کی سلطنت میں جا سکتا ہے جو ایک سائبان تلے براجمان ہے اور اگر مردہ جھوٹ بولتا ہے تو ”مردوں کی دیوی“ اس کا دل کھا جاتی ہے اور پھر بعد از مرگ وہ زندہ نہیں رہ پاتا اور ہمیشہ کے لیے مر جاتا ہے۔

سب کچھ کر سکتے ہیں۔ جو لوگ اس راہ کے مسافر ہیں انھیں بہت کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔ ایک سچے متلاشی پر یہ راستہ خود بخود منکشف ہو جاتا ہے۔"

روز ول جارجیا میں اپنے ای ایس پی اسٹوڈیو میں، میں نے ڈاکٹر اینڈرسن سے انٹرویو کے دوران کھوکھلی زمین کی داستان یا روایت کے بارے میں جو سوالات کیے تھے ان کی تفصیل حاضر خدمت ہے۔

سوال :- کیا کبھی دلائی لاما یعنی زندہ بدھا سے آپ کو بالمشافہ گفتگو کرنے کا موقع ملا ؟

ڈاکٹر اینڈرسن : اپنی مہم کے اختتام پر ہم آخر لہاسا پہنچے۔ دلائی لاما وہاں ایک عالی شان خانقاہ میں سینکڑوں خدام' راہبوں اور نائبین کے ساتھ رہتا تھا۔ دلائی لاما کا ذاتی معالج ایک انگریز تھا۔ اسی کے ذریعے ہماری رسائی دلائی لاما تک ہو سکی تھی۔ جب ہم اس مقدس شہر میں پہنچے تھے تو اس انگریز ڈاکٹر نے بھائیوں کی طرح ہمارا استقبال کیا تھا۔ اس سے قبل وہ ہندوستان میں بادشاہ کی فوج سے منسلک تھا۔ پھر وہاں اس کا کسی سے جھگڑا ہو گیا اور وہ بھاگ کر تبت آ گیا۔ میرے خیال میں وہاں اس سے کوئی قتل ہو گیا تھا کیونکہ اس نے بتایا تھا کہ اب وہ دوبارہ کبھی مہذب دنیا میں لوٹ کر نہیں جا سکے گا۔ ہم نے اس کے حالات کی زیادہ چھان بین کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہمیں یعنی انگریزی زبان بولنے والوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر موت کی زردی سی پھیل گئی تھی۔

تبتیوں کے گھروں' عمارات اور خانقاہوں میں جو سب سے پہلی بات آپ محسوس کرتے ہیں وہ وہاں پھیلی ہوئی بو ہے۔ یہ لوگ اس وقت تک نہیں نہاتے جب تک اتفاقاً دریا میں نہ گر جائیں۔ نہ ہی ان کے ہاں کوڑا کرکٹ اور گندے پانی کی نکاسی کا انتظام تھا۔ ایک طرف تو وہ انتہائی غربت اور کسمپرسی کی زندگی گزارتے تھے اور دوسری طرف ان کی ذہنی سطح اور روحانی حالت انتہائی بلندی پر اور ترقی یافتہ تھی۔ میں ہمیشہ ہی اس تضاد پر الجھن میں مبتلا رہا۔

سوال : پھر کیا ذاتی طور پر آپ کی دلائی لاما سے ملاقات ہوئی ؟

ڈاکٹر اینڈرسن : لہاسا میں چند روز گزارنے کے بعد ہم نے دلائی لاما سے ملاقات کی درخواست کی۔ ہم اس انگریز طبیب کے مہمان تھے جو لاماسری سے دور رہتا تھا۔ پھر ایک روز قاصد پیغام لایا کہ دلائی لاما نے ہماری ملاقات کی درخواست قبول کر لی تھی۔ ہمارا حلیہ دیکھ کر وہ بہت محظوظ ہوا اور بڑی بے تابی اور دلچسپی سے ہمارے دنیا کے سفر کے بارے میں سوالات کرنے لگا۔

وہ انگریز اس وقت ہمارے ساتھ وہیں تھا اور ایک کینپو لاماسری کا بڑا راہب ہماری نگرانی کر رہا تھا۔ کینپو کے ذمہ زندہ بدھا کو پیش کیا جانے والا کھانا چکھنے کے فرائض بھی تھے۔ تبت میں سیاہ راہبوں (Black Monks) کی بھی بہتات تھی جنھوں نے خود کو سرخ اور زرد عقائد والے لوگوں کو تباہ کرنے کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ چند سیاہ راہب ہمیشہ دوسرے عقیدے کے سب سے بڑے رہنما کو زہر دینے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ تبت اور منگولیا میں زہر ایک مستقل خطرہ تھا۔ وہاں چند ایسے افراد بھی تھے جو ژورن کے نام سے مشہور تھے اور جو بیک وقت ڈاکٹر اور زہر دینے والے کا کام کرتے

کتے کے منہ والا نگہبان دیوتا: آخرت کے لئے مخصوص کچھ دیوتاؤں کے مجسمے بادشاہوں کی وادی میں موجود اہراموں میں بھی بنائے گئے تاکہ اہرام کے اندر کوئی شیطانی طاقت داخل نہ ہو سکے۔ یہ مجسمے اس بات کی علامت تھے کہ یہ مرنے والے کی آخرت کے سفر میں حفاظت کرتے ہیں ان دیوتاؤں کے سر جانوروں کے سے ہوتے تھے جن میں بچھوے، دریائی گھوڑے اور کتے آجاتے ہیں تصویر میں آپ کتے کے منہ والے دیوتا کو دونوں مٹھیاں بھینچے ہوئے دیکھ رہے ہیں جو اس کی طاقت کا اظہار کر رہے ہیں۔

تھے۔ اگر آپ ڈاکٹر کی حیثیت سے ان کی خدمات حاصل کرتے تو وہ مقدور بھر آپ کی شفایابی کے لیے کوشش کرتے تھے ہاں کوئی دشمن آپ کو مارنے کے لیے انھیں آپ سے زیادہ رقم کی پیش کش کرتا تو وہ آپ کو زہر دے کر مارنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ میری بھی ایک ایسے ژورن سے شناسائی ہوگئی تھی جو پورے تبت میں زہر سے مارنے میں خوفناک حد تک شہرت رکھتا تھا۔ وہ اپنے شکار کو ایک ایسا زہر دیتا تھا جو ایک کمیاب مشرقی مرکب تھا اور بہت آہستہ آہستہ اثر کرتا تھا۔ ایک بڑی رقم کے عوض وہ اس کا تریاق بھی مہیا کر دیتا تھا۔ یہ ژورن اپنی شناخت کے لیے سواستیکا (Swastika) کا نشان استعمال کرتے تھے جسے بعد میں ہٹلر نے اور بھی بھیانک بنادیا تھا۔

سوال: زندہ بدھا کی شخصیت کیسی تھی؟

ڈاکٹر اینڈرسن: حیرت انگیز طور پر وہ نوجوان آدمی تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، خلیق اور حسِ مزاح کا حامل۔ اس کی ایک خواہش یہ بھی تھی کہ کسی روز کسی طیارے میں سفر کرے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ خانقاہ کے ریکارڈ سے پتا چلتا ہے قدیم زمانے میں لوگ زمین پر آسمانوں سے اڑتے ہوئے آتے تھے۔ اس نے بتایا کہ ان لوگوں کے پاس اڑنے والی مشینیں تھیں جو بادلوں کو چیرتی ہوئی پہاڑوں پر پرواز کرتی تھیں۔ اس نے کہا کہ یہ مشینیں زیر زمین سلطنت اگار تھا میں اب بھی موجود تھیں۔

سوال: کیا اس نے ان اڑنے والی مشینوں کے بارے میں کچھ اور بھی بتایا تھا؟

ڈاکٹر اینڈرسن: ہم نے اس سے ان کے بارے میں پوچھا تو اس نے راہب کو لائبریری میں بھیج دیا۔ ذرا دیر بعد وہ راہب چمڑے کی جلد اور چمڑے ہی کی ڈوریوں سے بندھی ایک پرانی کتاب لے کر آگیا۔ اس کتاب میں انڈے کی شکل کی ایک اڑن مشین کی تصویر تھی جو پہاڑوں پر پرواز کر رہی تھی۔ وہ کوئی بہت ہی قدیم کتاب تھی۔ میں نے ایسی تصویر نہیں دیکھی یہاں تک کہ جنگ کے بعد خبروں میں یو ایف اوز اور اڑن طشتریوں کی تصاویر دکھائی جانے لگیں جو ان سے بہت ملتی جلتی تھیں۔

سوال: کیاآپ کو کھوکھلی زمین کے نظریے کے سلسلے میں کوئی اور نئی باتیں معلوم ہوئیں؟
ڈاکٹر اینڈرسن: انگریز طبیب اس سلسلے میں بے حد پرجوش تھا۔ اس نے بتایا کہ اس خانقاہ کے نیچے ایک سرنگ تھی جو دنیا کے نیچے پھیلے ہوئے سرنگوں کے جال سے منسلک تھی۔ اس نے دعویٰ کیا کہ ایٹلانٹس کے خزانے اور گزرے زمانوں کے بیش قیمت راز زمین کے نیچے موجود بے شمار کوٹھریوں میں موجود تھے۔
وہ انگریز طبیب بدھوں کے اگارتھا کی موجودگی کے عقیدے میں وہاں ہمارے تمام ملنے والوں سے زیادہ جانتا تھا۔ وہ اس قدیم تحریر کی رمز کشائی (decipher) کے لیے مسلسل کوششیں کر رہا تھا اور اس مقصد کے لیے ایک موٹی سی نوٹ بک بنا رکھی تھی۔ اس نے قسم کھا کر بتایا کہ پوری زمین کے نیچے سرنگوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ اس کے خیال میں دنیا میں واحد جگہ یہی بہشت تھی جہاں آدمی آرام وسکون سے رہ سکتا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ بائبل میں مذکورہ باغِ عدن یہی مقام تھا۔
ہمیں بتایا گیا کہ عام راہب یا بھکشو کو اس داخلی سرنگ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جاتا تھا۔ خانقاہ کے نیچے ایک تاریک تہہ خانے میں ہمیں ایک روشنی دکھائی گئی جس کے بارے میں ان کے خیال میں وہ ہزاروں برسوں سے یونہی جل رہی تھی۔ اس انگریز طبیب نے ہمیں سونے کا ایک بھاری دروازہ بھی دکھایا جو دراصل زیرِ زمین سرنگ کا دروازہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ زیرِ زمین سلطنت کے نمائندے اسی دروازے سے زندہ بدھا اور اس کے مشیروں سے ملنے کے لیے آتے تھے۔
سوال: ان سرنگوں کے بارے میں آپ کو اور کیا بتایا گیا؟
ڈاکٹر اینڈرسن: یقیناً لہاسا میں پختہ عقیدے والے راہبوں کو ہی اس سرنگ کے داخلی دروازے کے محل وقوع سے آگاہ کیا جاتا تھا۔ اس انگریز کو یقین تھا کہ اس سرنگ کا ایک دروازہ برازیل 'جسے وہ ہائپربرازیل کہہ رہا تھا' میں بھی تھا۔ دنیا میں اور بھی کئی مقامات پر ان سرنگوں میں داخل ہونے والے راستوں پر شناختی علامتیں موجود تھیں۔ شمالی امریکا میں ایسے کئی مقامات تھے اور بہت سے دیگر مقامات پوری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے جہاں سے ان سرنگوں میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔
ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ دنیا بھر میں موجود تمام اہرام ان زیرِ زمین سرنگوں کے ذریعے آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ انگریز طبیب نے دعویٰ کیا کہ ان قدیم اڑن مشینوں یا طیاروں میں سے کچھ غزہ مصر کے عظیم اہرام کے اندر دفن ہے۔ پچھلے سال میں وہاں گیا تھا اور کیا بتاؤں کہ ان قدیم کھنڈرات میں سے کسی چیز کو نکالنا کس قدر مشکل کام ہے۔
سوال: کیا انھوں نے یہ بھی بتایا کہ یہ سرنگیں یا اہرام کب کھلیں گے؟
ڈاکٹر اینڈرسن: مشرق میں ایک کہاوت ہے کہ جب شاگرد تیار ہو جائے گا تو استاد آجائے گا۔ ان چیزوں کے معاملے میں بھی یہی بات ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ جیسے جیسے انسان کی روحانی سطح بلند سے بلند تر ہوتی چلی جائے گی ویسے ویسے حقائق اس پر منکشف ہوتے چلے جائیں گے۔ انھیں یقین ہے کہ انسان 'تم' میں اور سارے لوگ ایک نہ ایک دن اس علم کا بوجھ اٹھانے اور اسے استعمال میں لانے

کے قابل ہو جائیں گے۔ زمین جانے کتنے رازوں کی امین ہے اور اس نے ان رازوں کو خوب سنبھال کرر کھا ہوا ہے۔

سوال : کیا تم نے دنیا کے بادشاہ کے بارے میں بھی کوئی روایت 'کوئی داستان سنی تھی ؟

ڈاکٹر اینڈرسن : بدھوں کے عقیدے کے مطابق وہ زمین پر منارۂ نور ہے اور دنیا کے لیے نورِ ہدایت۔ دنیا کا ہر شخص کسی نہ کسی صورت میں اس سے واقف ہے ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اس سیارہ پر سب سے زیادہ پختہ کار اور مکمل ترین مخلوق ہے۔ وہ کائنات کے علیم و خبیر خدا کے ہم آہنگ سمجھا جاتا ہے۔ ان کا ایمان ہے کہ وہ روحِ حیات کا منصرم و منتظم ہے۔ تمام مذاہب کے پیچھے اسی کا الوہی نور ہے اور وہی خدائی طاقت کا ترجمان ہے۔

دنیا کا بادشاہ ہی وہ ہستی ہے جو پنڈتوں (بدھ مت کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز راہب) کی رہنمائی کرتا ہے۔ وہ گرو بھی سردار ہے جو زیرِ زمین بہشت کے راہبوں کے سلسلے کے لوگ ہیں۔ گرو کا یہ طبقہ انسانوں کو سیدھی راہ پر چلانے کے معاملے میں بادشاہ کی معاونت کرتا ہے۔ وہ تمام زبانیں بول سکتے ہیں اور انسانی اذہان کو پڑھنے اور انھیں ہدایات دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جب وہ ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں تو زیرِ زمین دنیا کی خفیہ زبان "ویتانان" میں کرتے ہیں۔

سوال : کیا دنیا کے بادشاہ کی حکمرانی دائمی ہے ؟

ڈاکٹر اینڈرسن : نہیں جناب۔ دوسرے افراد کی طرح اسے بھی پاکیزگی کے کئی امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ایسے اوقات میں وہ اپنے جسم پر مخصوص قسم کے روغنیات ملتا ہے اور ایک ایسے خفیہ غار میں جاتا ہے جس میں آفاقی مندر ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق یہ غار ازل سے موجود ہے۔ غار کے آخری سرے پر سیاہ پتھر کے جادوئی تابوت میں دنیا کے اصل بادشاہ کا حنوط شدہ جسم رکھا ہوا ہے۔

یہ غار سدا تاریک رہتا ہے۔ غار کے دروازے کے قریب پہنچ کر یہ بادشاہ مخصوص بھجن گاتا ہے، چند رسمیں ادا کرتا اور پھر اپنے بھجن کو دہراتا ہے جب یہ کام ہو جاتا ہے تو غار کا دروازہ کھل جاتا ہے اور تاریکی ختم ہو جاتی ہے کیونکہ دیواروں میں سے تیز سرخ روشنی نکلنے لگتی ہے۔ اسی وقت سیاہ پتھر کے تابوت میں رکھا ہوا حنوط شدہ جسم شعلے اگلنا شروع کر دیتا ہے جو تابوت پر رقص کرنے لگتے ہیں۔ غار کی سرخ چمکتی ہوئی دیواروں پر ان

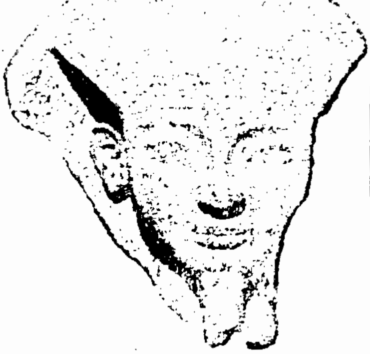

ریمسس ششم : یہ فرعون ۱۱۵۰ قبل مسیح کا ہے جو کئی ٹن وزنی گرینائیٹ کفن تلے دفنایا گیا۔ اس وقت آپ اس کا چہرہ ملاحظہ کر رہے ہیں۔

گروؤں اور بڑے بڑے راہبوں کے چہرے نظر آنے لگتے ہیں جو روحانی دنیا کو سدھار چکے ہیں۔ چہروں کی یہ شبیہیں انتہائی خوفناک ہوتی ہیں

کیونکہ یہ ٹھیک اسی حالت میں نظر آتی ہیں جس حالت میں اس وقت ان کا مٹی میں دفن جسم ہو
ہے۔ کچھ صرف مٹی کا ڈھیر ہوتی ہیں۔ کچھ پھپھوندی لگے کاسئہ سر جنھیں وقت اور زمین چاٹ رہ
ہوتی ہے اور کچھ حالیہ مرنے والوں کی بے گوشت کھوپڑیاں ہوتی ہیں۔ سرخ دیواروں پر ناچتی یہ کا
سر کی مختلف شبیہیں فطرت کی قوتوں کو آزاد کرنے کے لیے بلند آواز میں ''اوم۔ اوم'' کا بھجن شروع
دیتی ہیں۔ اس بھجن کے اثر سے غار کی دیواروں میں شگاف پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان شگافوں میں انسا
ڈھانچوں کی دو قطاریں نکلتی ہیں جنھوں نے ایسے کفن لپیٹے ہوتے ہیں جن سے سبزی مائل روشنی نکل
رہی ہوتی ہے۔ یہ ڈھانچے سنگی تابوت تک دورویہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اب اس بادشاہ کے ایمان اور پاکیزگی کی مزید آزمائش کے لیے اس ان دورویہ کھڑے انسانی ڈھانچوں
میں سے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سیاہ سنگی تابوت تک جانا ہوتا ہے۔ جب یہ بادشاہ اپنے پیش رو کے
حنوط شدہ جسم کی طرف بڑھتا ہے تو دونوں جانب کھڑے ہوئے ڈھانچوں میں سے کوئی بھی ڈھانچہ
اس کا امتحان لے سکتا ہے۔ یہ ڈھانچے اس سے ایسے سوالات کرتے ہیں جن سے اس بادشاہ کی
انکساری' پاکیزگی' عقیدے اور روشن ضمیری کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔ جب یہ بادشاہ اصل بادشا
کے شعلے اگلتے ہوئے جسم کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتا ہے تو اس دوران میں اسے ان آزمائشوں میں
سے ایک بار' تین بار یا ہزاروں بار گزرنا پڑتا ہے۔

اور جب وہ ان امتحانوں کو پاس کرتا ہوا مقدس دعائیں پڑھتا اصل بادشاہ کے سامنے جا کھڑا
ہوتا ہے تو اس کی روح دنیا کی تمام روحوں سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے اور وہ ان سے انسانیت کی بھلائی
کے کاموں میں معاونت کی درخواست کرتا ہے۔

جب یہ لمحہ بھی گزر جاتا ہے تو پھر اسے بڑی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شعلے اگلتے ہوئے جسم تک
جانا ہوتا ہے اور پھر وہ اس سرخ دہکتی آگ میں اپنے ہاتھ اور بازو گھسیڑ دیتا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ
دنیا کی گرم ترین آگ ہے۔ اس بادشاہ کو ان دہکتے شعلوں میں اس وقت تک اپنے ہاتھوں کو رکھنا پڑتا
ہے جب تک کہ وہ آگ اس کے ہاتھوں کی کھال اور سارا گوشت نہ چاٹ جائے اور اگر وہ اب بھی خود کو
موزوں اور مستحق ثابت کر دیتا ہے تو آگ سے ہٹتے ہی اس کے ہاتھوں کا گوشت لوٹ آتا ہے اور وہ
سابقہ حالت میں آجاتے ہیں۔

جب بادشاہ سچا اور پختہ ثابت ہو جاتا ہے تو تابوت میں رکھے جسم سے اٹھتے شعلے غائب ہو جاتے
ہیں۔ ڈھانچوں کی قطاریں اپنے اپنے شگافوں میں لوٹ جاتی ہیں اور ان کی کفن سے اٹھتی ہند روشنی
ماند پڑتے پڑتے معدوم ہو جاتی ہے اور تابوت میں سے رنگ برنگی روشنیوں کا سیلاب سا امڈ آتا ہے جو
اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ دنیا کا یہ بادشاہ کامران رہا ہے اور انسانیت کی خدمت کے لیے اسے
مصفا کر دیا گیا ہے۔

جب وہ غار کی راہ داری میں سے واپسی کا سفر کرتا ہے تو گروؤں کے چہرے کی خوفناک شبیہیں
دیواروں پر سے غائب ہو جاتی ہیں۔ آخر بادشاہ باہر آجاتا ہے، غار کا دروازہ بند ہو جاتا ہے' اس پر

دریائی گھوڑے کے منہ والا دیوتا: یہ دریائی گھوڑے کے منہ والا دیوتا تحتمو سس سوئم کے اہرام سے نکالا گیا جو چاروں طرف کالے گوند سے لیپا گیا تھا۔ قدیم مصر میں سیاہ رنگ زندگی کی علامت تھا دیکھنے میں یہ آپ کو دہشت ناک اور درندہ صفت لگتا ہے مگر اس کا یہ غصہ بادشاہ کے دشمنوں کے لیئے ہے ممکن ہے کہ یہ دیوتا اوسرس کے نگہبانوں سے بھی تعلق رکھتا ہو۔

ندس مہر لگ جاتی ہے اور بادشاہ حکمرانی کے لیے اپنے مسکن میں لوٹ آتا ہے۔

ال: یہ تو بالکل ایسا لگتا ہے جیسے ایڈگر ایلن پو کے ناول لوکرافٹ Love craft کا کوئی باب ارہے ہو۔ بالکل جادوئی کہانی کی طرح نہیں ہے ا؟

کٹر اینڈرسن: میں ایسے بے شمار لوگوں سے ملا ں جو ان باتوں پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ میں یہ ت بتانا بھول گیا کہ بادشاہ کو مستقبل میں اپنی رگرمیوں کے سلسلے میں پیغامات ملتے رہتے ں۔ یہ پیغامات و ہدایات اسے کرما کی عالمی نسل کی طرف سے ملتے ہیں کونسل یہ پیغامات و ایات اس وقت ترسیل کرتی ہے جب پوری ہیلی دنیا کے تمام انسانوں کی روحوں کے ساتھ مائیہ ہم آہنگی کی حالت میں ہوتی ہے۔ کونسل ے لوگ دنیا کے بڑے بڑے بااثر لوگ مثلاً شاہوں' صدروں اور عالمی رہنماؤں کے غوں کو کھنگالتے رہتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کے ہان سے ان کے مستقبل کے منصوبے پڑھتے ں۔ ان منصوبوں کا یہ کونسل جائزہ لیتی ہے گویا ں ٹریبونل سے دنیا میں ہونے والی کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔

ال: اس جائزے کے بعد کیا ہوتا ہے؟

کٹر اینڈرسن: پھر لوگوں کی قسمتوں اور مستقبل پر غور و فکر ہوتا ہے اور تبتیوں کا عقیدہ ہے کہ دنیا ادشاہ ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو سیدھی راہ پر ہوتے ہیں اس کے برخلاف جو لوگ خدا کی مرضی ے خلاف عمل کرتے ہیں ان کے مقدر میں تباہی لکھ دی جاتی ہے۔ نیکو کاروں کی مدد اور بدکاروں کی ہی کے عمل کی طاقت علم "اوم" کے تحت استعمال میں لائی جاتی ہے۔ "اوم" ایک دعائیہ علم ہے ں کی بنیاد ادم پر ہے جو زمین پر پہلے گرو کا نام تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کا سب ے قدیم نیک آدمی تھا۔ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ یہ دنیا کا پہلا آدمی تھا جو ہزاروں لاکھوں سال پہلے ا کی دائمی اچھائی اور سچائی کا پیغام لیئے پوری دنیا میں پھر تا رہا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جو دنیا کا پہلا عظیم استاد (Master Teacher) اور برائی کی قوتوں کے خلاف ایک عظیم جنگ آزما تھا۔ اس کی

بہترین خدمات کے عوض اسے مرئی (دیکھے جانے والی) دنیا کی تمام چیزوں کی قیادت و انصرام کا فریضہ سونپا گیا تھا۔

سوال: وہ اپنے فیصلوں پر عمل درآمد کیسے کرتے ہیں؟

ڈاکٹر اینڈرسن: دنیا کا بادشاہ اگارتھا میں ماسٹرس کی کونسل کا اجلاس بلاتا ہے یہ وہ ماسٹرس ہوتے ہیں جو منتخبہ امیدواروں کی پاکیزگی اور روشن ضمیری پر غور و فکر کرتے ہیں اور فیصلہ دیتے ہیں کہ کون ایسا ہوگا جو کائناتی' نفسیاتی اور مادی سطح پر لوگوں کی رہنمائی کر سکتا ہے۔

سوال: زیرِ زمین دنیا کی مبینہ برائی کی قوتوں کے بارے میں کیا نظریہ ہے؟

ڈاکٹر اینڈرسن: یہ تو ایک عالم گیر سچائی ہے کہ جہاں اچھائی ہوتی ہے وہاں برائی بھی ضرور ہوتی ہے۔ زیریں دنیا میں بھی تاریک قوتوں کا ایک سلسلہ' ایک نظام ہے جو سطح زمین پر آباد انسانوں کی مکمل تباہی کے درپے رہتی ہیں۔ یہ شیطانی مخلوق انسانوں میں پلیگ' بدقسمتی' آفتیں' مصیبتیں اور خوفناک بیماریاں پھیلانے پر قادر ہے۔ بدی کی یہ طاقتیں پوری کی پوری قوم کو طاعون' زلزلے یا کسی اور آفت میں مبتلا کر کے تباہ کر سکتی ہیں۔ یہ شیطانی قوتیں ظالموں' آمروں اور انسانی تاریخ کے درندہ صفت آدمیوں کی سرپرستی اور مدد کرتی ہیں۔

کبھی کبھی یہ شیطانی طاقت کسی فردِ واحد کو بھی اپنا شکار بنا لیتی ہے۔ یہ ساحرانہ طاقت کی بھی حامل ہوتی ہے اور انسان کے مقدر کو خاک میں ملا سکتی ہے۔ ہر سنہرا موقع غارت کر کے رکھ دیتی ہے۔ تبت میں اگر کوئی خوش حال آدمی بدحالی کا شکار ہونے لگتا ہے اس کی زمین بیوی بچے اور دولت اس کا ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں تو اس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اس پر زیرِ زمین بدروحوں کا جادو چل گیا ہے اور وہ شیطانی قوتوں کا نشانہ بن گیا ہے۔

یہ مصیبتیں اور بدنصیبی کی گھڑیاں اوم کی رسوم سے ٹالی جا سکتی ہیں۔ اوم جو علم دعا ہے۔ جب تک اس آدمی پر سے زیرِ زمین بدروحوں کے اس جادو کا اثر دور نہیں ہو جاتا کوئی بھی اس کے قریب نہیں جاتا لوگوں کے ذہنوں میں یہ وہم بھی جڑ پکڑ چکا ہے کہ اگر ایسے بدنصیب آدمی کے قریب کوئی جائے گا یہ بدروحیں اپنے اصل شکار کو چھوڑ کر ان میں سے کسی اچھے سے آدمی کو اپنا شکار بنا لیں گی۔ ان کا خیال ہے کہ ان شیطانی قوتوں سے محفوظ رہنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے گلے میں اور اپنی قیمتی چیزوں پر 'اوبو' کا نشان (تعویز) لٹکا لیں۔ یہ طاقتور نشان یا علامت لوگوں کو' ان کی اشیاء کو تباہی ان قوتوں کے خلاف تحفظ فراہم کرنے کا ضامن سمجھا جاتا ہے۔ اس زمانے میں بہت کم تبتی ایسے ہوں گے جو اپنے گھروں کے داخلی دروازوں پر 'اوبو' کا نشان لٹکائے یا چسپاں کیے بغیر سوتے ہوں۔

سوال: کیا تم جنات' شیطانوں اور بدروحوں یا بھوت پریت جیسی چیزوں پر یقین رکھتے ہو؟

ڈاکٹر اینڈرسن: دنیا میں بہت سارے علاقے ایسے ہیں جہاں کے لوگ بدروحوں اور بھوت پریتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ میں ایک بوڑھا آدمی ہوں مگر میں نے بہت ساری باتیں ایسی دیکھی ہیں جن کی منط

یا سائنسی توضیح ہو ہی نہیں سکتی۔ ایک تاریکی کا شہزادہ ہے۔ بھوت پریت اور چڑیلوں کا پورا ایک سلسلہ ہے جو انسانوں کو ورغلانے اور گمراہ کرنے میں خاص لذت محسوس کرتا ہے۔ ہم نے شیطانوں اور بھوت پریت کے وجود کو محض افسانوی اور اوہامی باتیں سمجھ کر نظر انداز کر کے غلطی کی ہے۔ ان کی قوت میں اضافہ ہو گیا ہے کیونکہ ہم نے ان کے پر فریب اور مکارانہ کارناموں پر نظر نہیں رکھی۔

سوال : کیا تم بھی کوئی ایسا جادو ٹونا جانتے ہو جس سے جنات' شیطانوں یا بھوت پریت کا اثر زائل کیا جا سکے ؟

ڈاکٹر اینڈرسن : علم جنات یا عفریتیات ایک قدیم سائنس ہے اور میں نے دنیا کے گرد سفر کے دوران کئی ایسی ترکیبیں جنتر منتر ٹونے ٹوٹکے سیکھے ہیں جن سے آدمیوں پر سے ان کا قبضہ ختم کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک بڑا سنجیدہ معاملہ ہے تم جانتے ہو کہ کیتھولک چرچ کے کچھ پادری بھی جادو یا سحر یا جنات اتارنے کا عمل جانتے ہیں اور کرتے ہیں۔ میرا تو اس بات پر یقین ہے کہ کسی بھی آدمی کی زندگی پر جنات یا بد روحیں مکمل طور پر قبضہ کر سکتی ہیں۔ ہمارے اذہان اور اجسام ہر وقت بدی کی ان قوتوں کی زد پر ہیں اور وہ کسی بھی وقت ہم پر حملہ کر سکتی ہیں۔

سوال : کیا تم اس بات پر بھی یقین رکھتے ہو کہ یہ جنات یا بد روحیں کھوکھلی زمین سے آتی ہیں ؟

ڈاکٹر اینڈرسن : یہ جنات یا بد روحیں طبعی یا مرئی یا غیر مرئی دونوں دنیاؤں کی مخلوق ہیں۔ وہ جہاں چاہیں رہ پڑتی ہیں۔ میرے تبتی دوست کا کہنا ہے کہ ان کا مادی وجود بھی ہوتا ہے اور غیر مادی بھی اور یہ خود کو کسی بھی شکل میں ڈھالنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اب اس سے پہلے کہ تم مجھ سے ان سے چھٹکارا پانے کا عمل معلوم کرو میں تمہیں بتادوں کہ یہ بات میں تمہیں کبھی نہیں بتاؤں گا۔ ایسی باتیں محظوظ ہونے کے لیے یا لطف لینے کے لیے نہیں ہوتیں۔ ایسا عمل کرتے وقت ذرا سی غلطی بہت بڑے نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔

سوال : اس کا مطلب ہے کہ تم کھوکھلی زمین کے نظریے پر یقین رکھتے ہو ؟

ڈاکٹر اینڈرسن : دوست، یہ دنیا بے شمار رازوں کی امین ہے۔ اب یہ بالکل الگ بات ہے کہ یہ کھوکھلی زمین اس دنیا ہی کے اندر ہے یا نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ زمان و مکاں کی کسی اور جہت میں واقع ہو۔ میں اس حقیقت کو دریافت کرنے کے لیے ٹرانس میں بھی جا سکتا ہوں مگر میرا خیال ہے کہ چند اسرار ہمیں اپنی اولادوں کے لیے بھی چھوڑ دینے چاہئیں۔ بہر حال کسی دن میں شینسی کے اہراموں کا راز جاننے کے لیے ٹرانس میں ضرور جاؤں گا۔ زیرِ زمین دنیا کا احوال ہمیں ان سوالوں کے ساتھ ہی ختم کر دینا چاہئے کہ : کیا یہ حقیقت ہے ؟ یا محض افسانہ ؟

☆

غیر مکانی سیلانی اور متفرق اشیاء
او او پی
Objects Out Of Place

آنجہانی سائنس داں اور مصنف آئیون ٹی سینڈرسن (Ivan T. Sanderson) کے مطابق ایک غیر مکانی شے (او او پی) وہ چیز ہے جو اپنے زمان و مکان کے علاوہ کسی اور زمان و مکان میں موجود ہے۔ کسی شے کے لئے سینڈرسن کی یہ مقبول اصطلاح سائنس کے تسلیم شدہ اصولوں کے لیے ایک چیلنج رکھتی ہے۔ سائنس کے تین میدانوں یا شعبوں کے عالم فاضل اور تربیت یافتہ ہونے کے باوجود سینڈرسن غیر معمولی چیزوں اور غیر متوقع واقعات پر یقین رکھتا تھا۔ ایسی چیزوں کو دریافت کرنے پر اسے خاص طور پر خوشی ہوتی تھی جو غیر مکانی (OOP) کے زمرہ میں آتی تھیں۔

ایک خاص چیز جس نے سینڈرسن کو سحر زدہ سا کر دیا تھا ایک رپورٹ تھی جو آئیوا سٹی کے ایک تاجر گلین میک وین نے دریافت کی تھی۔ جب کبھی میک وین کو آئیوا یونیورسٹی کے قریب ریور سائڈ ڈرائیو میں قائم اپنی "ڈیری کوئن ڈرائیو ان" سے فرصت ملتی وہ غیر مکانی (OOP) اشیا سے متعلق رپورٹوں کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا۔ حال ہی میں میک وین نے آئیوا ہسٹوریکل سوسائٹی کی لائبریری میں 'سیسٹر ڈے ہیرالڈ' کی گرد آلود فائلیں کھنگالیں تو اسے ۱۰ اپریل ۱۸۶۷ء کے ایڈیشن کا ایک تراشہ ملا۔ جس میں لکھا تھا:

"اگر چوبیس سال قبل ہونے والی کولوریڈو چاندی کی کان کی دریافت پر غور کیا جائے تو اس میں ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ اس براعظم پر نسلِ انسانی کا وجود اتنا ہی قدیم ہے جتنا چٹانون میں چاندی کی دھاریوں (Silver Veins) کی تخلیق پذیری کا عمل ہے، جلین کی "روکی پائنٹ" کان میں سطح زمین سے چار سو فٹ گہرائی میں بے شمار ایسی انسانی ہڈیاں ملی ہیں جن پر چاندی ملی ہوئی کچ دھات جمی ہوئی تھی، جب انھیں باہر نکالا گیا تو ان ہڈیوں سے تقریباً ایک سو ڈالر کی کچ دھات ملی۔ ان باقیات کے ساتھ چار انچ لمبی آب زدہ تانبے کی بنی ایک نیزے کی انی بھی تھی۔"

ایسی غیر مکانی اشیاء کو اگر احتیاط سے ترتیب دیا جائے تو انسانی تاریخ کے نظریات میں بڑی تبدیلی آسکتی ہے۔ ایسی ہی ایک حیرت انگیز رپورٹ "ہارپرز میگزین" کے جولائی ۱۸۶۹ء کے شمارے میں بھی ملی ہے اس میں لکھا ہے: "سال ۱۸۲۸ء کے ٹے نیسی اخبارات (Tennessee newspapers) کے مطابق اسی سال اسپارٹا میں آدھے سے ایک ایکڑ تک وسیع علاقے میں کئی قبرستان دریافت ہوئے تھے۔ یہ وہائٹ کاؤنٹی ٹے نیسی کا علاقہ تھا جہاں بہت کم لوگوں کو مقبروں یا سنگی تابوتوں میں دفن کیا جاتا تھا۔ اس قبرستان سے نکلنے والے سب سے بڑے ڈھانچے کی لمبائی انیس انچ تھی۔ ہڈیاں مضبوط اور بہتر ساخت کی تھیں اور پورا ڈھانچہ بالکل درست حالت میں تھا۔ قبریں

مقدس سانپ: بادشاہوں کی وادی کے بارے میں خیال تھا کہ اس کی حفاظت میری سیگر (Mereseger) نامی دیوی کر رہی ہے جو کوبرا ناگ کی شکل کی حامل ہے۔ اہراموں پر کام کرنے والے لوگوں کا خیال تھا کہ یہ سپنی جرائم پیشہ لوگوں یا غلط قسم اٹھانے والوں کو اندھا کر دیتی ہے یا زہر سے مار دیتی ہے۔

تقریباً دو فٹ گہری تھیں۔ مُردوں کی تدفین معمول کے مطابق کی گئی تھی۔ ان کے سر مشرق کی جانب تھے ہر ایک کے دونوں ہاتھ ان کے سینوں پر رکھے ہوئے تھے۔ بائیں ہاتھ کی کہنی کے قریب بھورے رنگ کے پتھر یا سیپی کا بنا ہوا ایک برتن رکھا ہوا تھا جس میں ایک پنٹ مائع کی گنجائش تھی۔ برتن کے اندر دو تین سیپیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک مُردے کی گردن میں چورانوے (۹۴) موتیوں کی مالا بھی موجود تھی۔" اپنی Romance of Natural History1853 نامی کتاب میں ویبر Webber نے بھی ایسے مختصر تابوتوں کا حوالہ دیا ہے جو کین ٹکی Kentucky اور ٹے نیسی Tennessee میں دریافت ہوئے تھے۔ یہ تابوت تین فٹ لمبے اور اٹھارہ انچ گہرے تھے اور ان کے پیندے، دیواریں اور چھت ہموار تراشیدہ پتھروں کی بنی ہوئی تھیں۔ ایسی ہی ایک سحر انگیز رپورٹ جوشیا پریسٹ کی کتاب (American Antiquities and Discoveries in the West 1834) میں بھی صفحہ نمبر ۱۱۰ سے ۱۱۶ تک درج ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ لیز نگٹن، کینٹکی کے قریب ایک زمین دوز قبرستان دریافت ہوا تھا جس کے بارے میں ماہرین کا خیال تھا کہ وہ کسی مصری کالونی کی باقیات تھا۔ مقامی آبادکاروں نے وہاں سے کئی سو ممیاں نکالیں اور اس خیال سے کہ یہ کسی قدیم انڈین قبیلے کے افراد کی ہوں گی ان کے جسموں کے گرد لپٹی لینن کی پٹیاں پھاڑ دیں اور ان کی لاشوں کو جلا دیا۔

کئی محققین اس بات پر متفق ہیں کہ ہمارا سیارہ کئی تہذیبی ادوار سے گزر چکا ہے۔ مصنف جیمس چرچ وارڈ کا دعویٰ ہے کہ براعظم شمالی امریکا ایک ایسے تہذیب و تمدن کا حامل تھا جو تاریخ کے لحاظ سے مغربی پہاڑی سلسلے کی تخلیق و تشکیل سے بھی پہلے کا تھا۔ علماء اہرامیات کو اکثر اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ قدیم مصر میں ٹیکنالوجی آخر کہاں سے در آئی تھی۔ "قدیم مصریوں کے لئے ترقی یافتہ علوم کے حصول کے کئی ذرائع تھے۔" لوئی جے بیسڈن اپنی کتاب (Cycles of histo-ry-1972) میں رقم طراز ہے۔ "اس ضمن میں وان ڈینیکن اور دیگر حضرات کے نظریات بھی تسلیم کیے جا سکتے ہیں کہ ماضی بعید میں کچھ خلانورد زمین پر آئے تھے۔ مگر ان دعوؤں اور وسیع پبلسٹی کے باوجود قدیم خلانوردوں کا مفروضہ اشتباہ سے خالی نہیں ہے۔ آج تک کوئی ایسی ٹھوس شہادت سامنے نہیں آئی ہے جو ان دعوؤں کی تصدیق کر سکے۔ ایک سنگی مجسمہ جس کے سر پر زمین نما خود ہے (جو کسی

قدیم فنکار کے تصور کا شاہکار بھی ہو سکتا ہے) ہر گز اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ قدیم زمانوں میں بیرونی خلاء سے خلانورد اڑتے ہوئے آئے تھے اور زمین والوں کو جدید علوم سکھا گئے تھے۔"

قدیم علوم کے بارے میں بیسڈن خود اپنے نظریات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے: "اگر ہم تمام شہادتوں کا بغور جائزہ لیں تو اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ تہذیبیں ادوار کی رہینِ منت رہی ہیں۔ ہمارے اپنے دور میں، ہم خود زوالِ سلطنتِ روما اور 'تاریک دور' کے ظہور کے شاہد ہیں۔ ہمارا سیارہ ہمارے سورج کے گرد لاکھوں کروڑوں سالوں سے چکر لگا رہا ہے۔ اس عرصے میں بیسیوں تہذیبیں بنیں، دس دس ہزار برس تک قائم رہیں اور پھر مٹ گئیں۔ ان کے یوں صفحۂ ہستی سے غائب ہو جانے کا سبب خوفناک قدرتی آفات و سانحات ہی رہے ہوں گے۔

بیسڈن کے خیال کے مطابق مصر ہی ان تمام علوم کا خزینہ رہا ہوگا۔ "ہم قیاس کر سکتے ہیں" وہ لکھتا ہے: "کہ غزہ کے عظیم اہرام میں فرعونوں کے زمانے سے بھی پہلے کی تہذیب کا ریکارڈ موجود ہے۔ یہ ریکارڈ اٹلانٹس، مُو یا ایسی تہذیب کے بھی ہو سکتے ہیں جس کا نام گردشِ دوراں میں گم ہو گیا ہو۔ ایک ایسی قدیم تہذیب جس کی روایتی داستانیں بھی لوگوں کے اذہان سے مٹ گئی ہوں۔ راہبوں نے اس ریکارڈ کو پڑھا' سمجھا اور اس علم کو مصری تمدن میں نفوذ کر دیا۔ لوئی بیسڈن جہاں 'قدیم خلانوردوں' کے نظریات کی تکذیب کرتا ہے وہاں خود اپنے دعوؤں کو ثابت کرنے میں بھی قطعی ناکام رہا ہے۔ تاہم ادوار (Cycles) نے یقیناً انسانی تاریخ میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہاں تک کہ عالمی اسٹاک ایکسچینج میں اسٹاک کی قیمتیں بھی ادوار ہی کی رہینِ منت ہیں۔ موسم اور خوراک کی فصلوں پر درجۂ حرارت کے اثرات بھی ایسے سائیکل کے تابع نظر آتے ہیں جن کے بارے میں پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔

ایک سو سال سے بھی پہلے میڈم بلاوٹسکی غیر مکانی اور سیلانی اشیاء مصری سائنس اور تہذیبوں کے ادوار پر تحقیق میں مصروف تھیں۔ وہ تو یہاں تک بڑھ گئی تھیں کہ "نسلِ انسانی کی مختلف جڑیں" نام سے ایک نظریہ بھی پیش کر دیا تھا۔ پہلی نسلی جڑ (Root race) کے بعد میں آنے والی نسلیں وقت کے ساتھ ساتھ برتری حاصل کرتی گئیں۔ ان کا خیال ہے کہ کسی زمانے میں ہماری دنیا میں نیلے رنگ کے انسان آباد تھے۔ مصر کا تجزیہ کرتے وقت وہ اپنی کتاب (Isis Unveiled) میں لکھتی ہیں:

"درج ذیل حقائق سے زیادہ ادوار کے نظریے کی وضاحت اور کیسے ہو سکتی ہے۔ تقریباً ۷۰۰ قبل مسیح میں ماہرِ فلکیات ثالیس ملطی اور فیثاغورث کے اسکولوں میں زمین کی حرکات، اس کی ساخت اور پورے شمسی مرکزی نظام کے اصولوں کی تعلیم دی جاتی تھی اور ۳۱۷ قبل مسیح میں کرسپس سیزر کا معلّم، کانسٹنٹائن دی گریٹ کا بیٹا لیکٹینٹس (Lactantius) اپنے شاگرد کو درس دے رہا تھا کہ زمین ایک مسطح میدان ہے جو آسمان سے گھرا ہوا ہے جو آگ اور پانی سے بنا ہوا ہے اور اسے خبردار کر رہا تھا کہ ہرگز اس ملحدانہ نظریہ پر یقین نہ کرے کہ زمین گول ہے۔

”جب کبھی ہم کسی نئی دریافت کے گھمنڈ میں ماضی کی طرف نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ دیکھ کر ہمیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ اگر یقینی طور پر نہیں تو چند ایک آثار وامکانات سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ ہماری اس مبینہ دریافت سے قدیم لوگ بالکل ہی ناواقف نہیں تھے۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ نہ موسوی دور کے ابتدائی باشندے اور نہ ہی اس کے بعد کی بطلیموس کے زمانے کی مہذب اقوام بجلی سے واقف تھیں۔ اگر ہم اب تک اس رائے پر قائم ہیں تو اس کی وجہ اس کے برخلاف ثبوتوں کی کمی نہیں ہے۔ ہم سرویئس (Servius) کے بعض خاص جملوں کی گہرائی میں بھی جانا پسند نہیں کریں گے۔ اس کے علاوہ اور دیگر علما بھی ہیں جن کی باتیں ہم حذف نہیں کر سکتے اور اگر مستقبل میں ہم ان کے معانی کی گہرائی تک پہنچ گئے تو پھر ہم پر حقیقت آشکار ہو جائے گی۔ ”زمین کے ابتدائی باشندے“ سروس کہتا ہے: ”اپنی قربان گاہوں پر آگ نہیں لے جاتے تھے بلکہ اپنی دعاؤں کے ذریعے وہ آسمانی آگ کو نیچے لے آتے تھے۔“ ایک اور جگہ وہ لکھتا ہے: ”پرومیتھیس (Prometheus) نے آسمانی بجلی کو اوپر سے نیچے لانے کا فن دریافت کیا اور پھر اسے لوگوں پر آشکارا کیا اور جو طریقہ اس نے لوگوں کو سکھایا تھا اس کے ذریعے وہ بالائی خطے سے آگ زمین پر اتار لائے۔“

ان الفاظ پر غور کرنے کے بعد بھی اگر ہم انہیں دیومالائی قصوں سے زیادہ اہمیت دینے پر تیار نہیں ہیں تو پھر ہمیں فلسفی بادشاہ نیوما (Numa) کے دور کو یاد کرنا چاہیے جو باطنی علوم اور مسائل محرمانہ کا ایک جید عالم تھا۔ ایسی حالت میں ہم پہلے سے بھی زیادہ پریشاں فکری کا شکار ہو جائیں گے۔ ہم اس بادشاہ کو کسی طور بھی لاعلمی، اوہام پرستی یا ناپختہ کاری کا الزام نہیں دے سکتے۔ تاریخ پر تھوڑا سا بھی یقین رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہ وہ بادشاہ تھا جس نے کثرت پرستی اور بت پرستی کو تباہ کرنے میں اپنی پوری توانائیاں صرف کر دی تھیں۔ اس نے رومیوں کے دلوں میں بت پرستی سے ایسی نفرت پیدا کر دی تھی کہ دو صدیوں تک ان کی عبادت گاہوں میں کسی بت یا کسی دیوی دیوتا کی اشکال کا وجود تک نہیں رہا تھا۔ دوسری طرف پرانے تاریخ داں بتاتے ہیں کہ نیوما کی قدرتی طبیعیات میں علمیت قابل ذکر حد تک بڑھتی ہوئی تھی۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ایٹروسکیائی (Etruscan) الوہیت کے راہبوں نے اسے مخفی علوم سکھائے تھے اور انھی کی ہدایات کی وجہ سے وہ جیوپیٹر (دی تھنڈرر) کو

جیوری کا صدر اور اس کا بیٹا: انہر خاؤ اپنے بیٹے کے ساتھ جو اس بات کو ممکن بناتے تھے کہ وہ مزدوروں میں انصاف کرتے تھے یوں پتھر والے' پلاسترلگانے والے اور مصوروں کے الگ الگ گروہ تھے جو اپنا اپنا کام خوش اسلوبی سے سرانجام دیا کرتے تھے۔

زمین پر لانے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ اووڈ(Ovid) کے خیال میں اسی زمانے سے رومیوں نے جیو پیٹر کی پوجا کرنا شروع کی تھی۔ سلورٹی کا خیال ہے کہ فرینکلن کے برق (بجلی) دریافت کرنے سے پہلے ہی نیوما نے بڑی کامیابی سے اس کا تجربہ کر لیا تھا اور یہ کہ سکیائی تلس ہوسٹیلئس (Tullus Hostilius) اس آسمانی مہمان کی ہلاکت خیزی کا پہلا شکار تھا۔ ٹائی ٹس لیوی اور پلینی (Pliny) کہتے ہیں کہ اس شہزادے نے "بکس آف نیوما" کی ہدایات کے تحت جیو پیٹر کو خفیہ طور پر قربانی پیش کرتے وقت ایک غلطی کر ڈالی تھی جس کے نتیجے میں "اس پر بجلی گری اور وہ وہیں جل کر خاک ہو گیا۔"

سیلورٹی(Salverte) کا کہنا ہے کہ پلینی نے نیوما کے سائنسی رازوں کے لیے جو پیرایۂ اظہار اختیار کیا ہے اس سے واضح طریقوں کی نشان دہی ہوتی ہے۔ ایک سے گھن گرج حاصل کی جاتی ہے تو دوسرے طریقے سے بجلی۔ لیوشئس (Lucius) نے پلینی کو نقل کیا ہے: "نیوما کی کتاب کی رہنمائی میں تلس نے جیو پیٹر کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی مگر اس کے عمل میں خامی رہ گئی اور بجلی اس پر آ گری اور وہ تباہ ہو گیا۔" رعدو برق کے علم کی تاریخ کو ماضی میں ایٹروسکیائی راہبوں تک کھنگالنے سے یہ باتیں سامنے آتی ہیں کہ قدیم تھیوروجزم (Theurogism) (سحر کا ایک نظام جس کے عامل افلاطونی، مصری اور دیگر لوگ تھے اور جن کا دعویٰ تھا کہ ان کو کریمانہ دیوتاؤں کی مدد یا ان تک رسائی حاصل ہے) کے بانی تارکون (Tarchon) نے اپنے مکان کو آسمانی بجلی سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کے گرد گرج پھل (آتشی بوٹا) لگا دیا تھا۔ یہ ایک بہت پھیلنے والی بیل ہے جو آسمان سے گرنے والی بجلی کا رخ موڑ دینے کی تاثیر رکھتی ہے۔ ساحر تارکون کا تعلق ٹرائے کے محاصرے سے بھی بہت پہلے کے زمانے سے ہے۔ نوکیلے دھاتی برق کش (نوری سلاخ) کو جس کے لیے ہم بظاہر فرینکلن کے رہینِ منت ہیں بہر حال نو دریافت ہی کہا جا سکتا ہے۔ کئی ایسی علامتیں ہیں جس سے اس بات کی پختہ نشاندہی ہوتی ہے کہ ازمنۂ قدیم کے لوگ ان اصولوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ جونو کے مندر (The temple of juno) کی چھت آسمان کی طرف اٹھی ہوئی بے شمار نوکیلی تلواروں سے ڈھکی ہوئی ہے۔

اگر ہمارے پاس اس بات کا ذرا سا بھی ثبوت ہے کہ قدماء بجلی کے اثرات سے آشنا تھے تو اس بات کے مضبوط دلائل ہیں کہ خود بجلی سے بھی وہ مکمل طور پر واقف تھے۔ (The Occult Sci-ences) کا مصنف رقم طراز ہے۔ "بین ڈیوڈ کا کہنا ہے کہ حضرت موسیٰؑ بجلی کے مظاہر کا علم رکھتے تھے"۔ برلن کے پروفیسر ہرٹ (Hirt) بھی اس بات سے پوری طرح متفق ہیں۔ مائیکلس (Mi-claetiu) کا بیان ہے: پہلی بات تو یہ کہ اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ یروشلم کی عبادت گاہ پر کبھی بجلی گری ہو۔ دوسری بات۔ جوزیفس کے مطابق عبادت گاہ کی پوری چھت پر سونے کی تیز نوکیلی سلاخوں کا ایک جنگل سا اگا ہوا تھا۔ تیسری بات یہ ہے کہ پہاڑ پر یہ عبادت گاہ ایستادہ تھی اس پہاڑ میں موجود غاروں سے عبادت گاہ کی چھت کا پائپوں کی اتنی بڑی تعداد سے رابطہ تھا کہ عمارت

کے بیرونی اطراف میں ان کا جال سا پھیلا ہوا تھا جس کے نتیجے میں یہ نوکیلی سلاخیں بہترین کنڈکٹر (موصل) کا کام دیتی تھیں۔

ایمیانس مارسیلینس (Ammianus Marcellinus) چوتھی صدی کا ایک مشہور تاریخ داں گزرا ہے۔ بہتر اور درست بیانی کی وجہ سے ہمیشہ اس کا احترام کیا جاتا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ : مجوسی (زرتشتی) اپنے آتش کدوں میں ہمیشہ آگ دہکائے رکھتے تھے جو انہیں معجزانہ طور پر آسمان سے ملی تھی" ہندوؤں کی 'اپنشد' میں بھی ایک جملہ ہے جس کا مطلب ہے۔ "آگ یعنی سورج' چاند اور بجلی خدا کے علم سائنس کا تین چوتھائی حصہ ہے۔"

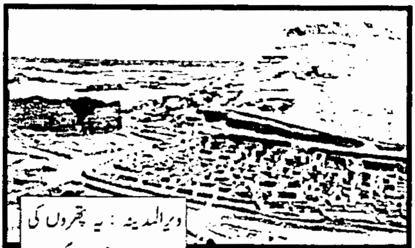

دیرالمدینہ : یہ پتھروں کی بنیادیں اس گاؤں کی ہیں جہاں پر اہرام بنانے والے مزدور رہا کرتے تھے اسے سولہویں صدی قبل مسیح میں بنایا گیا اور پھر ۵۰۰ سال میں جیسے جیسے بادشاہ دفن ہوتے گئے ویسے ویسے یہ وادی بڑھتی چلی گئی ان گھروں میں عام طور پر ۶۰ خاندان بسا کرتے تھے۔

آخر میں سیلورٹی نے کہا ہے کہ کشتریہ' کے دور میں ہندوستان کے لوگ بجلی کے موصل کے استعمال سے واقف تھے۔ یہ مورخ واضح طور پر لکھتا ہے۔ "لوہے کو چشمے کی تہہ میں رکھ دیا جاتا تھا۔ پھر اسے تلوار کی شکل میں ڈھالا جاتا تھا پھر نوکیلا حصہ آسمان کی طرف کر کے اسے زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا اس طرح گویا اس میں بجلی اور طوفانوں کا رخ موڑنے کی خاصیت پیدا ہو جاتی تھی" اس سے زیادہ اور کیا بات ہو سکتی ہے ؟

"چند جدید مصنفین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسکندریہ کی بندرگاہ (Alexan-drian port) کے لائٹ ہاؤس میں ایک بہت بڑا شیشہ لگا ہوا تھا جس سے دور سمندر میں آتے ہوئے جہاز دیکھے جا سکتے تھے۔ مگر مشہور زمانہ بفون کو اس کا یقین ہے۔ وہ بڑے وثوق سے کہتا ہے کہ "اگر شیشہ واقعی وہاں موجود تھا جیسا کہ مجھے پختہ یقین ہے کہ تھا تو دوربین کی ایجاد کا سہرا ابھی قدماء کے ہی سر بندھتا ہے۔"

اسٹیونس نے اپنی مشرق سے متعلق کتاب میں لکھا ہے کہ اس نے بالائی مصر میں ایسے ریل روڈس دیکھے ہیں جن کے رخنوں میں لوہا بھرا ہوا تھا۔ ہمارے دور کے ممتاز مجسمہ ساز کینووا' پاورس اور دیگر اپنے لیے اس بات کو ایک اعزاز سمجھتے ہیں جب ان کا موازنہ قدیم مجسمہ ساز فیڈیاس سے کیا جاتا ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ وہ ایسا کہنے والوں کو چاپلوس سمجھتے ہیں۔ پروفیسر جیوٹ (Jowett) ایٹلانٹس کی داستان کو تسلیم نہیں کرتا اور آٹھ ہزار اور نو ہزار سال پرانے ریکارڈ کو وہ ایک قدیم فریب سے زیادہ حیثیت دینے کو تیار نہیں ہے۔ مگر بنسن (Bunsen) کہتا ہے : "نو ہزار سال قبل مسیح کے مصر کے بارے میں تذکرے اور ریکارڈوں میں کوئی بھی بات غیر امکانی نظر نہیں آتی۔ کیونکہ مصر کی بنیاد اور اصل نو ہزار سال قبل مسیح سے بھی پہلے کی ہے۔" پھر قدیم یونان کے جناتی قلعوں کے بارے

میں کیا کہا جائے گا؟ کیا تیرائنس (Tiryns) کی دیواریں جن کے بارے میں ماہر اثریات کے مطابق، "قدماء میں بھی یہ بات مشہور تھی کہ انہیں سائیکلوپس (Cyclops) (ایک اساطیری عفریت جس کی پیشانی کی وسط میں صرف ایک آنکھ ہوتی تھی) نے تعمیر کیا تھا جو اہراموں سے بھی پہلے وجود میں آ گئی تھیں؟ چٹانی سلوں سے جو چھ چھ مکعب فٹ کی تھیں اور جن میں سے سب سے چھوٹی سل کو بیلوں کی جوڑی بھی نہیں ہلا سکتی تھی، پچیس فٹ موٹی اور چالیس فٹ سے زیادہ بلند دیواریں تعمیر کی گئی تھیں اور کہا جاتا ہے کہ یہ کارنامہ اس نسل کے انسانوں نے سرانجام دیا تھا جو انسانی تاریخ میں مذکور ہے۔

ولکنسن (Wilkinson) کی تحقیقات سے یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ بہت ساری ایجادات جنہیں ہم جدید دور کا شاہکار کہتے ہیں اور جن پر ہم فخر کرتے ہیں قدیم مصریوں نے پہلے ہی انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔ جرمنی کے ایک ماہر اثریات نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ نہ ایبرس کا پیپرس کا، نہ ہمارے جدید دور کی مصنوعی بالوں کی وگیں، نہ جلد کو حسین بنانے والے پرل پاؤڈر اور نہ ہی یوڈی قسم کی خوشبویات مصر والوں کے لیے کوئی راز تھے۔ جدید دور کے ایک سے زیادہ حکماء (Physicians) یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو اپنے آپ کو 'اعصابی خلل' کے علاقے کا ماہر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں "Medical Books Of Hermes" سے استفادہ کرتے ہیں جس میں بے شمار شفا بخش نسخے درج ہیں۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا، مصری تمام علوم میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ انہوں نے کاغذ اس نفاست اور مہارت سے بنایا تھا کہ وہ ٹائم پروف (جس پر گردش شب و روز قطعی اثر انداز نہ ہو) ہو گیا تھا۔ وہی گمنام مصنف جس کا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے لکھتا ہے: "وہ پیپرس سے گودا نکالتے تھے، اسے کاٹتے کوٹتے تھے، اس کے ریشے کھول دیتے تھے پھر ایسے طریقے سے جو صرف انہیں ہی معلوم تھا اسے ہموار کرتے تھے اور اسے ایک فل اسکیپ کاغذ میں ڈھال لیتے تھے۔ مگر وہ ہمارے کاغذ سے زیادہ پائیدار ہوتا تھا۔ بعض اوقات وہ اسے کاٹ لیتے اور ایک دوسرے کے ساتھ گوند کے ذریعے چپکا لیتے تھے۔ بہت ساری دستاویزات جو اس دور میں ان کاغذوں پر تیار کی گئی تھیں آج تک موجود ہیں۔" کوئنز ممی کے مقبرے سے ملنے والے کاغذات (Papyrus) اور غزہ میں ریٹی کے کمرے میں موجود تابوت سے ملنے والی دستاویزات اعلیٰ قسم کی ململ سے بھی زیادہ نفیس اور بہترین بچھڑے کے چمڑے سے بھی زیادہ پائیدار ہے۔ "ایک طویل عرصے تک علماء و فضلاء یقین کی حد تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ کاغذ (Papyrus) کو سکندر اعظم نے متعارف کرایا تھا۔ اسی طرح وہ اور بہت سی باتوں کو سکندر اعظم سے منسوب کرتے ہیں مگر لیپ سیئس (Lepsius) کو قدیم مصر کے بارھویں خاندان کے مقبروں اور یادگاروں سے پیپر ائی (Papyri) کے رول ملے تھے۔ بعد میں اسے چوتھے خاندان کے مقبروں سے پیپر ائی پر بنی تصاویر بھی ملیں اور اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ فن تحریر کا علم اور استعمال قبل از تاریخ کے بادشاہ مینس (Menes) کے زمانے سے چلا آ رہا ہے اور آخر یہ بات

پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ فن اور طریقۂ تحریر شروع ہی سے تکمیلی مراحل طے کر چکا تھا۔

اس پراسرار تحریر کو پڑھنے اور اسے قابل فہم شکل میں ترجمہ کرنے کے لیے ہم شمپولین کے مرہون منت ہیں۔ اگر وہ اپنی عمر بھر کی محنت شاقہ کے بعد یہ کارنامہ سرانجام نہ دے پاتا تو آج ہم اس تصویری تحریر کے اسرار سے قطعی ناواقف ہوتے اور موجودہ دور کے لوگ اب بھی مصریوں کو جاہل ہی سمجھتے رہتے جو اس دور کے سائنس دانوں اور حکماء سے کئی فنون و علوم میں کہیں آگے تھے۔ ''وہ پہلا آدمی تھا جس نے دنیا کو بتایا کہ قدیم مصری کیسی حیرت انگیز داستانیں سنانے والے تھے۔ یہ شمپولین ہی تھا جو ان کے لامحدود مسودے اور ریکارڈ پڑھ سکتا تھا۔ مصریوں نے یہ تحریریں ہر اس جگہ اور ہر اس چیز پر چھوڑی تھیں جہاں یہ ممکن ہو سکتی تھیں۔ انہوں نے اپنی تمام یادگاروں پر یہ تصویری تحریریں کندہ کیں، چھینی سے کھود کر لکھا، پتھروں کو تراش کر تحریری شکل دی۔ فرنیچر پر چٹانوں پر پتھروں پر دیواروں پر تابوتوں پر اور مقبروں پر اسی طرح لکھا جیسے پیپرس پر لکھا تھا۔ ان کی روزمرّہ زندگی کی تصویریں ذرا ذرا سی تفصیل کے ساتھ، حیرت انگیز طور پر ہماری آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی ہیں۔ قدیم مصریوں نے کوئی ایسی بات جو ہمارے علم میں ہے کندہ کیے بغیر نہیں چھوڑی، سیسوسٹرس (Sesostris) کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وہ اور اس کے لوگ فن حرب اور جدال و قتال میں کیسے ماہر تھے۔ تصویروں سے پتہ چلتا ہے کہ دشمن کا سامنا کرتے وقت وہ کس قدر ہیبتناک ہو جاتے تھے۔ انہوں نے جنگی مشینیں بنائی ہوئی تھیں۔ ہارنر کا بیان ہے کہ تھیبس کے ایک سو دروازوں (Gates) میں سے ہر ایک سے گھوڑوں اور رتھوں (ارابہ) پر سوار دو سو آدمی نکلا کرتے تھے۔ یہ رتھ بڑے شاندار بنے ہوتے تھے اور جدید دور کے بھاری بھر کم، بے ہنگم اور غیر آرام دہ آرٹلری ویگنوں سے کہیں زیادہ ہلکے ہوتے تھے۔ کینرک ان کے بارے میں کہتا ہے: ''مختصر یہ کہ فرعونوں کے ان جنگی رتھوں کی ساخت میں ہر وہ ضروری اصول اور طریقہ استعمال کیا گیا تھا جو ایسی گاڑیوں کو چلانے اور ان کی کارکردگی بہتر بنانے میں آج بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جدید دور کے باذوق اور عشرت پسند کاریگروں کی صناعی کا پورا پورا مظاہرہ اٹھارویں خاندان کی یادگاروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔'' اسپرنگ۔ دھاتی اسپرنگ بھی ان گاڑیوں میں موجود پائے گئے ہیں۔ اس سمت میں ولکنسن کی غیر معمولی تحقیق اور اس کی کتابوں میں مذکور بیانات سے ہمیں اس بات کے کافی ثبوت ملتے ہیں کہ وہ اپنے ان جنگی رتھوں میں دھاتی اسپرنگوں کا استعمال

نامعلوم فرعون: اس فرعون کا طلائی مجسمہ توتخ آمن کے اہرام سے ملا مگر یہ کوئی نہیں جانتا کہ یہاں پر اسے دفن کیوں کیا گیا۔ اس کے سر پر سجے سرخ تاج سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ زیریں مصر پر حکومت کرتا تھا اس کے ہاتھ میں موجود ترشول اس کی حاکمیت کی نشاندہی کرتا ہے جبکہ اس کے دوسرے ہاتھ میں موجود پانی سے اناج نکالنے والا آلہ زیریں مصر کی زرخیزی کی علامت ظاہر کر رہا ہے۔

تیز رفتاری کے دوران میں جھٹکوں سے بچنے کے لیے کرتے تھے۔ ابتر واں مثبت کاری میں ان کی گھمسان کی لڑائیاں اور جنگیں دکھائی گئی ہیں جن سے ہمارے سامنے ان کے سامانِ جنگ کے استعمال اور رواجوں کی ذرا ذرا تفصیل بھی آجاتی ہے۔ بھاری ہتھیاروں سے مسلح افراد زرہ بکتر پہن کر لڑتے تھے۔ پیادہ فوجی پیٹی دار کوٹ اور خود پہنتے تھے جن پر زیادہ حفاظت کے لیے دھاتی چادر چڑھی ہوتی تھی۔

جدید اٹالین موجد میوریٹوری نے کوئی دس برس قبل اپنا ناقابلِ دخول زرہ بکتر متعارف کرایا تھ اس نے اپنی یہ ایجاد قدیم طریقے کے مطابق ہی بنائی تھی اور یہ خیال بھی اس کے ذہن میں اسی وجہ سے آیا تھا۔

کیمیا(Chemistry)اس قدیم دور میں کس درجہ کمال پر تھی اس کا اندازہ ان حقائق سے ہوتا ہے جو وائرے(Virey) نے بیان کیے ہیں۔ اپنے تذکروں میں اس نے لکھا ہے کہ متھر اڈیٹس-Mith radates) کے ایک جنرل ایسکلی پیاڈوٹس (Asclepiadotus) نے مقدس غار میں کیمیائی طور پر مہلک گیس تیار کی تھی جس کے بھپکوں نے کیوے کی طرح پائی تھونیز کو مخبوط الحواس بناد تھا۔ ''مصری تیر کمان' دہری دھار والی تلواریں اور خنجر' بلم، برچھی اور گوپھن استعمال کرتے تھے۔ لائٹ ٹروپس (Light troops) چھوٹی چھوٹی برچھیوں اور گوپھنوں (فلاخن) سے مسلح ہوتے تھے۔ رتھ سوار فوج بھالوں، بلموں اور جنگی کلہاڑیوں سے لیس تھی اور محاصرے کا آپریشن بڑا مکمل ہوتا تھا۔ ''حملہ آور'' گمنام مصنف رقم طراز ہے ''تنگ اور طویل قطاروں میں ایڈوانس کرتے تھے ان کے آگے آگے تین سائڈوں والی ناقابل دخول جنگی مشینیں ہوتی تھیں جنہیں پوشیدہ فوجیوں کا دستہ رولر کی طرح دھکیلتا تھا۔ زیرِ زمین راستوں کو وہ چور دروازوں سے ڈھک دیتے تھے۔ سیڑھیوں او کمندوں کا استعمال اور جنگی حکمت عملی درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھیں۔

دوسری چیزوں کی طرح میڈھا نما دمدمہ (قلعہ شکن مشین) بھی عام تھا اور کھدائی کر کے سرنگیں بنا کر دیواریں گرانے کے فن سے بھی وہ لوگ خوب واقف تھے'' وہی مصنف لکھتا ہے کہ ہمارے لیے اس تذکرے سے کہ مصری کیا نہیں جانتے تھے یہ کہنا بہتر ہے کہ مصری کیا کچھ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ہر گزرتا دن ان کے حیرت انگیز علم کے نئے نئے پہلو اجاگر کر رہا ہے۔ وہ مزید لکھتا ہے: ''اور اگر ہم یہ دریافت کرلیں کہ وہ لوگ آرم اسٹرانگ گن استعمال کرتے تھے تو ان دریافتوں کی روشنی میں جواب تک ان کے بارے میں ہو چکی ہیں یہ کوئی حیران کن بات نہ ہوگی۔''

اس بات کا ثبوت کہ مصری علوم ریاضی میں کامل دسترس رکھتے تھے اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ ا قدیم بابائے جیومیٹری جنہیں ہم انتہائی محترم گردانتے ہیں یہ علم سیکھنے کے لیے مصر جایا کرتے تھے مسٹر پی بلس کے بقول پروفیسر اسمتھ کہتا ہے کہ ''اہراموں کے معماروں کا علم جیومیٹری وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں اقلیدس کا علم ختم ہوتا ہے''یونان کے وجود میں آنے سے قبل ہی مصریوں کے علوم وفنون پختہ اور قدیم ہو چکے تھے۔ جیومیٹری پر مبنی زمین کی پیائش کے علم سے مصری پتہ

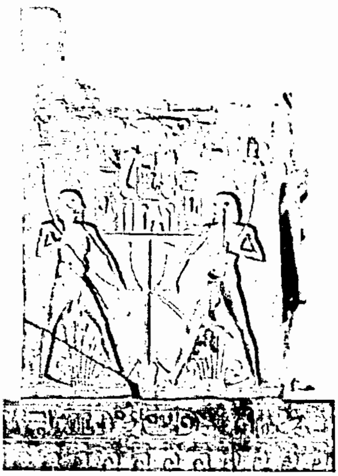

اتحاد اور فلاح وبہبود کے دیوتا: اس نقش میں بالائی اور زیریں مصر کے پودوں کنول اور نرسل کو یکجا کیا جارہا ہے جس کا مطلب دونوں سرزمینوں کا اتحاد اور یگانگت ہے۔ نقش میں موجود دونوں دیوتا "دریائے نیل کے دیوتا" کہلاتے تھے جو زرخیزی کی علامت تھے اور ہر سال دریائے نیل میں سیلاب لاکر زمینوں کو سیراب کرتے تھے۔

اچھی طرح واقف تھے۔ بائبل کے مطابق حضرت یوشع نے مقدس سرزمین کو فتح کرنے کے بعد اسے تقسیم کرنے کا عمل بہ خوبی سرانجام دیا تھا اور وہ لوگ جو فطری فلسفے میں مصریوں جیسی مہارت رکھتے تھے کیسے علم نفسیات اور روحانی فلسفے سے بے بہرہ رہ سکتے تھے؟ ان کے منادر اعلیٰ ترین تہذیب کی نرسریاں تھیں یہاں علم ساحری درجہ کمال کو پہنچا ہوا تھا جو ایکطرح سے فطری فلسفے کا ہی ماحصل ہے۔ ہمیں فطرت کی پراسرار قوتوں کا علم انتہائی رازداری سے سکھایا جاتا تھا اور ان سرّی عملیات کے دوران میں حیرت انگیز علاج بھی کیے جاتے تھے۔ ہیروڈوٹس تسلیم کرتا ہے کہ یونانی جو کچھ بھی جانتے تھے یہاں تک کہ اپنے منادر کی مقدس رسومات بھی، وہ انہوں نے مصریوں سے ہی سیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بڑی بڑی عبادت گاہیں مصری دیوتاؤں ہی سے منسوب تھیں۔ آرگس کا مشہور معالج اور پیش گو اپنی دواؤں کا استعمال مصریوں کے طریقے پر ہی کرتا تھا جن سے اس نے یہ علم حاصل کیا تھا اور یہ طریقہ وہ صرف اس وقت عمل میں لاتا تھا جب اسے کسی کا مکمل علاج کرنا ہوتا تھا۔ اس نے افیکلس (Iphiclus) کی ناکارگی اور نامردی کا علاج مینٹس کی ہدایات کے مطابق لوہے کے زنگ سے کیا تھا۔ اسپرینگل نے اپنی "History Of Medicine" نامی کتاب میں ایسے ہی کئی معجزاتی علاجوں کا تذکرہ کیا ہے۔

ڈائیڈورس نے مصریوں کے بارے میں اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ آئی سس (Isis) نے لایموتیت (حیات جاودانی) کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ زمین پر موجود تمام قومیں اس دیوی کی طاقت کی گواہ تھیں کہ وہ اس کی مدد سے ہر قسم کے مرض کے علاج کر دیا کرتی تھی۔ وہ کہتا ہے: "نہ صرف یونانی داستانوں سے بلکہ مستند حقائق سے بھی یہ بات ثابت ہو چکی ہے" گیلن (Galen) نے کئی ایسے نسخے اور علاج ریکارڈ کیے ہیں جو ان منادر کے ہیلنگ وارڈز میں محفوظ تھے۔ اس نے ایک ایسی عالمگیر دوا کا بھی تذکرہ کیا ہے جو اس کے زمانے میں "آئی سس" کہلاتی تھی۔

"بے شمار ان یونانی فلسفیوں کے نظریات و تعلیمات سے جنھوں نے مصر میں اکتسابِ علم کیا تھا ان کے تبحر علمی کا پتا چلتا ہے۔ آرٹی پینس کے مطابق اور فیئس (جو حضرت موسیٰ کا پیروکار تھا)

فیثا غورث ' ہیر وڈوٹس اور افلاطون اپنے تمام تر فلسفیانہ نظریات کے سلسلے میں انہی منادر کے خوشہ چین ہیں جن کے راہبوں نے سولون (Solon) کو تعلیم دی تھی۔ پلینی کہتا ہے کہ اینٹی کلائیڈس کے مطابق "حروف ابجد کی ایجاد مصر میں مینن (Menon) نامی ایک شخص نے یونان کے قدیم ترین بادشاہ فورونیئس (Phoroneus) کے دور سے پندرہ برس قبل کی تھی۔" جیلونسکی نے یہ ثابت کیا ہے کہ مصری راہب شمس مرکزی نظام اور زمین کی کرویت سے لامتناہی زمانوں سے واقف تھے۔ "یہ نظریہ" وہ رقم طراز ہے "فیثا غورث نے مصریوں سے لیا تھا اور مصریوں نے اسے ہندوستان کے برہمنوں سے اپنایا تھا۔" کیمبرے کے نامور آرچ بشپ فینیلاون نے اپنی کتاب (Lives of the Ancient Philosophers) میں فیثا غورث کے تبحرِ علمی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو یہ بھی بتاتا تھا کہ چونکہ زمین گول ہے اس لیے اس کے متقابل کرۂ ارض بھی ہیں اور ہر جگہ انسان آباد ہیں اور یہی وہ عظیم ریاضی داں تھا جس نے سب سے پہلے یہ دریافت کیا کہ صبح اور شام کا ستارہ دراصل ایک ہی ستارہ ہے۔ اب اگر ہم یہ جانتے ہیں کہ فیثا غورث تقریباً سولھویں اولپیڈ یعنی سات سو قبل مسیح کا آدمی تھا اور اس نے یہ باتیں اس عہد قدیم میں بتائی تھیں تو ہمیں یہ ماننے میں ذرا بھی تامل نہیں ہونا چاہئیے کہ ان حقائق سے اس سے پہلے کے دور کے لوگ بھی واقف تھے۔ ارسطو' لارٹیس اور دیگر بہت سارے ایسے فلسفیوں کے ان ملفوظات سے جن میں فیثا غورث کا تذکرہ ملتا ہے، پتا چلتا ہے کہ اس نے گرہن سے متعلق خمیدگی' کہکشاں میں ستاروں کی ترتیب و تجمیع اور چاند کی روشنیٔ مستعار کے بارے میں مصریوں ہی سے اکتساب کیا تھا۔

ولکنسن، دیگر محققین سے اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مصریوں نے وقت کو تقسیم کر لیا تھا۔ سال کی صحیح طوالت سے واقف تھے اور تقدیم اعتدالِ شب و روز ان کے علم میں تھی۔ ستاروں کے طلوع و غروب کے اوقات کو محفوظ کر کے وہ ان کی حالتوں سے ان کے مخصوص اثرات کو سمجھتے تھے۔ وہ اجرام فلکی کے اتصال سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے راہب اس قدر درست پیش گوئی کرنے کی اہلیت رکھتے تھے جتنی آج کے ماہر فلکیات رکھتے ہیں۔ موسمی تبدیلیوں کا علم اور نجمی حرکات سے آنے والے واقعات کی خبر بھی ان کی دسترس میں تھی۔ حالانکہ سنجیدہ مزاج اور خوش گفتار سسرو (Cicero) بابلی راہبوں (Babylonian Priests) کے بارے میں اس مبالغہ آرائی کے خلاف غصہ کرنے میں جزوی طور حق بجانب ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے چار لاکھ ستر ہزار سالوں کے عرصے میں ہونے والے مشاہدات کو اپنی یادگاروں اور آثاروں پر محفوظ کر رکھا ہے۔ تاہم قدماء نے علم ہیئت و فلکیات کو جس دور میں اوجِ کمال پر پہنچا دیا تھا وہ اب بھی جدید شماریات کی حدوں سے دور کی بات ہے۔

ہمارے ایک سائنسی جریدے کے مصنف لکھتے ہیں کہ : "ہر علم اپنے ارتقاء میں تین منازل سے گزرتا ہے۔ پہلی مشاہدے کی منزل ہے جب کئی اذہان کئی مقامات پر حقائق کو جمع کرتے ہیں اور اندراج کرتے ہیں۔ اگلی منزل عمومیت (Generalization) کی ہے جہاں احتیاط سے تصدیق

شدہ حقائق کو ایک خاص طریقے سے ترتیب دیا جاتا ہے، ایک نظم کے ساتھ ان کی تعمیم کی جاتی ہے اور پھر منطقی انداز میں ان کی درجہ بندی کر دی جاتی ہے تاکہ ان سے نتائج اخذ کیے جا سکیں اور واضح اصول و قوانین بنائے جا سکیں۔ آخر میں پیشین گوئی کی منزل آتی ہے جب ان اصول و قوانین کا اس انداز میں اطلاق کیا جاتا ہے کہ ہونے والے واقعات کی انتہائی درست پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔"

اگر ہزاروں سال قبل مسیح میں چینی اور کلدانی ہیئت داں گرہنوں کے بارے میں درست پیش گوئی کر سکتے تھے (ثانی الذکر شاید ساروس کی گردش یا کسی اور ذریعے سے ایسا کرتے تھے تب بھی کوئی بات نہیں) تو بھی یہی اصول و قوانین کار فرما تھے۔ وہ لوگ علم ہیئت کے آخری اور بلند ترین مقام پر فائز تھے۔ وہ واقعی پیش گوئی کر سکتے تھے۔ اگر وہ ۲۲۷۱ قبل مسیح میں منطقۃ البروج (راس منڈل) کی تصویر کشی کر سکتے تھے اور خزانی (Autumnal) تقدیم اعتدال شب و روز میں (Equinox) سیاروں کے اس قدر درست مقامات بتا سکتے تھے جتنا آج کے دور میں پروفیسر مچل (Professor Mitchell) تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ان قوانین سے بھی واقف تھے جو "بڑی احتیاط سے تصدیق شدہ حقائق" میں باقاعدگی پیدا کرتے ہیں اور ان قوانین کا اطلاق وہ اسی تیقن سے کرتے تھے جس سے ہمارے آج کے ماہر فلکیات کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ علم ہیئت ہی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "یہ واحد علم (Science) ہے جو ہماری صدی میں تکمیل کی آخری منزل تک پہنچ چکا ہے۔ دیگر علوم ابھی تک مختلف ارتقائی منازل میں ہیں۔" برقیات اپنی چند شاخوں میں ترقی کی تیسری منزل پر ہے جب کہ اس کی دیگر کئی شاخیں ابھی تک اپنے دورِ طفولیت میں ہی ہیں"۔ ہم جانتے ہیں کہ اس بات کو سائنس داں بھی بڑی برہمی سے تسلیم کرتے ہیں اور ہم خود بھی یہ سن کر بڑے دل گرفتہ سے ہو جاتے ہیں کیونکہ ہم بھی اسی صدی میں رہتے ہیں مگر کلدانی، آشوری اور بابلی دور عروج کے لوگ اس دل گرفتگی سے آزاد تھے۔

دیوتا اوسرس (Osiris) کو مغرب کا سب سے چہیتا اور مشہور دیوتا مانا جاتا ہے اور آخرت کے ضمن میں جو بھی تقریبات اور رسوم ہوتی تھیں وہ اس دیوتا کے نام پر ہوتی تھیں اس کی سرحدیں زمین کے نیچے بہت وسیع متصور کی جاتی تھیں اور زیرزمین حساب کتاب کی اس دنیا کا منظر قدیم مصر کے لوگ مصر کی سرزمین کی طرح سمجھتے تھے۔

دوسرے علوم کے ارتقاء کی 'وہ لوگ' کس منزل پر تھے یہ ہمیں نہیں معلوم مگر علم ہیئت میں ہمارے ہمسر تھے کیونکہ وہ تیسری اور آخری منزل تک پہنچ چکے تھے۔ یونان کے مٹی کے برتنوں کے حاشیوں پر خوبصورت گل کاری پر لیکچر کے دوران میں اس نے عہد رفتہ کے دیوانوں کو اس وقت مشتعل کر دیا جب یہ کہا کہ یہ گل کاری اور تصویر نگاری یونانیوں کا کارنامہ ہے جب کہ حقیقت میں "وہ محض مصری برتنوں کی نقالی تھی۔" یہ نقاشی اور تصویر نگاری کسی بھی دن جا کر آمونوف اول کے عہد کے مقبرے کی کسی

بھی دیوار پر دیکھی جا سکتی ہے اور یہ وہ دور تھا جب یونانیوں کا وجود تک نہ تھا۔

زیریں نیوبیا (Lower Nubia) میں ایسمبول (Ipsambul) کے چٹانی منادر کا کیا ہم ا دور کی کسی ایسی ہی چیز سے موازنہ کر سکتے ہیں؟ وہاں سترفٹ انسانی مجسمے نشستی حالت میں دیکھے سکتے ہیں جنہیں سنگ لاخ چٹانوں کو تراش کر بنایا گیا ہے۔ تھیبس (Thebes) میں رعمیس د (Rameses II) کا مجسمہ ہے جس کے شانوں کا محیط ساٹھ فٹ ہے اور اسی مناسبت سے جسم دوسرے حصے ہیں۔ ان جناتی مجسموں کے سامنے ہمارے اپنے دور کے بنائے ہوئے مجسمے بونے ہیں۔ پہلے اہرام کی تعمیر سے قبل سے مصری لوہے سے واقف تھے جو بنسن (Bunsen) کے مطا بیس ہزار سال پہلے کا زمانہ تھا۔ اس بات کا ثبوت ہزاروں برسوں تک شی اوپس کے اہرام میں پوشی رہا یہاں تک کہ کرنل ہاورڈ وائس کو ایک جوڑ میں لوہے کا ایک ٹکڑا ملا جو یقینی طور پر اس اہرام کی تع کے ابتدا ہی میں رکھا گیا تھا۔ ماہرِ مصریات اس بات کے کئی حوالے پیش کرتے ہیں کہ قبل از تار کے زمانے سے ہی مصری دھات کی صفائی کے ہنر سے آشنا تھے۔ ”آج بھی ہمیں سینائی میں میل کچیا کا ڈھیر نظر آتا ہے جو دھاتوں کو پگھلانے سے پیدا ہوا تھا۔ اس زمانے میں فلزیات (دھات کاری) ا کیمیا کو الکیمی کے نام سے پکارا جاتا تھا اور انہیں قبل از تاریخ کی ساحری کی بنیاد سمجھا جاتا تھا۔ اس ے علاوہ حضرت موسیٰ نے بھی اپنی الکیمی (کیمسٹری) کے علم سے واقفیت کا ثبوت سونے کے بچھڑے پاؤڈر بنا کر اور اسے پانی پر چھڑک کر پیش کیا تھا۔ اگر جہاز رانی کی طرف آئیں تو ہمیں بڑے مت حوالوں سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ نیچو دوم (Necho II) نے بحر احمر میں ایک بحری بیڑا تی کروایا تھا اور اسے تفتیشی و تحقیقی مہم پر روانہ کیا تھا۔ یہ بحری بیڑا دو سال تک غائب رہا اور جب لوٹا اپنے مجوزہ راستے آبنائے بابل مینڈل کے بجائے آبنائے جبرالٹر سے آیا۔ ہیروڈوٹس مصر کی اس عظی بحری مہم کی کامیابی کو آسانی سے تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ کہتا ہے کہ مصری یہ خبر اڑا رہے تے کہ ”جب وہ واپس آرہے تھے تو سورج ان کے دائیں طرف سے نکل رہا تھا جو میرے لیے قطعی نا قابل یقین ہے۔“

”اس کے باوجود“ اسی مضمون کا مصنف لکھتا ہے: ”یہ نا قابلِ یقین بیان اب غیر متنازع ثابت ہو چکا ہے کیونکہ وہ لوگ جو کیپ آف گڈ ہوپ کا آمد و رفت کا سفر کر چکے ہیں اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔“ اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ان زمانہ قدیم کے لوگوں نے وہ کارنامہ پہلے ہی سر انجام دے دیا تھا جو صدیوں بعد کولمبس کے نام سے منسوب ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے راستے میں دوبار لنگر ڈالے تھے، غلہ اگایا تھا، فصل کاٹی تھی اور کامیابی کے جھنڈے لہراتے ہوئے اور ”پلرس آف ہرکیولس“ میں سے گزرتے بحر اوقیانوس کی مشرق کی سمت آگئے تھے۔ ”یہ و لوگ تھے۔“ مصنف مزید لکھتا ہے: ”جو رومیوں اور یونانیوں سے کہیں زیادہ کار آزمودہ اور تجربہ کار کہلانے کے مستحق تھے۔ یونانیوں نے جو ابھی اپنے علوم میں نوخیز تھے فتح کے بگل بجا دیئے اور دنیا سے اصرار کرنے لگے کہ وہ ان کی قابلیت کے سامنے سر جھکا دیں“۔ اس کے برخلاف قدیم مصری

علم و دانش میں یکتائے روزگار تھے اپنے کارناموں میں مگن رہے انھیں کسی سے داد و تحسین کی
ب نہیں تھی۔ اوچھے یونانیوں کی رائے کی انھیں اتنی بھی پروا نہیں تھی جتنی آج ہمیں جزائر فیجی
(FIJI) کے باشندوں کی ہو سکتی ہے۔

''اوہ سولون سولون'' بزرگ ترین مصری راہب نے اس دانا سے کہا: ''تم یونانیوں کی حرکتیں
شہ سے طفلانہ رہی ہیں تمھیں قدماء کا ذرا احترام نہیں ہے اور نہ ہی تم کسی مربوط نظم و ضبط کے حامل
۔'' اور جب اس مصری راہب نے عظیم سولون کو یہ بتایا کہ یونان کے تمام دیوی اور دیوتا در اصل
سری دیوتاؤں ہی کا بہروپ ہیں تو بلاشبہ وہ حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ زونارس نے بالکل سچ کہا ہے: ''یہ
ام چیزیں ہم تک کلدانیوں سے مصر آئیں اور وہاں سے انھیں یونانیوں نے اخذ کیا۔'' سر ڈیوڈ
یوسٹر نے کئی خودکار مشینوں کے بڑے روشن حوالے دیئے ہیں اور اٹھارویں صدی اپنے مشینی شاہ
ر ''واکنسن کا بانسری نواز'' (Flute-player of Vaucanson) پر نازاں ہے۔ اس موضوع
قدیم مصنفین سے جو بات ہم تک پہنچی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ ارشمیدس کے زمانے میں اور
ظیم سائراکیوز کے دور سے بھی قبل چند ایسے ماہر مشین ساز یا مکینک تھے جو کسی بھی طور جدید دور
کے موجدوں سے کم اختراع پسند اور ماہر نہیں تھے۔ تارنتم (Tarentum) اٹلی کا رہنے والا آرچی
س(Archytas)، افلاطون کا استاد اور ایک ایسا فلسفی تھا جو علم ریاضی میں مہارتِ تامہ کے
اتھ ساتھ عملی میکانیات میں بڑا امتیاز مقام رکھتا تھا۔ آرچی تاس نے لکڑی کی ایک فاختہ بنائی تھی۔
بلاشبہ ایک حیرت انگیز میکانکی ایجاد تھی کیونکہ یہ فاختہ اڑتی تھی۔ اپنے پروں کو پھڑپھڑاتی تھی اور
فی دیر تک فضا میں ٹھہر سکتی تھی۔ اس ہنرمند نے جو چار سو سال قبل مسیح کا آدمی تھا لکڑی کی فاختہ
کے علاوہ اسکریو، کرین اور کئی آبی مشینیں (Hydraulic Machines) بھی ایجاد کی تھیں۔

''مصری اپنے انگوروں کو خود نچوڑتے اور ان کی شراب بناتے تھے۔ یہ کوئی کمال کی بات نہیں
ہے مگر وہ اپنی بیئر (Beer) بھی خود کشید کرتے تھے اور بڑی مقدار میں کرتے تھے۔'' ہمارا ماہر
صریات رقم طراز ہے۔ اب ایبرس (Ebers) کے مسودے سے بھی یہ بات ثابت ہو چکی ہے اور
ں میں کوئی شک نہیں ہے کہ مصری دو ہزار قبل مسیح میں بیئر استعمال کرتے تھے۔ ان کی بیئر یقیناً
ی تیز اور شاندار ہوگی جیسی کہ ان کی دوسری چیزیں تھیں۔ وہ ہر قسم کی شیشہ سازی کا کام کرتے
تھے۔ مصری مجسمہ سازی میں ہمیں کئی ایسے مناظر ملتے ہیں جن میں شیشے کو پگھلانے اور بوتل بنانے
کے عمل کو دکھایا گیا ہے۔ گاہے گاہے اثریاتی تحقیق کے دوران میں شیشے کے ٹکڑے اور ظروف بھی
ملتے رہے ہیں اور بلاشبہ وہ بڑے خوبصورت ظروف ہیں۔ سر گارڈنر ولکنسن کا کہنا ہے کہ مصری
شین کو کاٹنا، پیسنا اور اس پر کندہ کاری کرنا جانتے تھے۔ ان کے پاس کسی چیز کی دو سطحوں کے درمیان
ونا لگانے کا فن بھی تھا۔ شیشے، موتی، زمرد اور تقریباً تمام بیش قیمت پتھروں کی تراش خراش کے
ن میں وہ مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔

کیا اہرام دیوزادوں نے تیار کیئے ہیں

کیا یہ ممکن ہے کہ کسی دیو قامت (Giant) نسل نے زمین پر اپنی حکمرانی کی یادگار کے طور پر یہ اہرام تعمیر کیے ہوں؟ کیا کبھی انسانوں کی کوئی نسل اس قدر طاقت ور بھی رہی ہے کہ اہرام کی تعمیر میں استعمال ہونے والے بڑے بڑے بھاری پتھروں کو ان کے دو چار آدمی ہی بڑی آسانی سے اٹھا لیتے تھے؟ قدیم تصورات کے اس دیو قامتوں والے حصے کو یکسر رد کر دینے سے پہلے ہمیں درج ذیل حقائق پر نظر ڈال لینی چاہیئے:

خوفناک خوابوں کی دم لہراتی، دانت پیستی ہیبت ناک مخلوق کی طرح یہ دیو قامت انسان تاریخ کے دھندلکوں میں سے نکل آئے ہیں اور ایک بار پھر ہم سائنسی حقائق سے ان کے ٹکراؤ کے گرداب میں پھنس گئے ہیں۔ علمائے سائنس آج تک اس بات کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہیں کہ دنیا میں کبھی کوئی نسل انسانی ایسی بھی گزری ہے جو موجودہ دور کے اوسط قامت انسان سے زیادہ دراز قامت رہی ہو اور اگر آپ عجائب گھر میں جا کر قدیم دور کے زرہ بکتروں کا مشاہدہ کریں تو آپ جان جائیں گے کہ اس سلسلے میں ہمارے سائنس دانوں کے بیانات کس قدر درست ہیں۔ آج کی صحت مند اور توانا نسل کے مقابلے میں ہمارے آباؤاجداد پست قامت اور کمزور تھے۔

چنانچہ سائنسدان کہتے ہیں کہ دیوزادوں کا وجود ناممکنات میں سے ہے۔ تاہم قدیم دفن گاہوں سے نکلنے والے ڈھانچے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ چند ہزار سال قبل دنیا میں ایک بے حد طاقت ور اور طویل قامت نسل آباد تھی۔ یہ ڈھانچے ہوموسیپئن کی بنیادی نسل کے ہو سکتے ہیں، کسی اور سیارے کی مخلوق کے ہو سکتے ہیں یا کسی زوال پذیر تہذیب کے پس ماندگان کے ہو سکتے ہیں داستانیں تو اس دیوزاد مخلوق کی قدیم ترین زمانوں سے چلی آ رہی ہیں۔ بائبل کی آیات میں بھی اس جناتی مخلوق کا ذکر موجود ہے۔ غائب ہونے سے پہلے ممکن ہے ان دیوزادوں نے اپنی یادگار کے طور پر یہ اہرام بنا ڈالے ہوں۔ حیرت کی بات ہے کہ ان دیوزادوں سے متعلق ہمارے پاس حقائق کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ان کا قد آٹھ سے تیرہ فٹ تک تھا۔ ان کی اوسط لمبائی دس فٹ تھی۔ ان کے ڈھانچے، کھوپڑیاں اور ہڈیاں زمین کے تقریباً تمام حصوں سے کھود کر نکالی جا چکی ہیں۔ ماضی کی دیومالائی اور لوک داستانیں ہمیں بتاتی ہیں کہ دیوزادوں کا یہ قبیلہ بدکار اور شیطانی صفات کا حامل تھا اور عام قدو قامت کے مرد اور عورتوں کو قتل کرنے، ہراساں کرنے اور اغوا کر لینے میں انہیں خاص لطف آتا تھا۔ مستند علوم کے کسی بھی سائنس داں نے آج تک ان دیوزادوں سے متعلق شواہدات پر غور کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی ہے۔ آج ان دیوزادوں کے متعلق حقائق کا جتنا بھی

ذخیرہ ہمارے سامنے ہے وہ سب کا سب پر جوش' شوقین مزاج اور غیر پیشہ ور افراد کے ایک گروہ کی تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ دیوزادوں کے شکاریوں کے اس گروہ کا ایک ممتاز رکن جون بیٹل نامی ایک انگریز ہے جو کم وبیش تیس برسوں سے ان دیوزادوں کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ پڑھا لکھا' متجسس' وسیع کاروبار کی وجہ سے مالی طور پر مستحکم جون بیٹل ان دیوزادوں سے متعلق معلومات کے تعاقب میں دنیا کے درجنوں ممالک کے چکر لگا چکا ہے۔ بیٹل نے اس دراز قامت نسل کے بارے میں معلومات اور شہادتیں مشرق وسطیٰ کے پراسرار شہروں' روسی سائبیریا کے ویران جنگلوں اور بنجروں و منجمد خطوں اور ایشیا کے دور دراز کے علاقوں سے جمع کی ہیں۔ عجیب اور غیر معمولی چیزوں کے بارے میں تحقیق' آزاد اذہان کے مالک افراد کے لیے پناہ گاہ اور دل بھرے اکتائے ہوئے اور بور لوگوں کے لیئے مقناطیس کا کام کرتی ہے۔ برطانیہ میں جون بیٹل کا آبائی مکان جہاں وہ اپنا کاروبار فروخت کر کے ریٹائر منٹ کی زندگی گزار رہا ہے' کتابوں سے' فائلوں سے' قدیم مسودات سے اور دیو قامت ہڈیوں کے متاثر کن ذخیرے سے بھرا ہوا ہے۔ "سائنسی تعلیم و تربیت کی کمی کی تلافی میری وسیع دولت اور میرے ذوق و شوق نے کر دی" جون بیٹل نے اپنے مخصوص انگریزی لہجے میں بولتے ہوئے کہا "میں نے قدیم انگریزی ادب میں ان دیوزادوں کے متعلق رپورٹیں دیکھی ہیں دنیا کے تقریباً تمام ممالک کی لوک داستانیں ان کی کہانیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ تیس سال کی تحقیق و جستجو کے بعد میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ دنیا میں اس دیوزاد نسل انسانی کا وجود یقیناً تھا۔ آپ یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ دیو قامت لوگ انسانوں کی ایک ایسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جن کے قد طوالت اختیار کر گئے تھے۔ ایسی بات نہیں تھی۔ ان جناتوں کی اصل نسل انسانوں سے کئی لحاظ سے مختلف تھی۔ یہ لوگ بڑے دغاباز تھے۔ ان کے جبڑے بڑے بڑے تھے۔ ان کے دانتوں کی دو دو قطاریں تھیں۔ ہمارے پاس آج جانوروں کی' خاص طور پر رینگنے والے جانوروں کی ایسی قسمیں موجود ہیں جن کے منہ میں دانتوں کی دو قطاریں ہیں چنانچہ یہ کوئی فطرت سے بعید بات نہیں ہے۔ یہ دیوزاد دنیا سے کب فنا ہوئے؟ ان جناتوں کی اصل نسل یعنی دیو قامت اور دوہرے دانتوں والے لوگ بائبل کے ادوار میں قتل کر دیئے گئے تھے۔ ان میں سے چند ایک افراد اس عذاب سے بچ کر دنیا کے دور دراز کے کونوں میں جا چھپے تھے۔ اٹھارویں صدی تک اس باقی ماندہ مخلوق کے بارے میں خبریں ملتی رہی تھیں۔ اب بھی ان وحشیوں کی اولادیں جنگلوں کے تاریک خطوں میں آباد ہیں۔ جناتوں کی یہ نسل کیوں معدوم ہو گئی؟ "موزوں اور لائق ہی بقاء کے سزاوار ہیں۔" جون بیٹل نے جواب دیا۔ "عام آدمی تہذیب و تمدن کی تعمیر کی کوششوں میں مصروف تھا۔ ہمارے آباؤ اجداد شکاری سے کسان بنتے جا رہے تھے۔

فرعون بسائر کے اہرام سے نکلا ہوا نقش جس میں دربار سے وابستہ دندان ساز کی تصویر موجود ہے جو ۲۷۰۰ قبل مسیح کے دوران فرعون کے درباری امراء کے دانتوں کے امراض کا علاج کیا کرتا تھا۔

زراعت لوگوں کے یا معاشرے کے کسی ایک جگہ قیام کی متقاضی ہے۔ جب کسان دھرتی میں بیج بوتا ہے تو فصل پکنے اور اسے کاٹ لینے تک اس کا وہاں قیام ناگزیر ہوتا ہے۔ ایسے میں یہ دیوزاد یا ان کی نسل کے افراد پہاڑوں پر سے غراتے' شور مچاتے' دندناتے آتے' کچھ کھوپڑیاں توڑتے' مردوں کو قتل کر دیتے' ان کی عورتوں کی آبروریزی کرتے اور یونہی چلاتے طوفان اٹھاتے لوٹ جاتے۔ بچوں کو یہ دیوزاد اٹھا کر اپنے بھٹوں میں لے جاتے جہاں ان سے غلاموں کا کام لیا جاتا یا انہیں آگ پر بھون کر کھالیا جاتا تھا۔ یہ دیوزاد انسانی تہذیب کے فروغ کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ تھے۔ پھر عام آدمی ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک ایک کر کے ان کا صفایا کر دیا۔" اس سلسلے میں دوسرے اس سے بھی زیادہ حیران کن نظریات ہیں۔ چند محققین کا خیال ہے کہ یہ دیوزاد دیوتاؤں کے (خدا کے) بیٹے تھے جن کا ذکر بائبل میں "جن" کے نام سے کیا گیا ہے۔ تورات کی کتاب اول (عہد نامہ عتیق کی پہلی کتابوں) میں مذکور ہے۔

"اور وقت گزرتا رہا۔ انسان سینۂ گیتی پر پھیلنے لگے۔ ان کے یہاں بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ خدا کے بیٹوں نے دیکھا انسانوں کی یہ بیٹیاں بڑی خوب صورت تھیں۔ وہ آتے، ان میں سے زیادہ حسین لڑکیوں کو منتخب کرتے، انہیں لے جاتے اور اپنی بیویاں بنا لیتے اور مالک (Lord) نے کہا میری روح ہمیشہ انسانوں کے ساتھ کوشاں نہیں رہے گی کیونکہ انسان گوشت پوست کا بنا ہوا ہے اور اس کی عمر ایک سو بیس سال ہو گی۔ اس دور میں زمین پر جنات بھی آباد تھے۔ چنانچہ اس کے بعد جب خدا کے بیٹوں نے انسانوں کی بیٹیوں سے شادیاں کر لیں اور ان سے اولاد پیدا ہوئی تو یہ اولاد طاقت ور آدمی بنے جو لمبی عمر کے تھے اور معروف تھے۔" اگر اتفاقاً آپ بائبل میں جنوں کے حوالے یا ان کا تذکرہ دیکھنا چاہیں تو "کنگ جیمس" یا اس کے ساتھ کا کوئی ایڈیشن دیکھیں۔ وہ علماء جنہوں نے بائبل کے نسخوں کی تدوینِ نو کر کے انہیں جدید شکل دی ہے وہ جب جنوں والی آیات پر آتے تھے تو اپنی بے یقینی کی وجہ سے ان آیات ہی کو حذف کر دیتے تھے۔ اس مخلوق کے کئی حوالے جو بائبل میں موجود تھے جدید نسخوں میں یا بالکل نکال دیئے گئے ہیں یا ان میں سے ردوبدل کر دیا گیا ہے۔ بعض افراد تورات کے اس حصے پر اور چند حصوں پر جو شاید "سلووینک انوک یا دی بک آف دی سیکریٹ آف انوک" نامی غیر مستند انجیلوں سے لیے گئے ہیں، پورا یقین رکھتے ہیں۔ روس کے پروفیسر ایگرسٹ اور امریکا کی کارنیل یونیورسٹی کے ممتاز ایگزوبایولوجسٹ ڈاکٹر کارل سیگن کا متفقہ بیان ہے کہ انوک کی داستان اڑن طشتری کی مہمات کے سلسلے ہی کی ایک کڑی ہے۔ انوک جس نے کسی بدمست ارضی باشندے کی طرح اپنی داستان لکھی ہے، کہتا ہے کہ اسے آسمانوں کی سیر کے لیے لے جایا گیا۔ پانچویں آسمان پر جس کے بارے میں کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ وہ جوپیٹر سیارہ ہو گا' اس کی ملاقات انتہائی طویل قامت جنوں سے کروائی گئی۔ انہیں "بے رتبہ فرشتے" یا گریگوری کہا جاتا تھا۔ ان کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے اور ان کے منہ پر مستقل خاموشی کی مہر لگی ہوئی تھی"۔ اٹھارویں باب میں، جسے تورات کا اصل ماخذ سمجھا جاتا ہے انوک لکھتا ہے:

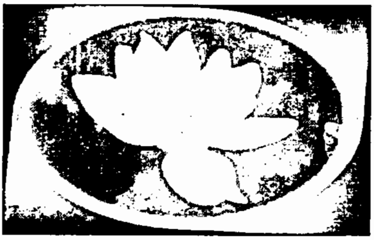

کھلتا ہوا کنول: قدیم مصر میں جادو اور طب میں پودوں کا استعمال بہت اہمیت کا حامل تھا۔ اس ضمن میں کھلتے ہوئے کنول کو بہت اہمیت حاصل تھی جسے نہ صرف جادو اور ادویات میں استعمال کیا جاتا بلکہ عبادت گاہوں میں بھی اس کی تصاویر نقش کی جاتی تھیں۔

"گریگوی نے ارمن' پہاڑی پر اپنے عہد توڑ دیئے۔ انہوں نے انسانوں کی بیٹیوں کو دیکھا کہ وہ کس قدر حسین تھیں۔ انہوں نے ان بیٹیوں کو اپنی بیویاں بنالیا اور اپنے کارناموں سے زمین کو ناپاک اور گندہ کر دیا۔ انہوں نے لاقانونیت پھیلا دی اور سب گڈمڈ ہو گئے۔ ان سے جنات پیدا ہوئے' لمبے تڑنگے آدمی' وحشی اور تند خو۔" اب ان خدا کے بیٹوں کو کون شناخت کر سکتا ہے؟ کوئی ان کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہے؟ بلاشبہ یہ لوگ فانی مخلوق تھے۔ زمین کی حسین عورتوں کے لیے ان کی آنکھوں میں ہوس تھی۔ ان کے اتصال سے ان کے ہاں جنات نے جنم لیا جو بڑے خوفناک تھے اور بدسرشت تھے۔ عہد نامہ عتیق کی پانچویں کتاب کے دوسرے باب میں 'ہمیں 'ریفائم' کے بارے میں بتایا گیا ہے جو جنوں کا ایک اور گروہ تھا۔ یہ گروہ ایک جنگ میں بادشاہ کیدورلومر سے شکست کھا گیا تھا۔ ہم نے مشہور داستانوں میں اکثر یہ پڑھا ہے کہ چھوٹے سے ڈیوڈ نے میدان جنگ میں گولائتھ دی گوتھ کو شکست دے دی تھی۔ گولائتھ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ چھ ہاتھ سے زیادہ لمبا یعنی تقریباً ۲/۱ ۹ فٹ کا تھا۔ اس کا دھاتی کوٹ یا زرہ بکتر پانچ ہزار تانبے کے سکوں جتنا یعنی ۲۰۸ پونڈ وزنی تھا۔ اس کے نیزے کا وزن پچیس پونڈ سے بھی زیادہ تھا۔ بشام کا حکمران شاہ اوگ جس پلنگ پر استراحت فرمایا کرتا تھا اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "پلنگ" لوہے کا تھا۔ اس کی لمبائی نو کیوبٹ (مربع فٹ) تھی۔ اس کی چوڑائی چار کیوبٹ تھی ایک آدمی کے کیوبٹ کے حساب سے۔" آدمی کا ایک کیوبٹ اس کی درمیانی انگلی کے سرے سے لے کر کہنی تک کی لمبائی یا کم از کم آدھے گز کا ہوتا ہے۔ اس حساب سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ بادشاہ اوگ کے شہر کی لمبائی کم از کم تیرہ فٹ تھی۔ بادشاہ اوگ کا ذکر کئی مشرقی لوک داستانوں میں ملتا ہے۔ "مشرقی راہبوں نے بادشاہ اوگ سے متعلق داستانوں میں کچھ زیادہ ہی مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔" جون بیٹل نے کہا۔ "ہندوستان کی ایک داستان میں تو یہ مبالغہ آرائی درجۂ کمال تک پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ اوگ حضرت نوحؑ کی کشتی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور پانی اس کے گھٹنوں تک آ رہا تھا۔ اوگ کی ہڈیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اس قدر لمبی تھیں کہ کسی چوڑے دریا پر پل بنانے کے لیے گرڈر یا شہتیر کا کام دے سکتی تھیں۔"

آج بھی دیوزادوں کی ہڈیاں قدیم قبروں سے کھود کر نکالے جانے کا عمل جاری ہے۔ ماہرینِ اثریات (Archaeologists) آج تک اس بات کا جواب نہیں دے سکے ہیں کہ ۱۹۶۹ء کے موسم بہار میں اٹلی میں ایک قدیم قبرستان کی کھدائی کی گئی تھی تو وہاں برابر برابر رکھے ہوئے پچاس جناتی ڈھانچے کہاں سے آ گئے تھے۔ روم سے ساٹھ میل دور ٹیراسینا کے مقام پر ایک نئی فیکٹری کی

بنیاد رکھنے کے لیے ایک تعمیراتی کارکن نے جب کھودنے کے لیے اپنے بلڈوزر کا بلیڈ زمین پر مارا تو ٹائل لگی قبروں کی قطار سامنے آتی چلی گئی۔ ان قبروں پر نہ کوئی کتبہ تھا نہ کوئی علامت یا اور تحریر جس سے پتا چل سکتا کہ یہ کون دیو پیکر یہاں دفن تھے اور انہیں کب دفن کیا گیا تھا۔ ان میں سے ہر ڈھانچہ ساڑھے چھ سے سات فٹ تک لمبا تھا۔ ''رومی ممالک کے پستہ قامت لوگوں کے مقابلے میں یہ لمبائی بہت زیادہ تھی۔'' جون بیٹل نے بتایا جو خود ان ڈھانچوں کا مشاہدہ کر چکا تھا۔ سرکاری ماہر اثریات ڈاکٹر لیو.جی کیو اے لیوسی نے ان ڈھانچوں کا معائنہ کرنے کے بعد جو بیان دیا اس سے اس اسرار کی شدت میں اور گہرائی آ گئی۔ اس کا کہنا تھا: ''میں ان ہڈیوں کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جب اس کی موت واقع ہوئی تھی تو ان تمام افراد کی عمریں چالیس سال کے لگ بھگ تھیں۔ ان کے دانت دیکھ کر میں خاص طور پر متاثر ہوا ہوں کیونکہ وہ بہترین حالت میں تھے اور ان پر ذرا بھی زوال کی علامت نہیں تھی۔'' ایک محقق نے خیال ظاہر کیا۔ ''یہ تمام ڈھانچے روم کے شاہی دستے کے افراد کے تھے۔ اس دستے کے لیے پورے ملک میں سے خاص طور پر لمبے قد کے جوان منتخب کیے جاتے تھے۔'' جون بیٹل نے اس بات سے اتفاق نہیں کیا: وہ کہتا ہے کہ ''رومی سپاہیوں کو ان کی وردی 'زرہ بکتر اور اسلحہ کے ساتھ دفن کیا جاتا تھا۔ ان کا سارا فوجی ساز و سامان ان کے ساتھ قبر میں رکھ دیا جاتا تھا مگر ان ڈھانچوں میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی کوئی ایسی چیز نہیں ملی تھی۔ وہاں صرف ہڈیاں تھیں۔ ان کے سوا کچھ نہ تھا۔'' جون بیٹل کو جب ٹیرا سینا میں ان قبروں کی خبر ملی تھی تو وہ فوراً ہی وہاں دوڑ گیا تھا۔ ''یہ ڈھانچے رومیوں کے ہرگز نہیں تھے۔'' اس نے برملا کہا۔ ''میں نے چند ہڈیوں اور تابوت کے کچھ حصوں کا تجزیہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ان دیوزادوں کو ہزاروں سال پہلے دفن کیا گیا تھا۔ اغلب خیال یہ تھا کہ یہ عام عورتوں اور جناتی مردوں کے اتصال سے پیدا ہونے والی دوغلی نسل تھی۔ کھدائی میں ہمیں جتنے پرانے ڈھانچے ملتے جاتے ہیں اس سے یہ ثابت ہوتا جا رہا ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد اتنے ہی زیادہ دراز قامت اور طاقت ور تھے۔'' تعمیراتی کارندے' کان کن اور زمین میں دھاتوں کے متلاشی اور دیگر افراد جو زمین کی کھدائی سے کسی طور بھی منسلک ہیں جب زمین کا سینہ چیرتے ہیں تو عام طور پر جناتی ہڈیاں نکل آتی ہیں۔ ''وہ لوگ اپنے اپنے ہنر کے ذریعے روزی کما رہے ہیں۔'' جون بیٹل نے کہا: ''وہ ان ہڈیوں کو یا تو پھینک دیتے ہیں یا دوبارہ دفن کر دیتے ہیں۔ اگر وہ یہ ہڈیاں ماہرین کو دے دیں تو ان کا کام ٹھپ ہو جاتا ہے کیونکہ پھر وہاں سائنس دانوں کا ہجوم ہو جائے گا جو ان قبروں اور ہڈیوں کا تجزیہ کرنے میں مہینوں بلکہ برس لگا دیں گے۔'' ''ان ہڈیوں کا کیا ہوتا ہے جو سائنس دانوں کو بھیج دی جاتی ہیں''! ''سائنس داں ایسی چیزوں کی درجہ بندی نہیں کر سکتے۔'' جون بیٹل نے کہا: ''ایسا نہیں ہوتا کہ آپ کسی انسانی جبڑے کی بہت بڑی ہڈی لے جائیں اور اسے سائنسی کیٹیگری میں یا کسی خوب صورت سے شوکیس میں سجا دیں۔ یاد رکھیں جناتوں کو ناممکنات میں سمجھا جاتا ہے۔ ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ چنانچہ یہ ہڈیاں میوزیم کے کسی تاریک کونے میں یا تہہ خانے میں پھینک دی جاتی ہیں اور پھر انہیں بھلا دیا جاتا ہے۔'' ''جب کوئی سائنس

داں کہتا ہے کہ 'یہ چیز ممکن ہے تو وہ یقیناً درست کہتا ہے۔'' آرتھر سی کلارک اپنی کتاب ''پروفائلز آف دی فیوچر'' میں لکھتا ہے۔ ''اور جب کوئی سائنس داں کہتا ہے کہ یہ بات ناممکن ہے تو شاید وہ غلطی پر ہوتا ہے۔''

جون بیٹل نے اس فلک بوس جناتی دھانچے کا بھی معائنہ کیا تھا جو ایک تعمیراتی کمپنی کے کارکنوں کو ۱۹۶۰ء میں ہندوستان کی ریاست آسام کے جنوب مغرب میں واقع ''تورا'' کے مقام پر ملا تھا۔ یہ کارکن کالج کیمپس میں ایک نئی عمارت کی تعمیر کے سلسلے میں بنیادیں کھود رہے تھے۔ ان کی کدالیں پتھروں سے ٹکرائیں۔ ان کے فورمین نے بتایا کہ جب کدالیں پتھروں سے ٹکرائی تھیں اس وقت وہ چار فٹ گہری زمین کھود چکے تھے۔ مزدوروں نے جب وہ پتھر ہٹائے تو ان کے نیچے گیارہ فٹ لمبا انسانی ڈھانچا تھا۔ گیارہ فٹ لمبا انسانی ڈھانچہ کسی بھی سائنسی نظریہ پر پورا نہیں اترتا۔ فوراً ہی ہمیں یہ بیانات سننے کو ملے کہ وہ ڈھانچہ ایک دیو قامت بندر کا تھا۔ کسی ایک بھی پروفیسر نے ان ہڈیوں کا معائنہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ کوئی ایک بھی اسے دیکھنے تک ہندوستان نہیں گیا۔ ذرا تصور کریں۔ یہ لوگ شہادتوں کو دیکھے بغیر 'انہیں جانچے بغیر حقائق کے جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں۔!'' جون بیٹل نے اس ڈھانچے کا معائنہ کیا۔ ''ڈھانچے پر صرف ایک نگاہ ڈالتے ہی بندر والا نظریہ ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ جون بیٹل نے کہا۔ ''اس سے زیادہ متاثر کن بات یہ تھی کہ اس قبر میں کچھ کوئلے اور چقماق کے چند ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ ایک دھاتی کپ بھی تھا جو اس دیوزاد کے ساتھ دفن کیا گیا تھا۔ مجھے ذرا پرواہ نہیں ہے کہ کتنے پی ایچ ڈی اس کے بندر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ میں نے ایسی چیزیں کسی بندر کے ساتھ دفن کرتے کبھی نہیں دیکھیں۔''

کئی سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ان دیوزادوں کی روایات 'حقائق کو جانچنے میں غلطی کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہیں۔ وہ اس علاقے کو جہاں ۱۶۱۳ء میں فرانس میں سینٹ رومنس کے قریب ریتیلی زمین کھودنے پر جناتی ہڈیاں نکلی تھیں ''جناتی میدان'' کا نام دیتے ہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کے پروفیسروں نے ان

چہ پیدا کرنے کی دیوی: چہ پیدا کرنے کے سلسلے میں اس دیوی کے سامنے عبادت لازمی تصور کی جاتی تھی اس کا نام توریت (Taweret) تھا اور یہ علامتی طور پر حاملہ دریائی گھوڑے کی شکل سے مشابہ بنائی جاتی تھی یہ دہشت ناک اور خطرناک دکھائی دیتی تھی تاکہ چہ پیدا کرنے والی حاملہ عورتوں کو شیطان کے مضر اثرات سے بچایا جا سکے اس کی چھاتیوں سے جادوئی مائع ٹپکتا رہتا تھا۔

ہڈیوں کا معائنہ کر کے انہیں انسانی ہڈیاں قرار دیا تھا۔ مقامی کسانوں کا دعویٰ تھا کہ ان کے باپ داداؤں نے انہیں بتایا تھا یہ ٹیوٹن چیف ٹیوٹوبوکس کا ڈھانچا تھا جسے مارئس نے قتل کیا تھا۔ لوک داستانوں سے پتا چلتا ہے کہ اس دیوزاد سردار اور اس کے مردہ سپاہیوں کو اس ''جناتی

میدان" میں دفن کیا گیا تھا۔ بعد کی تحقیقات سے پتا چلا کہ یہ ٹیپرس خاندان کے افراد کے ڈھانچے تھے جو اٹھارہ فٹ لمبے ہوا کرتے تھے۔ شناخت میں ایسی اور دیگر ایمان دارانہ غلطیوں کے ساتھ ساتھ خوش فکریے دھوکے بازوں کا ایک ایسا ماہر گروہ بھی پیدا ہو گیا تھا جس نے جھوٹی شہادتیں پیش کر کر کے سائنس کو الجھا کر رکھ دیا تھا۔ یہ بدمعاش لوگ سائنس کی تنقیص اور اسے الجھانے کے لیے خاصا وقت 'بڑی بڑی رقمیں اور انتہائی کوششیں کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ چھوٹی موٹی فریب کاریاں تو چلتی رہتی تھیں مگر فراڈ کا ایک بے حد مشہور واقعہ ۱۹۰۸ء میں سسکس انگلینڈ میں اس وقت پیش آیا جب ایک شوقین ماہر اثریات چارلس ڈاسن کو "پلٹ ڈاؤن" کے قریب جناتی ہڈیوں کے ٹکڑے ملے۔ یہ ہڈیاں برطانیہ کے میوزیم آف نیچرل ہسٹری کو پیش کی گئیں تو اس دریافت سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ڈاسن نے ابتدائی ترین' آدمی کی قدیم ترین بلکہ پہلی شہادت یا ثبوت دریافت کیا تھا۔ "اس نے ڈارون کے 'نظریہ ارتقاء' کی گم شدہ کڑی دریافت کی ہے" لندن کے ایک اخبار نے لکھا۔ چارلس ڈاسن کی شہرت کو چار چاند لگ گئے اور ۱۹۱۶ تک 'جب تک وہ زندہ رہا' اسے بڑی عزت اور فضیلت سے نوازا جاتا رہا۔ تیس برس تک "پلٹ ڈاؤن آدمی" کی یہ ہڈیاں کسی خلل کے بغیر برطانوی عجائب گھر میں سجی رہیں۔ پروفیسروں اور ان کے شاگردوں کی ایک پوری نسل ان ہڈیوں کا تعلق نسلِ انسانی کے خاندانی درخت سے جوڑنے میں مصروف رہی۔ ۱۹۵۲ء میں میوزیم کے عملے کے چند شکی مزاج افراد نے فیصلہ کیا کہ ان ہڈیوں کا کاربن ۱۴ ریڈیائی ٹیسٹ کیا جائے۔ یہ ٹیسٹ ہڈیوں اور دوسری زمین سے نکالی ہوئی چیزوں کی عمر معلوم کرنے کا ایک معیاری طریقہ ہے۔ کاربن ۱۴ کے ٹیسٹ نے ایک دھماکہ کر دیا۔ تمام علمی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔

"شروع میں تو ہمیں اپنے ٹیسٹ کے نتائج پر ذرا یقین نہیں آیا۔" میوزیم کے عملے کے ایک رکن نے کہا۔ "ہم ڈٹے رہے۔ ان ہڈیوں کے کئی اور کیمیائی ٹیسٹ کیے مگر ہر بار نتیجہ ایک ہی نکلا۔" یہ ہڈیاں محض ایک عام سے معمولی سے بندر کی باقیات تھیں۔ اس بندر کی موت ۱۹۰۱ میں ڈاسن کی اس مشہورِ زمانہ دریافت سے صرف آٹھ سال پہلے ہوئی تھی۔ مزید معائنے سے پتا چلا کہ جبڑے کی ساخت بھی تبدیل کر دی گئی تھی۔ کسی ماہر دنداں ساز نے ریتی کے ذریعے بڑی محنت سے دانتوں کو رگڑ کر اسے نئی ساخت دے دی تھی۔ ان بدنام ہڈیوں کا معمہ عرصے تک گردش کرتا رہا۔ "کیا یہ مکاری اور دھوکا خود چارلس ڈاسن کے ذہن کی تخلیق تھا؟" میوزیم کے ایک اسٹاف ممبر نے پوچھا۔ یا کیا یہ ممکن ہے کہ وہ کسی نامعلوم دھوکے باز کی مکاری کا شکار بن گیا تھا؟ اس منصوبے کے پیچھے جو ذہن کار فرما تھا اسے اچھی طرح علم تھا کہ ان ہڈیوں کو کس طرح 'ابتدائی آدمی' کے نظریے کے عین مطابق بنایا جا سکتا تھا۔ اب اس فریب کار کی شناخت تو شاید ممکن نہ ہو سکے مگر اس کی ذہانت اور قابلیت میں ذرا شبہ نہیں ہے۔ پلٹ ڈاؤن ہڈیاں سائنس اور عام آدمیوں کو دھوکا دینے کی محض ایک مثال ہے۔ ان فریب کاروں نے اس بات کی تیاریاں شاید اس وقت سے ہی شروع کر دی تھیں "جب جناتی آدمی کا نظریہ گرما گرم موضوعِ سخن بنا ہوا تھا۔ یہ فطری بات ہے کہ سائنسداں اب اس

معاملے میں کچھ زیادہ ہی محتاط ہو گیا ہے۔"
مڈویسٹرن یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے بتایا
اب آپ اگر اپنے ساتھ ایک تیرہ فٹ لمبے آدمی کو
لے کر یونیورسٹی کی لیبارٹری میں بھی آجائیں
گے تو میرے ساتھی اس کی طرف دیکھنے سے بھی
انکار کردیں گے۔ جناتی آدمی ناممکنات میں سے

قربانی کے لیئے تیار: اس پینٹنگ میں ایک بچھڑے کو پھولوں کا ہار پہنائے دکھایا گیا ہے یہ رسم اس وقت ادا کی جاتی تھی جب بچھڑے کی قربانی مقصود ہوتی تھی بعد ازاں اس کا گوشت مندروں کے دیوتاؤں کی نذر چڑھایا جاتا تھا۔

ہے۔" منی سوٹا میں بھی دیوزادوں کے باقیات دریافت ہوئے ہیں۔ اس سے بھی بڑی بڑی ہڈیاں کیلی فورنیا کی مٹی کھود کر نکالی جا چکی ہیں۔ ایریزونا میں ایک زیرِ زمین جناتی مقبرہ دریافت ہوا ہے۔ "یہ دیوزاد یہاں ہیں، وہاں ہیں' ہر جگہ ہیں" جون بیٹل نے کہا۔ جیسی جے بینٹن نے اپنی کتاب 'کاؤبائی وی ٹریل" میں لکھا ہے کہ ایریزونا میں ونسلو کے جنوب میں پہاڑی پر بنے ایک انڈین کے ویران گھر کے ایک کمرے میں ایک بہت بڑی انسانی کھوپڑی ملی تھی۔ ایک عام سائز کا ہیٹ تو اس کھوپڑی کی چوٹی کو بھی نہیں ڈھانپ سکتا تھا۔ چوڑے کنارے والا کاؤبوائے ہیٹ اس کھوپڑی پر ایسا نظر آتا جیسے شوقین مزاج لوگ نیو ائیر پر چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے ہیٹ اپنے سروں پر رکھ لیتے ہیں۔ جنوب مغرب کے انڈینوں میں دیوزادوں سے متعلق بے شمار قبائلی داستانیں موجود ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ طاقت ور لوگ انڈینوں کی آمد سے قبل اس علاقے کے حکمراں تھے۔

تورات کی سچائی کی مزید تصدیق کری ٹنڈن' ایریزونا میں ۱۸۹۱ء میں اس وقت ہوئی جب مزدوروں نے وہاں نئے ہوٹل کی تعمیر کے لیے کھدائی شروع کی۔ سطح زمین سے آٹھ فٹ نیچے انہیں ایک بہت بڑا پتھر کا تابوت ملا اس تابوت میں گرینائٹ کا ایک ممی کیس تھا جس میں کسی زمانے میں کم از کم بارہ فٹ لمبے آدمی کا جسم تھا۔ مگر بدقسمتی سے جب ماہرین وہاں پہنچے تو پتا چلا کہ اس جسم کو وہاں دفن ہوئے اتنا طویل عرصہ گزر چکا تھا کہ جسم مٹی ہو چکا تھا۔ ایریزونا میں ہی ہیون کی گھاٹی کی دیواروں پر قبل از تاریخ کے زمانے کی ایک تصویر کندہ ہے جس میں ایک انتہائی دراز قامت آدمی کو ڈائنوسار کے حملے سے دفاع کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ۱۹۲۴ء میں ڈوھینی مہم جوؤں نے گرینڈ کین ین (Grand Canyon) میں ایک حیرت انگیز تصویر دیکھی جس میں ایک ہیبت ناک، ڈائنوسار ایک غافل کھڑے بے حد لمبے آدمی کی گردن میں اپنے دانت گاڑنے ہی والا تھا۔ مغرب کی طرف آجائیں تو نوادا میں ہمیں دیوزادوں کی موجودگی کی شہادتیں ملتی ہیں۔ لے لینڈ نے اپنی کتاب "گمشدہ کانیں اور مدفون خزانے" میں سونے کے متلاشی دو ایسے افراد کا احوال لکھا ہے جو دولت کی تلاش میں جنوب مغربی نوادا کے پہاڑوں اور صحراؤں کی خاک چھان رہے تھے۔ سنگلاخ پہاڑوں میں

اپنے ایک سفر کے دوران میں اتفاقاً وہ ایسے بڑے بڑے غاروں کے سلسلے میں پہنچ گئے جو سرنگوں کے ذریعے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ تجسس ان کے خوف اور احتیاط پر غالب آگیا۔ انہوں نے لکڑی کی مشعلیں بنائیں اور ایک غار میں اتر گئے۔ اندر ایک سرنگ میں سے ہوتے ہوئے وہ ایک بے حد وسیع و عریض کمرے میں جا نکلے۔ مشعلوں کی روشنی میں انہیں دیواروں پر کئی چیزیں سجی ہوئی نظر آئیں۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھتے رہے اور سوچتے رہے کہ یہ جگہ ضرور کسی جناتی نسل کے انسانوں کا مسکن رہی تھی۔ پریشان اور خوفزدہ دونوں مہم جو مشعلیں تھامے ایک اور ایسے کمرے میں نکل آئے جو اپنی سجاوٹ بناوٹ سے کھانے کا کمرہ لگ رہا تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک بہت بڑی اور بھاری میز رکھی ہوئی تھی۔ میز پر سونے کی تھالیوں اور طشتریوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جن پر صدیوں کی گرد جمی تھی۔ لے لینڈ نے یہ نہیں بتایا کہ ان دونوں متلاشیوں نے سونے کے ان برتنوں کا کیا کیا مگر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے انہیں پگھلا کر سونا حاصل کر لیا ہوگا۔ بے شمار اہم نوادرات لالچی لوگوں کے ہاتھوں یونہی ضائع ہوتے رہے ہیں۔ نوادا میں دیوزادوں کے بارے میں ایک اور رپورٹ ''امریکن جرنل آف سائنس'' میں چھپی تھی۔ نوادا میں کارسن سٹی کے قریب سینڈ اسٹون کے ایک بلاک میں قدموں کے نشانات گڑے ہوئے ملے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ہر قدم کی لمبائی بیس انچ تھی۔ نوادا کا اصلاحی قید خانہ اب ان نشانات کو گھیرے کھڑا ہے۔ نوادا میں پائے جانے والے پیروں کے یہ نقوش بالکل ویسے ہی ہیں جیسے پچھلی صدی میں برٹین کے قریب ٹینیسی دریا کے منبع پر ملے تھے۔ یہ قابلِ ذکر نشانات گرینائٹ کی ٹھوس چٹان پر نقش تھے اور بہت سارے نشانات بھی ملے ہیں ان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز نقش وہ ہے جس میں ایڑی کی چوڑائی تیرہ انچ ہے۔ ۱۸۳۳ء کی بات ہے کیلی فورنیا میں فوجیوں کے ایک دستے کو لامپوک رانچیرو پر پاؤڈر میگزین کے لیے بنیاد کھودنے کا حکم دیا گیا۔ ابھی ان فوجیوں نے بڑبڑاتے ہوئے کھدائی شروع ہی کی تھی کہ پورے کا پورا دستہ جوش میں بھرا اپنے کمانڈنگ آفیسر کے ہیڈ کوارٹر میں پہنچ گیا حواس باختہ فوجیوں نے بتایا کہ وہاں ایک جن تھا۔ ''اٹین شن!'' کپتان چلایا۔ ''احمق عورتوں کی سی حرکتیں بند کرو اور بتاؤ کیا بات ہے۔ جارج تم بتاؤ۔'' سولجر کی آواز جوش کے مارے لرز رہی تھی۔ ''آپ کے حکم کے مطابق، کیپٹن ہم نے وہاں کھودنا شروع کر دیا تھا۔ ہمارے پھاوڑے عجیب طرح کی بجری اور پتھروں سے ٹکرائے۔ ہم لوہے کی ایک سلاخ لائے اور اس بجری اور پتھر کی سل کو توڑ دیا۔ اس کے نیچے ایک انسانی ڈھانچا تھا۔''

''تو اس میں اتنا پریشان ہونے یا گھبرانے کی کیا بات ہے'' کیپٹن نے کہا۔ ''ماضی میں کسی انڈین کو دفن کیا گیا ہوگا۔'' سارے فوجی بہ یک وقت نفی میں سر ہلانے لگے۔ ''وہ انڈین ہرگز نہیں ہے۔'' جارج نے کہا۔ ''کیپٹن ہم نے خود کو یقین دلانے کے لیے اس ڈھانچے کی دو مرتبہ پیمائش کی تھی۔ وہ کسی بھی طرح بارہ فٹ سے کم نہیں ہے۔'' ''اس کے منہ میں دانتوں کی دوہری قطار ہے''۔ دوسرے فوجی نے کہا ''اوپر نیچے دونوں جگہ''۔ ایک تیسرا فوجی بولا۔ کیپٹن الجھا ہوا سا، ان کے ساتھ کھدائی

کے مقام تک آیا۔ کیپٹن نے قدیم قبر میں جھانک کر دیکھا اور بے یقینی سے سر ہلانے لگا۔ حیرت کے مارے اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ پتھر کی اس قبر میں لیٹا ہوا وہ ڈھانچا یقیناً بارہ فٹ لمبا تھا۔ اس کے قریب ہی چند منقش سیپیاں پتھر کا ایک بھاری کلہاڑا اور دو بڑے بڑے بھالے پڑے ہوئے تھے۔ ایک فوجی نے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور کیپٹن کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "واؤ! میں تو اس آدمی کے مقابلے میں ایک منٹ بھی کھڑا ہونا پسند نہیں کروں گا۔"

مزید تلاش کے بعد اس قبر میں سے سنگ ساق کی کئی شیٹیں اور ایک ارغوانی رنگ کا پتھر ملا۔ سنگ ساق کی شیٹوں پر ناقابل فہم سے نقش کھدے ہوئے تھے۔ قریبی مشن میں سے ایک پادری کو بلا کر وہ شیٹیں دکھائی گئیں اور پڑھنے کو کہا گیا۔ ذرا دیر بعد اس نے معذوری کا اظہار کر دیا۔ "جناتوں کا ذکر بائبل میں بھی موجود ہے۔" پادری ہراساں فوجیوں کے سامنے وعظ کرنے کھڑا ہو گیا۔ "خدا کے کام بھی عجیب ہیں۔ اس نے اپنے مقدس الفاظ کی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے اس قبر کا انتخاب کیا ہے۔" مشن کے قریب ہی انڈینوں کی ایک بستی تھی۔ وہاں سے ایک بوڑھے طبیب کو بلایا گیا۔ اسے شیٹیں دکھائی گئیں تو وہ اپنی ہی ہانکنے لگا۔ "آج رات ہم ایک تقریب منائیں گے اور معلوم کریں گے کہ 'عظیم روح' نے کیا پیغام دیا ہے۔" بوڑھا انڈین بولا۔ رات ہوئے اس جناتی قبر کے گرد انڈین جمع ہونے لگے۔ تاریکی میں قبیلے کے مقدس ڈھول بجنے لگے۔ چاند کی زرد روشنی میں جناتی ہڈیاں چمکنے لگیں تو شامان منتر پڑھنے لگا اور اپنے معتقدین کے درمیان مقدس گھاس تقسیم کرنے لگا۔ قبیلے کے نوجوان جنگ جوؤں نے لکڑیوں کا ڈھیر لگا کر آگ دہکا دی۔ ننگ دھڑنگ جسموں پر نقش و نگار بنائے رقاصوں کی ایک ٹولی قبر کے گرد ناچنے لگی۔ رقص جنوں خیز ہوتا گیا۔ انڈین اپنے ماضی کے کارناموں اور شان دار روایات کی نغمہ سرائی کر رہے تھے اور دعائیں مانگ رہے تھے کہ عظیم روح ان سفید چمڑی والوں کو اس سر زمین سے نکال بھگانے میں ان کی مدد کرے۔ مشرقی پہاڑیوں کی عقب سے سرخ گولے کی مانند سورج نکلا تو سارے انڈین خوفناک چیخیں مارنے لگے۔ درجنوں انڈین تھک کر زمین پر گر پڑے

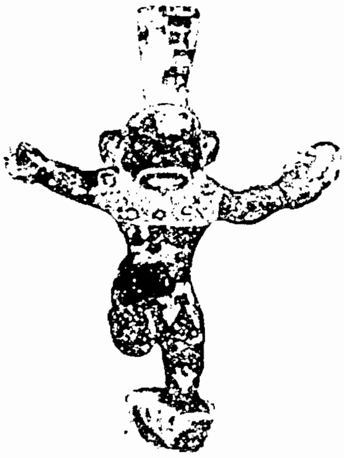

خاندان کا دیوتا: یہ مصری معاشرے میں ہر جگہ مقبول تھا جس کا نام بیس تھا مجسمے میں آپ اسے کنول کے پھول کے اوپر رقص کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں اس نے ایک ہاتھ میں طنبورہ اٹھا رکھا ہے اسے لکڑی سے بنا کر اس کے اوپر پینٹ کیا گیا ہے یہ بیس (Bes) دیوتا آدھا بونا اور آدھا شیر ہے اس کی ہیئت بڑی عجیب ہے اس کی زبان باہر نکلی ہوئی ہے اور اکثر یہ ہاتھ میں تلوار لیے خطرے کا سامنا کرتا ہے یہ نومولود بچوں اور خاندان کے افراد کی فلاح وبہبود اور نگہداشت ودیکھ بھال کا دیوتا تھا۔

دوسرے انڈین قبر کے گرد چکر لگاتے ہوئے ناقابلِ فہم زبان میں منتر پڑھنے لگے۔ شامان فاخرانہ انداز میں مشن کی طرف چلا اور پادری سے بات کرنے کا مطالبہ کیا۔ "عظیم روح کا جواب مل گیا ہے۔" شامان بولا۔ "اس دیوزاد کا ڈھانچا میرے قبیلے کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ "اِلی گیوی" ہے۔ عظیم جثے والوں میں سے ایک جنہیں ہمارے لوگوں نے شکست دی تھی۔ ہم ان ہڈیوں کی پوجا کریں گے اور اپنی توانائیاں واپس حاصل کریں گے۔"

مگر پادری اور کیپٹن کو اپنے علاقے میں توانا انڈینوں کی ضرورت نہیں تھی۔ "پادری وہ ساری ہڈیاں، نوادرات اور دوسری تمام چیزیں جو قبر میں ملی تھیں اپنے ساتھ لے گیا اور انہیں ایک خفیہ مقام پر دفن کروا دیا۔" فوج کے ایک دوسرے افسر نے لکھا۔ "تمام چیزوں کو ایک نامعلوم قبر میں دفنا دیا گیا تھا۔ انڈین بے حد مشتعل ہو رہے تھے۔ انہوں نے قسمیں کھائیں کہ وہ اس وقت تک جنگ کرتے رہیں گے جب تک سفید چمڑی والوں کی بستی اور مشن کو ملیامیٹ نہ کر دیں۔ آخر انہیں ضرورت سے زیادہ راشن دے کر راضی کر لیا گیا۔"

جب انڈین شامان نے اِلی گیوی کا ذکر کیا تھا تو وہ انڈین قبائل میں پھیلی ہوئی ان داستانوں کا حوالہ دے رہا تھا جن میں بتایا گیا تھا کہ کسی زمانے میں امریکا میں یہی دیوزاد قوم آباد تھی۔ انڈین قبائل کی لوک کہانیوں کے مطابق ڈیلاویر انڈین کسی زمانے میں امریکا کے مغرب میں آوارہ گردی کرتے ہوئے مشرق میں مس سی پی تک پہنچ گئے تھے۔ اس عظیم دریا کے کنارے پر ان کی ملاقات آئرقوئس قبیلے سے ہوئی اور دونوں قبیلے شیر و شکر ہو گئے۔ اپنے قبیلے کے لوگوں کے لیے نئی شاداب سرزمینوں کی تلاش میں دونوں قبیلوں کے سرداروں نے مشرق میں اپنے اسکاؤٹس روانہ کیے. دونوں سردار اپنے اپنے قبیلوں کے ساتھ کسی جگہ مستقل قیام کرنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے۔ انہوں نے کسی زیادہ مہربان اور میزبان سرزمین کی تلاش میں اپنی آبائی زمینیں بھی چھوڑ دی تھیں۔ مس سی پی کے کنارے قیام کے دوران دونوں قبیلے وہاں کے حالات کی وجہ سے پریشان تھے۔ رات کو موٹے موٹے مچھر ان کی چمڑی ادھیڑ کر رکھ دیتے۔ دن میں ان کی عورتیں اور بچے مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کرتے تو مکار پانی انہیں اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا۔ رات رات بھر موت کے ڈھول بجتے رہتے ہر وقت مرنے والوں کے لواحقین کی آہ و بکا فضا میں گونجتی رہتی۔ شکاری بڑبڑاتے رہتے کہ دریا کے کنارے شکار کم سے کم ہوتا جا رہا تھا۔ بھوک اور بیماری سے تنگ قبیلے کے لوگ سرگوشیاں کرنے لگے کہ پرانے سرداروں کو ہٹا کر نئے سردار کا انتخاب کیا جائے جو ان کی پریشانیوں کا خاتمہ کر سکے۔ اسکاؤٹ واپس آ گئے مگر کوئی امید افزا خبر نہیں لائے۔ انہوں نے بتایا کہ مشرق میں عظیم دریا کے کنارے اِلی گیوی (یا ٹیلی گیوی) نامی دیوزادوں کا قبیلہ آباد ہے جنہوں نے بڑی مضبوط بستی تعمیر کر رکھی ہے۔ یقیناً اِلی گھینی دریا اور پہاڑوں کے نام اسی گم شدہ نسل کے نام پر رکھے گئے تھے۔ "میموئرس آف دی ہسٹوریکل سوسائٹی آف پین سلوانیا" کی بارہویں جلد میں درج ہے کہ آئرقوئس اور ڈیلاویر قبیلوں نے اِلی گیوی کے علاقے میں سے گزر کر مشرقی امریکا کی طرف

گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا دیوتا: اس طرح کا دیوتا "ین میو تیف" کہلاتا تھا جس کا مطلب "اپنی ماں کا ستون" ہوتا ہے۔ وہ لافانی پنے ہورس کی علامت کے طور پر جانا جاتا تھا وہ چیتے کی کھال پہنے رہتا تھا اور اس کی دم بھی ہوتی تھی اس کے ایک طرف بالوں کا گچھا نوجوانی کی نشاندہی کرتا تھا وہ دوزانو ہوتا تھا اور اس کے ہاتھ میں تختی ہوتی تھی جس پر لوگ نذر نیاز رکھ دیا کرتے تھے۔

ہجرت کر جانے کی اجازت مانگی تھی۔ ان دیوزادوں نے انہیں اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا۔

"ہم اس منحوس دریا کے کنارے ہمیشہ نہیں رہ سکتے۔" دونوں سرداروں نے اعلان کیا۔ "ہم ان دیوزادوں کے خلاف جنگ کریں گے۔" کئی برسوں تک دونوں قوموں میں شدید جنگ جاری رہی۔ ڈیلاویر اور آئروقوئس قبیلوں کے جنگ جوؤں نے بھاگتے ہوئے دیوزادوں کا مغرب میں اس علاقے تک تعاقب کیا جو آج کل مِنی سوٹا کہلاتا ہے۔ سائی اوکس انڈین قوم کی سینہ بہ سینہ داستانوں میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ جنگ بڑی خوف ناک تھی اس قوم کے خلاف جو "جسمانی لحاظ سے بڑی لمبی تڑنگی مگر بے حد بزدل تھی۔"

"اوہائیو ہسٹوریکل اینڈ آرکیالوجیکل سوسائٹی" کے والیوم ٹو میں درج ہے کہ سائی اوکس نے بیشتر دیوزادوں کا صفایا کر دیا تھا۔ جو باقی بچے وہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر مغرب کی طرف بھاگ گئے اس کے بعد وہ تاریخ کے صفحات سے بھی گم ہو گئے۔ ان داستانوں کی تائید میں کافی شہادتیں موجود ہیں۔ مِنی سوٹا اور اوہائیو کے وسیع میدانوں میں ابھرے ہوئے ٹیلوں کے بے شمار باقیات موجود ہیں۔ ان ٹیلوں کی ساخت میں ایسی یکسانیت ہے جن سے پتا چلتا ہے کہ انہیں تعمیر کرنے والوں کا تعلق ایک ہی قوم یا قبیلے سے تھا۔ کیا ان پراسرار "ٹیلوں کے معمار" واقعی دیوزاد الی گیوی تھے؟ سائی اوکس انڈینوں کے ہاتھوں دیوزادوں کے قتل عام کے بعد ان کے ڈھانچے اس ریاست میں جابجا بکھرے ہونے چاہئیں تھے اور ہے بھی بالکل ایسا ہی۔ مِنی سوٹا حقیقتاً دیوزاد انسانی ڈھانچوں کا بہت بڑا خزینہ ہے۔ "مِنی سوٹا جیالوجیکل سروے" والیوم ون اور "ایبروجنس آف مِنی سوٹا" کے مطابق لاکری سینٹ کے علاقے میں کھدائی کرنے پر تانبے کے بہت بڑے بڑے فرائی پین یا کڑچھیاں ملی ہیں جن کے ساتھ "دیوزاد انسانوں کے ڈھانچے" نکلے۔ ۲۹/جون ۱۸۸۸ء کو سینٹ پال پائنیر پریس" میں ایک نیوز اسٹوری شائع ہوئی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ ان ڈھانچوں کی لمبائی سات سے آٹھ فٹ تک تھی، کھوپڑیوں کی پیشانیاں آگے کو جھکی ہوئی تھی اور موجودہ انسانوں کے برخلاف ان ڈھانچوں میں شروع سے آخر تک دانتوں

کی دوہری قطاریں تھیں۔

اگست ۱۸۹۶ء کے ''سینٹ پال گلوب'' میں ایک طویل قامت ڈھانچے کی کہانی شائع ہوئی تھی جو لیک کوروُلِنس کے قریب ایک کھیت کی کھدائی کے وقت دریافت ہوا تھا۔ موس آئی لینڈ لیک کے قریب سات فٹ لمبا انسانی ڈھانچا ملا اور پائن سٹی میں ایک ہی قبر میں سات طویل قامت ڈھانچے نکلے۔ ۱۸۸۲ء میں وارن' مِنی سوٹا کے قریب صرف ایک ٹیلے میں دس جناتی ڈھانچے ملے تھے۔ آٹھ فٹ سے بھی زیادہ لمبے انسانی ڈھانچے اس وقت نکلے جب ڈریس باش' مِنی سوٹا کے دو بھائیوں نے اپنی اینٹوں کی فیکٹری کو وسعت دینے کا فیصلہ کیا۔ اپنے پلانٹ میں اضافہ کرنے کے لیے انہیں قرب وجوار میں ایستادہ کئی انڈین ٹیلے ہٹانے پڑے۔ ایک ہی ٹیلے کی کھدائی سے انہیں کئی دیوزادوں کی ہڈیاں ملیں مگر شاید انہیں یہاں ہزاروں برس پہلے دفن کیا گیا تھا کیونکہ باہر کی ہوا لگتے ہی ساری ہڈیاں ریت ہو گئی تھیں۔ ثبوت کے طور پر ہمارے پاس ان دونوں بھائیوں اور اس علاقے کے لوگوں کے بیانات ہی رہ گئے ہیں۔ بعض ٹیلوں کی کھدائی سے حیرت انگیز چیزوں کا ذخیرہ نکلا جس میں اڑتیس پونڈ وزنی تانبے کی کلہاڑی' برتن' کڑچھیاں اور دوسری اشیاء شامل ہیں۔ ان ہڈیوں اور نوادرات میں سائنس دانوں نے کچھ زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ دی فورٹین سوسائٹی' نے مِنی سوٹا یونیورسٹی میں اینتھراپولوجی ڈپارٹمنٹ کے پروفیسر ول فورڈ کو خط لکھ کر ان رپورٹوں کے بارے میں اس کی رائے پوچھی۔ سوسائٹی نے یہ بھی دریافت کیا کہ کیا پروفیسر نے اپنے مختلف علمی دوروں کے دوران میں جناتی ہڈیاں بھی دریافت کی ہیں۔ پروفیسر نے جواب میں لکھا کہ جناتی ہڈیوں کے بارے میں رپورٹیں اغلاط سے پُر ہیں اور مغالطے پر مبنی ہیں اور یہ کہ اسے کبھی اپنے فیلڈ ٹرپس کے دوران میں جناتی ہڈیاں نہیں ملیں صرف عام انسانوں کی ہڈیاں ملی ہیں۔ ''مجھے یقین ہے کہ پچھلے ایک سو سالوں کے دوران میں ہزاروں جناتی ہڈیاں دریافت ہوئی ہیں۔'' دیوزادوں کے برطانوی متعاقب جون بیٹل نے لکھا۔ ''کیونکہ سائنس داں ان مجموعوں میں دلچسپی نہیں لیتا اس لیے لوگ انہیں اپنے گھروں کے اسٹور رومز یا تہہ خانوں میں سجا لیتے ہیں لیکن اب چونکہ ہمارے گھر بھی چھوٹے ہو گئے ہیں۔ بڑے بڑے وکٹورین طرز کے گھروں کو گرا کر ان کی جگہ چھوٹے چھوٹے کاٹیج بنا لیے گئے ہیں چنانچہ ان نوادرات کے لیے اب گھروں میں بھی جگہ نہیں رہی ہے۔ میں نے سنا کہ جنوبی امریکا میں ۲۱-۱۹۲۰ء میں کسی مقامی کو ایک ڈھانچا ملا تھا۔ میں ڈھونڈتا ڈھانڈتا وہاں پہنچا۔ پتا چلا کہ ۱۹۴۹ء میں ان صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔ پھر ان ہڈیوں کا کیا ہوا؟ ''اس کی بیٹی نے باہر پھینک دیں۔ ذرا تصوّر کریں۔ ان ہڈیوں کا اختتام ایک کچرا گھر میں ہوا تھا۔'' جون بیٹل کو یقین ہے کہ دنیا میں جتنی بھی یک سنگی عمارات ہیں ان کی تعمیر میں انہی دیوزادوں کا ہاتھ ہے۔ ''میں جانتا ہوں کہ جائنٹ ہنٹنگ ایک بالکل منفرد کام ہے۔'' اس نے تسلیم کیا۔ ''بے شمار لوگ تھے جو میرے اس کام کی وجہ سے اور یقین کی وجہ سے مجھ پر ہنستے تھے۔ مگر یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے۔ دیوزادوں کے لمبے تڑنگے جسموں کی مناسبت سے ان میں طاقت بھی اتنی ہی زیادہ تھی۔ دیومالائی کہانیوں میں ان کی

حیرت انگیز طاقت کے بے شمار قصے موجود ہیں۔"

جون بیٹل اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ اب ایسا بھی نہیں کہ چند خوش فکرے دیوزادوں کی ایک ٹولی نکلی اور کھیل ہی کھیل میں اہرام کھڑے کر دیئے۔ "یہ دیوزاد اس دنیا میں نسل انسانی کی اصل بنیاد بھی ہو سکتے ہیں۔" بیٹل نے کہا۔ "ان کے نزدیک اہرام کی شکل میں کوئی علامتی اہمیت ہو گی۔ اہرام کی قوت کی دریافت کے سلسلے میں کی جانے والی تحقیق ہمیں توانائی کی ایک نئی شکل سے بھی روشناس کرا سکتی ہے۔ رہی ان جنوں اور دیوزادوں کی بات تو یہ اس وقت تک ایک معمہ ہی رہے گی جب تک ہم انسان کی ابتداء یا اصلیت سے واقف نہ ہو جائیں۔" بیٹل یہ بھی تسلیم کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ اس کے نظریات منفرد سے ہیں۔ عام ڈگر سے ہٹے ہوئے۔ ان میں سے درج ذیل باتیں زیادہ توجہ طلب ہیں۔ یہ دیوزاد خدا کے بیٹوں کی اولادیں تھیں۔ "بائبل میں بے شمار مضبوط سچائیاں درج ہیں" بیٹل کہتا ہے۔ "ہو سکتا ہے ماضیٔ بعید میں خلاء نوردوں کی ایک پوری فوج زمین پر آئی ہو یا اس نے زمین پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا ہو۔ یہ غیر ارضی لوگ بے حد طویل القامت یا جنات بھی ہو سکتے تھے۔ یہ لوگ ہمارے نظام شمسی کے کسی اور سیارے سے آئے ہوں گے یا خلائے بسیط کے کسی اور کونے سے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور ہی جہت کے اسیر ہوں۔ تورات میں درج ہے کہ انہوں نے زمینی عورتوں سے رابطہ استوار کیا اور نتیجے میں جنات پیدا ہوئے۔ ان خلاء نوردوں کو مشن کی تکمیل کے بعد ممکن ہے واپس گھر بلا لیا گیا ہو یا ممکن ہے مرورِ زمانہ نے انہیں فنا کر دیا ہو۔ "ان کی اولادیں بڑھتی گئیں۔ ان دوغلی نسلوں میں کئی جینیاتی نقص پیدا ہو گئے ہوں گے اسی وجہ سے یہ لوگ بڑے مکروہ اور جھگڑالو تھے جیسا کہ داستانوں میں بیان کیا گیا ہے۔ پھر کبھی ایسا بھی وقت آیا ہو کہ وہ آپس میں لڑ پڑے ہوں یا پھر انہیں ہوموسیپئین نے تباہ کر دیا ہو۔ انہوں نے اہرام کیوں بنائے تھے؟ شاید محققین ہی درست کہتے ہیں۔" بیٹل نے جواب دیا۔ "کہ عظیم اہرام میں ریاضی کے اصول درج ہیں۔ برسوں کی بحث و تکرار کے بعد سمجھ لیا گیا ہو گا کہ ان لوگوں کی باتیں درست ثابت ہو جائیں۔"

دیوزاد دنیا پر پہلی نسل تھی۔ "علمائے اسرار (Occuists) نے محنت شاقہ کے بعد یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ زمین پر پہلی نسلِ انسانی کا مجموعی نام 'آدم' تھا۔" بیٹل نے بتایا۔ "صدیوں پرانے

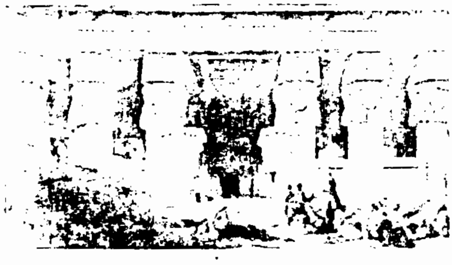

ڈینڈیرا کی عبادت گاہ: یہ مصری دیوی ہتھور کی عبادت گاہ ہے۔ یہ اس وقت بھی قائم تھی جب مصر پر یونانی اور رومی برسرِ اقتدار تھے اور رومیوں نے بالخصوص اس کی تزئین و آرائش پر خصوصی توجہ دی تھی جیسی آپ دیکھ رہے ہیں کہ مندر کے چھوٹے ستون پر ملکہ قلوپطرہ کا مجسمہ بنایا گیا ہے اور بقیہ پانچ ستونوں پر دیوی ہتھور کے سر نظر آ رہے ہیں۔

ریکارڈ موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ سرخ یا تانبے جیسی رنگت والے لوگ باغِ عدن کے سنہر دور میں رہتے تھے۔ اس جنت میں بھی یا تو انسانوں کی آپس کی جنگوں نے خرابی پیدا کر دی یا انسانوں دیوتاؤں سے جنگ اس خرابی کا باعث بنی۔ میرا اپنا خیال ہے کہ کسی قدرتی آفت نے ہی ان کا ہ کیا تھا۔ میں نے کئی نظریات کے بارے میں سنا ہے' جن میں کہا گیا ہے کہ چاند زمین سے ٹکرا گیا؛ یہ ساری تباہی کسی شہاب ثاقب کے قریب سے گزرنے کی وجہ سے آئی تھی۔ ایک اور ممکنہ سیلابِ عظیم ہو سکتا ہے۔ یہ دیوزاد بائبل میں مذکورہ سیلاب میں یا پانی کے طوفان میں ڈوب گ تھے۔ بس چند ایک ہی نے کسی کونے کھدرے میں چھپ کر اپنی جان بچائی ہو گی اور وہی ہمارے ا دور کے ذمہ دار ہوں گے۔" غیر معمولی باتوں کے دیگر محققین کی طرح جون بیٹل کا بھی یہی خیا ہے کہ یہ لوک داستانیں اور دیومالائی کہانیاں انسانی نسل کی یادوں کا زبانی بیان ہیں۔ "چینیوں ک ہاں بھی روٹ ریس "Root Race" کے بارے میں ایک کہانی مشہور ہے۔" بیٹل نے کہا۔ "ان بیان ہے کہ یہ دیوزاد چوتھی روٹ ریس سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایٹلانٹس کے زما میں یہی دیوزاد دنیا کے حکمران تھے۔ شاید ان کے بارے میں اتنے کم ثبوت ہونے کی یہ بھی ایک و ہو کہ وہ سمندر کی گہرائیوں میں دفن ہو چکے ہوں۔"

دیوزاد کائناتی شعاعوں (Cosmic Rays) کی تخلیق ہیں۔ ڈبلیو آر ڈریک نے اس امکان کا ذکر اپنی کتاب "گاڈس آر اسپیس مین" -Amherst Press, Wiscon- 1964 son) میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے: "زمین شاید سورج سے زیادہ قریب تھی۔ بڑی صحت بخش فض تھی۔ ہر طرف سبزہ و شادابی تھی' صحیح معنوں میں جنت۔ سیکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں کروڑوں سال پہلے اس وقت کا چاند جو ہمارے موجودہ چاند کا پیش رو تھا' زمین کے اور قریب آ گیا۔ اس کی طاقت و کشش ثقل اور زیادہ طاقت ور کونی شعاعیں (CR) نہ صرف قبل از تاریخ کے دیو پیکر جانوروں ک تخلیق کا باعث بنیں بلکہ انسانوں کو بھی متاثر کیا۔ "آدم" اس سرخ چہرے والی پہلی نسلِ انسانی مجموعی نام ہے جن کے بارے میں یقین ہے کہ وہ لوگ بڑے طویل قامت تھے اور سنہرے دور میں رہتے تھے یہاں تک کہ دیوتاؤں سے ان کی جنگ چھڑ گئی۔ اس کے علاوہ انہیں دوسری آفات کا بھی سامنا کرنا پڑا جیسا کہ اس چاند کا زمین سے ٹکرا جانا اور پھر انسانیت جہالت کی تاریکی میں ڈوب گئی۔ دیو پیکر عمارتیں' یک سنگی تعمیرات جو امریکا' یورپ' پولی نیشیا اور اینڈس میں تائی ہونکو تک پھیلی ہوئی ہیں ان لوگوں کی ذہانت اور قابلیت کا اور پراسرار ماضی کا کھلا مظہر ہیں۔ چاند سے ٹکراؤ کے نتیجے میں انسان کا قد گھٹتا چلا گیا مگر بعض دیوزاد نسلوں کو معدوم ہونے میں صدیاں لگ گئیں۔

اگر ہم دیوزادوں کے وجود کو ناممکن قرار دے دیں تو شاید ہم اہراموں کے راز کو کبھی نہ ج سکیں گے۔

☆

قدماء کے گمشدہ راز

کیاان اہراموں کو کسی دوسرے سیارے کی مخلوق نے تعمیر کیا ہے؟ کیاقدیم خلاء نورد قبل از
ریخ کے کسی دور میں مصر آئے تھے اور انہوں نے وہاں کے لوگوں کو ترقی یافتہ علوم(Advanced
Sciences سکھائے تھے؟ اس نظریے کے محرکین غیر ارضی مخلوق کی آمد کے ثبوت کے طور پر
وں کو' تصاویر کو اور زبانی داستانوں کو جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہیں' پیش کرتے ہیں۔ اگر
محققین درست ہیں تو ہمیں توقع رکھنی چاہئے کہ ان آسمانی لوگوں' کی زمین پر آمد کی رپورٹیں بھی
یافت ہو ہی جائیں گی۔ حیرت ہے کہ زمین پر غیر ارضی مخلوق کی آمد کی داستانوں نے سائنس دانوں
بھی قدیم دیومالائی کہانیاں کھنگالنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ اس تلاش میں ہیں کہ پتھروں کے نیچے
ئی ایسا دفینہ ہاتھ لگ جائے جہاں ان لوگوں کی باقیات موجود ہوں اور ان کی مدد سے وہ کسی حتمی نتیجے پر
نچ جائیں۔ مثال کے طور پر روسی ایگزوبایالوجسٹ (ایگزوبایالوجی۔ حیاتیات کی وہ شاخ ہے جس میں
مین کے باہر ذی حیات نامیوں پر ماحول کے اثرات کا مطالعہ کیا جاتا ہے) ہزاروں لوک کہانیاں جمع
نے میں مصروف ہیں۔ ان کی توجہ زیادہ تر ان داستانوں کی طرف ہے جن میں آسمان سے آنے والے
گوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب یہ معلومات کمپیوٹر انالیسس کے ذریعے ترتیب دی جا رہی ہیں۔ روسیوں
کو امید ہے کہ ان معلومات کے ذریعے وہ کوئی ایک ایسی داستان' کوئی طریقہ
یا کوئی اب تک نظر انداز کیا گیا پیغام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں
گے۔ "کسی غیر ارضی یا کسی خلائی چیز کی ہمارے سیارے پر موجودگی ایک
بہت بڑی تاریخی دریافت ہوگی۔" ایک روسی اخبار نے لکھا "اگر ایسی کوئی
چیز ہوئی تو وہ ہزاروں بلکہ لاکھوں سال پرانی ہوگی۔ شاید ان کے دفینے میں
کوئی خود کار آلہ مل جائے جس کی مدد سے اس دوسرے سیارے کی ذہین
مخلوق سے رابطہ کی کوئی صورت نکل سکے۔ سائنس دان جانتے ہیں کہ

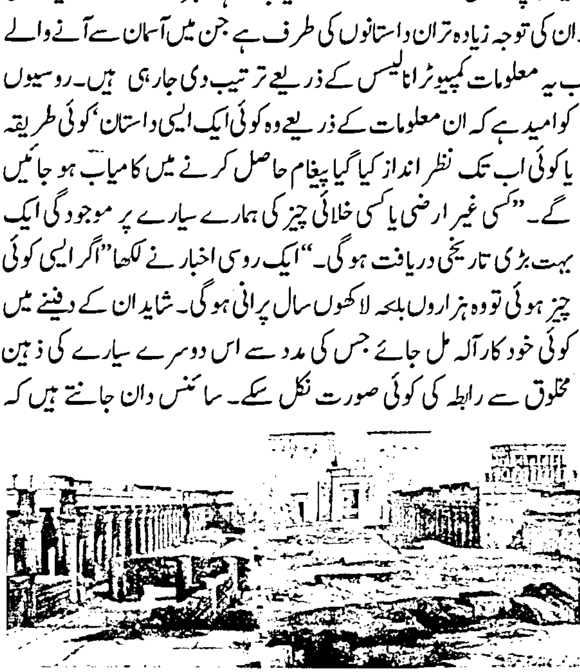

مندروں کی آخری باقیات: یہ پینٹنگ ڈیوڈ رابرٹس کی بنائی ہوئی ہے جس نے انیسویں صدی میں مصر کا تفصیلی دورہ کیا تھا جہاں پر اس نے فلائی جزیرے پر اسس کا مندر دیکھا تھا اس کی آنکھیں ورطۂ حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں یہ آخری مصری مندر تھا جس پر عیسائیوں نے قبضہ کیا رومی سپہ سالار جسٹینین نے چھٹی صدی عیسوی میں اسے بند کر کے گرجاگھر کی شکل دے دی۔

قدیم داستانوں میں حقائق کا روپ دھارنے کی خاصیت ہوتی ہے۔ ہمارے سائنس دانوں کو توقع ہے کہ وہ دوسرا شلی مان بن سکتے ہیں۔"

روسی یہاں ہنرچ شلی مان کا حوالہ دے رہے ہیں جو محض شوقین اور غیر پیشہ ور آدمی ہونے کے باجود دنیا کا اہم ترین ماہر اثریات مانا جاتا ہے۔ ۱۸۶۰ء کے ابتدائی دنوں میں ہنرچ شلی مان نے جرمنی میں پھیلا ہوا اپنا وسیع کاروبار فروخت کر دیا اور یونان آگیا جہاں اس نے ایک بے حد خوبصورت عورت سے شادی کر لی۔ پھر اس نے افسانوی شہر ٹرائے کی جستجو شروع کر دی جس کا ذکر ہومر نے اپنی مشہور زرمیہ داستان 'الیڈ' (Iliad) میں کیا تھا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا آخر ٹرائے کو کیوں ڈھونڈا نہیں جا سکتا۔" شلی مان نے کہا۔ "ہومر دنیا کا پہلا جنگی نامہ نگار تھا۔ اس نے 'الیڈ' میں اس شہر کی بڑی درست نشان دہی کی ہے۔" شلی مان نے اس علاقے کی تلاش میں جس کی ہومر نے نشاندہی کی تھی پورے یونان کو کھنگال ڈالا۔ لوگوں کی آراء سے بے نیاز چند ایک جھوٹی رہبری سے بے پروا آخر شلی مان نے وہ شہر ڈھونڈ ہی لیا جو کسی زمانے میں محض دیومالا کا حصہ تصور کیا جاتا تھا۔ ٹرائے کے بعد شلی مان ان گم شدہ شہروں کی تلاش میں سرگرم ہو گیا جن کا تذکرہ پرانے مصنفین کی کتابوں میں موجود تھا۔ اثریات کے طلباء کو ایک لیکچر دینے کے دوران میں شلی مان نے کہا: "قدم مصنفین کی کتابوں کو اس طرح پڑھو جیسے وہ اخباری رپورٹر تھے۔ ان قدماء کو جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی داستانیں اکثر حقیقت پر مبنی ہوتی تھیں۔" برنسلے لی پوئر ٹرنچ جو سریت پر مبنی بے شمار کتابوں کا بیسٹ سیلنگ رائٹر تھا شلی مان سے اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہے: "دیومالا دراصل مختصر نویسی ہے۔ اس طرح تاریخ کو مختصر کر دیا گیا۔" ابتدائی دور کے مصریوں کے ہاں بھی ایک ایسی داستان ملتی ہے جس میں 'آسمانی لوگوں' کا زمین پر آنا بیان کیا گیا ہے۔ "مصری دیوتا اور ہیروز" نامی کتاب (مطبوعہ ہارپ اینڈ کمپنی 'لندن ۱۹۱۴ء) کی داستانوں میں ایف ایچ بروک بینک نے مصری دیوتاؤں اور یسس اور آئی سس کی ایک داستان بیان کی ہے۔ "موسم گرما کے ابتدائی دنوں کی ایک شام' جب سورج مغربی پہاڑوں پر جھکا جا رہا تھا ایک شخص تھیبس کے ایک مندر کے قریب ایک سکامور (Sycamore) درخت کے نیچے آکر ٹھہر گیا۔ وہ شخص خاصا جسیم تھا اور فانی انسانوں سے کسی قدر مختلف نظر آرہا تھا۔ اس کے قریب ایک عورت کھڑی تھی۔ اس سے زیادہ حسین اور باوقار عورت پر سورج پہلے کبھی نہیں چمکا تھا۔ "ہمیں یہاں ٹھہر کر آرام کرنا چاہیئے۔" مرد نے کہا اور اپنی چادر پتھر کی ایک سل پر بچھا دی۔ دونوں اس چادر پر بیٹھ گئے۔ مرد نے اپنے چوغے میں سے ایک بانسری نکالی اور بجانے لگا۔ بانسری کی مدھر تان ختم ہوئی تو ایک نحیف و نزار بوڑھا آہستہ آہستہ چلتا ہوا دونوں اجنبیوں کی طرف آیا۔ "خوبصورت شام سلامت ہو تم دونوں کو۔" بوڑھے نے رواج کے مطابق سلام پیش کیا۔ وہ مرد اور عورت کی طرف بڑی حیرت اور کسی قدر خوف سے دیکھ رہا تھا۔ "اور تجھے بھی۔ بوڑھے بابا۔" مرد نے جواب دیا۔ "کیا اس شہر میں ہمیں عارضی رہائش کے لیے کوئی ٹھکانہ مل جائے گا؟ ہم مسافر ہیں اور کچھ دیر قیام کر کے اپنی تھکن اتارنا چاہتے ہیں۔" بوڑھا چند لمحوں تک کھڑا ان کی صورتیں تکتا رہا پھر زمین پر جھک کر پہلے

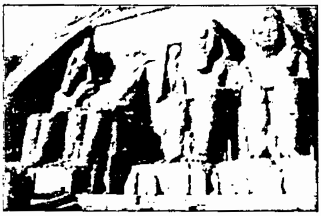

دیوہیکل مجسمہ: نوبیا کے مقام پر دریائے نیل کے قریب واقع ابو سمبل نامی مندر میں واقع مجسمے جنہیں فرعون رعمسس دوئم نے بنوایا۔ اس نے دو مندر بنوانے کے احکام صادر کیے جو مکمل طور پر کھڑی چٹانوں پر بنائے گئے جن میں اس نے اپنا مجسمہ بنوانے کے علاوہ مصری دیوتاؤں آمن، رِی ہارا کھتی اور پاہ کے مجسمے بنوائے رعمسس کا بڑا مجسمہ مندر میں داخلے کے ساتھ ہی بنایا گیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ وہی فرعون ہے جو حضرت موسیٰ کے دور میں ہو گزرا ہے۔

مرد کے پھر عورت کے سینڈلوں کو بوسہ دیا۔ پھر سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ”میں اس مندر کا پادری ہوں۔ میں نے ستاروں کے مطالعہ سے آسمانوں کے اسرار کا تھوڑا بہت علم حاصل کیا ہے اور بہت عرصہ پہلے سے مجھے آپ کی آمد کی خبر ہو گئی تھی مگر میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ زمین پر آپ لوگوں کو خوش آمدید کہنے کا اعزاز مجھے حاصل ہو گا۔“ اس نے پھر بڑے احترام سے اس جوڑے کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”آپ قبول فرمائیں تو میرا غریب خانہ اور میری تمام تر خدمات آپ دونوں کے لیے حاضر ہیں۔“

”تم اپنی خدمات اور عبادات میں بے حد پر خلوص رہے ہو اس لیے تم وہ پہلے آدمی ہو جسے یہ فضیلت حاصل ہوئی ہے۔“ مرد نے کہا ”ہم تیرا شکریہ ادا کرتے ہیں اور تیری دعوت قبول کرتے ہیں لیکن میں تجھے خبردار کرتا ہوں کہ جو تو جانتا ہے وہ کسی اور کو نہ بتانا اور نہ ہی ہماری آمد کے سلسلے میں کہ ہم کب آئے اور کیوں آئے ہیں کسی سے کچھ کہنا۔ جب دیوتا چاہیں گے لوگوں کو خود معلوم ہو جائے گا۔ اب تو ہمیں اپنے گھر لے چل۔ رات ہوتی جا رہی ہے۔“ اس طرح اوریس اور آئی سس سرزمین مصر میں وارد ہوئے۔ جب قدیم مصر کے باشندوں کو اس حیرت انگیز جوڑے کی آمد کی خبر ہوئی تو وہ جان گئے کہ یہ دونوں دوسری دنیا سے آئے تھے۔ بروک بینک کہتا ہے: ”جبلی طور پر وہ لوگ محسوس کرتے تھے کہ یہ جوڑا زمین کا باسی نہیں تھا۔ ان سادہ دل لوگوں نے ان کی عزت واحترام میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بیشمار لوگ پادری کے گھر آتے اور ان دونوں کے متعلق باتیں پوچھتے مگر پادری نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔ ان کی آمد کے اسرار نے لوگوں کے دلوں میں خوف واحترام کو فزوں تر کر دیا۔ اوریس اور آئی سس لوگوں میں گھل مل گئے۔ وہ لوگوں کو نصیحتیں کرتے، ان کی مدد کرتے اور انہیں خوش رکھتے۔ جب کبھی کسی آدمی کو مدد کی ضرورت ہوتی یا کسی مشکل کا سامنا ہوتا، دونوں اس کے پاس موجود ہوتے“ داستان میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب مصر کے بادشاہ کا انتقال ہو گیا تو لوگوں نے مطالبہ کیا کہ اوریس کو پہلا فرعون بنایا جائے۔ اوریس نے ہچکچاہٹ کے بعد بادشاہی کا اعزاز قبول کر لیا اور پھر الوہی ذہانت سے مصر پر حکومت کرنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے مصریوں کے بعض قدیم ترین رسم ورواج کو بالکل ختم کر دیا۔ قانون کا ایک مربوط نظام قائم کیا اور حکمرانی کے ایسے اصول وقوانین وضع کیے جو ہزاروں برسوں تک جاری رہے۔ علمیت کی حدود سے باہر آکر ہی ہم اہرامیات سے متعلق دیومالائی اور لوک کہانیوں کا صحیح طور پر جائزہ لے سکتے ہیں۔ عرب ممالک میں جو داستانیں سینہ بہ سینہ چلی آ رہی

ہیں وہ بڑی دلچسپ اور سحر انگیز ہیں مگر ظاہر ہے ان کی صداقت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ان داستانوں میں کس طرح جادو اور منتر کے ذریعے اہرام تعمیر کیئے گئے تھے۔ بعض داستانوں میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اہراموں کو ایڈوانسڈ آوازوں اور موسیقی کی مدد سے تعمیر کیا گیا تھا۔ پروفیسر فرانکوئس لینوراں اپنی کتاب "Chaldean Magic And Sorcery" میں راہبوں کی خفیہ طاقت کے بارے میں قدیم داستانوں میں مذکور قصے دہراتے ہوئے کہتا ہے: "یقیناً قدیم زمانوں میں یہ راہب' جادو کی چھڑی سے طوفان اٹھا سکتے تھے ایسے بھاری پتھروں کو جنہیں ہزار آدمی مل کر بھی نہ اٹھا سکیں ہوا میں اڑاتے ہوئے اپنے مندروں تک لے جاتے تھے" ایک ماہر اہرامیات ولیم کنگس لینڈ نے اپنی کتاب "گریٹ پیرامڈ ان فیکٹ اینڈ فکشن" (مطبوعہ رائڈر اینڈ کمپنی ۱۹۳۲ء) میں ان قدیم مصری یادگاروں کی تعمیر کے سلسلے میں اپنے اندازوں اور تصور کو کچھ زیادہ ہی ڈھیل دے دی ہے۔ وہ کہتا ہے: "جب بادشاہ نے اہرام بنائے تو دور دراز کی پتھر کی کانوں سے بڑے بڑے پتھر لائے گئے۔ یہ پتھر کاغذ کے ایسے پرزوں پر جن پر کوئی منتر لکھا ہوتا تھا رکھ دیئے جاتے تھے۔ پھر ان پتھروں کو ایک چھڑی ماری جاتی اور یہ ہوا میں اڑتے ہوئے اس جگہ پہنچ جاتے جہاں اہرام تعمیر کئے جا رہے تھے۔" قدیم بابلی ریکارڈ میں بھی پتا چلتا ہے کہ پتھروں کو اٹھانے کے لیے آواز استعمال کی جاتی تھی۔ بائبل میں بھی اس ضمن میں ایک غیر معمولی پیراگراف ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جیریکو کی دیواروں کو توڑنے کے لیے آواز استعمال کی گئی تھی۔ قدیم قبطی مسودات بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ اہراموں کی تعمیر میں استعمال ہونے والے پتھروں کو ان منتروں کے ذریعے وہاں تک لایا گیا جو پادری اور مزدور پڑھ رہے تھے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ مصری راہب کسی ایسے پوشیدہ علم سے واقف ہوں جو کشش ثقل ختم کر دیتا ہو؟ اور کیا یہ علم بتدریج وقت کی پہنائیوں میں کھو گیا ہے؟ موجودہ زمانے میں سب سے زیادہ معلوم توانائی ایٹم میں مرکوز ہے۔ مقابلتاً الیکٹرومیگنیٹک توانائی اس سے سینکڑوں گنا کمزور ہے۔ کشش ثقل لاکھوں گنا کم طاقت ور ہے۔ یعنی یہ الیکٹریسٹی' میگنے ٹزم یا نیوکلیئر انرجی سے بہت کم طاقت ور ہے۔ تاہم اب بھی جب کہ ہم نے برقی توانائی کو قابو میں کر لیا ہے' ایٹم کو توڑنے میں کامیاب ہو گئے ہیں' یہ کشش ثقل ہمیں دھوکا دے جاتی ہے اور کسی طور قابو میں آ کر نہیں دے رہی ہے۔ طبیعیات میں جدید ترین دریافتوں نے تو کشش ثقل کے مسئلے کو اور پیچیدہ بنا دیا ہے۔

قدیم داستانیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ اہرام کی تعمیر میں علامات اور جادو کی چھڑیوں کو کس طرح استعمال کیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جادو کی چھڑیاں' اپنے مختلف استعمال اور ضرورت کے حساب سے مختلف لمبائی کی ہوا کرتی تھیں۔ ان چھڑیوں کو آواز کے مخصوص ارتعاش اور آواز کی لہروں کی مخصوص طوالت پیدا کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ والٹر اوون نے اپنی کتاب "More Things In Heaven" مطبوعہ ۱۹۴۷ء میں آواز کے امکانی استعمال کو بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے: آواز ایک ایسی قوت ہے جس کے امکانات کو ایک بے دین سمجھ ہی نہیں سکتا اور اس کا استعمال' جس سے قدیم زمانے کے صوفی اور راہب اچھی طرح واقف تھے' ایک ایسا گم شدہ علم ہے جو ابتداء ہی سے

جدید سائنس کے مذاق کا نشانہ بنتا رہا ہے۔ یہ آواز ہی کی طاقت ہے جس پر پوری کائنات کا ڈھانچا استوار ہے اور یہ آواز ہی ہو گی جو اس ڈھانچے کے تار و پود بکھیر کر رکھ دے گی۔ (صور اسرافیل)۔ مصر کے راہب اس حقیقت سے واقف تھے۔ کنگس چیمبر کے ذیلی کمرے کی ایک دیوار کے حاشیے میں گرینائٹ پتھر کا ایک بھاری پتا سا جڑا ہوا ہے جو اب اس کی تعمیر ہی کا ایک حصہ دکھائی دیتا ہے مگر اس بھاری پتے کو کچھ الفاظ کی آواز کے ذریعے ہی متحرک کیا گیا تھا یعنی اسے نیچے اوپر اٹھایا گرایا گیا تھا۔ اور جس وقت یہ عمل کیا جا رہا تھا تو ایک پیرو ٹھیک اس پتھر کے نیچے کھڑا ہوا تھا اور پیشوا بر ابر منتر پڑھ رہا تھا۔ اگر پیشوا کا منتر کچا ہوتا اور پتھر کی وہ بھاری سل نیچے آجاتی تو اس پیرو کا قیمہ بن گیا ہوتا۔ عارف (Theoso-phist) اے پی سینیٹ (sinnett) جو ایک انتہائی قابل مصنف اور پر اسرار علوم کا ماہر ہونے کے علاوہ اس بات کے لیے بھی مشہور تھا کہ اس نے ہوا میں پرواز کے تجربات کیے تھے اس نے ایک خفیہ مسلک کے بارے میں اپنی کتاب The Pyramids And Stonehenge (مطبوعہ تھیوسوفیکل پباشنگ سوسائٹی ۱۹۲۴ء) میں لکھا ہے: ''عظیم اہرام کی تعمیر میں ایسے بھاری بھر کم پتھروں کا اس قدر سلیقے اور ہنر مندی سے استعمال کرنا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ لوگ فطرت کے کسی ایسے علم پر دسترس رکھتے تھے جو آج انسان کی نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ ایسے علوم کے ماہر افراد ہی جن کا تعلق فطرت کے اسرار سے تھا اس اہلیت کے حامل ہو سکتے تھے کہ بھاری اجسام کو بھی اپنی مرضی کے مطابق حرکت دے سکتے تھے۔ کالاں سنگی تعمیرات جو محیرّ العقول اور عجوبۂ خلائق ہیں ان کی وضاحت بس اسی راز میں پوشیدہ ہے۔

اہرام کی تعمیر میں استعمال ہونے والے پتھروں کو لانے اور جمانے کا طریقۂ کار بھی وہی تھا جو اسٹون ہینج (Stonehenge) کا تھا۔ پوشیدہ فطری علوم کے ماہرین ان پتھروں کو اپنی مرضی کے مطابق ہوا میں تیراتے ہوئے اپنی مطلوبہ جگہ پہنچانے کے طریقے سے پوری طرح واقف تھے۔'' اب ۴ جولائی ۱۸۷۱ء کے دور میں آجاتے ہیں جب جون کیلئے مغربی امریکہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں کھڑا آسمان میں ہونے والی آتش بازی کو دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت کیلئے نے اعلان کر دیا تھا کہ پچھلی صدی کا آخری عشرہ انسانی تاریخ کا عظیم ترین دور ہو گا۔ وہ س وقت تصور میں اس سائنسی ارتقاء کو دیکھ رہا تھا جو آنے والے برسوں میں ہونے والا تھا۔ امریکہ صنعتی دور میں داخل ہو رہا تھا اور توانائی کی بے حد ضرورت تھی۔ کوئی ایسا طریقہ ہونا چاہئے تھا

دانشور: یہ پادری آپ کو پریشان اور گمبھیر احساسات کا حامل دکھائی دیتا ہے در حقیقت اس کے ماتھے کی شکنیں، پھولی ہوئی آنکھیں اور اس کے منہ کے گرد لکیریں زندگی کے سنجیدہ معاملات کی نشاندہی کر رہے ہیں یہ آپ کو گنجا اس لیئے نظر آرہا ہے کہ قدیم مصر میں زیادہ تر پادری اپنے بال کٹواتے تھے اس کے پیٹ پر کندہ تصویر ہورس کے بیٹے کی ہے۔

جس سے وسیع قدرتی وسائل کو قابو میں کر کے انسانی فلاح اور ترقی کے لیے استعمال کیا جاسکے۔ چھٹی کی تقریبات ختم ہوئیں تو کیلے ایسی قوتوں کو زیر کرنے میں مصروف ہو گیا۔ چھ ماہ بعد ہی کیلے نے سائنسی اور تجارتی دنیا کو یہ اعلان کر کے حیرت زدہ کر دیا کہ وہ توانائی کی ایک نئی قسم دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس نے کہا: ”میں نے بیرونی ایتھر فورس کو منتشر کرنے کا ایک طریقہ دریافت کر لیا ہے جو ایٹمی مادے کے جزو کو کنٹرول کرتا ہے۔ میں نے ایک نئی قسم کی موٹر ایجاد کی ہے جو بغیر ایندھن کے چلتی ہے۔ یہ موٹر کلی طور پر ہم آہنگ ارتعاش سے توانائی حاصل کرتی ہے۔“ جب رپورٹروں نے کیلے کی اس معجزنما موٹر کے بارے میں اس کے بیانات شائع کیے تو سائنس دانوں میں ہلچل مچ گئی۔ کیلے کے اعلان سے متعلق ایک اخباری نمائندے نے شکاگو یونیورسٹی کے ایک ممتاز پروفیسر سے تبصرہ کرنے کو کہا تو پروفیسر صاحب نے فرمایا: ”دنیا میں ایسے پاگل انتہا پسندوں کی کمی نہیں ہے جو وقتاً فوقتاً توانائی کے نئے ذرائع دریافت کرنے کا دعویٰ کرتے رہے ہیں۔ قدیم چینی دنیا کے سامنے ایک چیز لائے تھے جسے وہ وائٹل انرجی کا نام دیتے تھے۔ ہندوؤں کے مسودات میں ”پرانا قوت“ کا تذکرہ ملتا ہے۔ بحر اوقیانوس کے باسی بھی اس معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ وہ ابتدائی دور کے کپتانوں کو ”مانا توانائی“ کے قصے سنایا کرتے تھے۔“

پروفیسر نے مزید کہا کہ ابتدائی دور کے کیمیادان بھی ایک ایسی ہی قوت کی تلاش میں سرگرداں رہے تھے۔ لائبریریوں میں گردآلود کتابوں کو کھنگالو۔ اس نے اخباری نمائندے سے بڑی ترش روئی سے کہا: ”تم دیکھو گے کہ پیراسلسس نے بھی ”میونس (Munis) انرجی“ نامی توانائی دریافت کرنے کا دعویٰ کیا تھا۔ میسمر (Mesmer) جو مبینہ طور پر ہپناٹزم کا باوا کہلاتا ہے حیوانی مقناطیسیت کو بھی توانائی کی ایک قسم کہتا تھا۔ یہ سب احمقانہ باتیں ہیں۔ قدرت کے قوانین بڑے واضح اور قطعی ہیں۔ ایک ٹھوس قانون یہ ہے کہ بغیر محنت کیے آپ کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ مائی فطرت مفت کھانا کسی کو نہیں دیتی۔“ ”پھر کیلے کی موٹر میں توانائی کا ذریعہ کیا ہے۔“ رپورٹر نے پوچھا ”گرم ہوا!“ پروفیسر نے ترشی سے کہا۔ ”اور مبالغہ آمیز تصور۔“ شدید تنقید اور مخالفت کے باوجود جون کیلے نے اپنی موٹر کا ایک نمونہ بنایا اور امکانی سرمایہ کاروں کے سامنے اپنی اس ایجاد کا مظاہرہ کیا۔ سرمایہ کاروں کے اس گروہ نے بڑی حیرت سے دیکھا کہ کیلے کی موٹر نے بھاری فولادی شہتیروں کو بڑی آسانی سے موڑ دیا تھا۔ موٹر کے ایک جانب ایک چھوٹا سا بٹن لگا ہوا تھا جسے دبا کر موٹر کو اسٹارٹ کیا گیا تھا۔ ایک بار چالو ہو جانے کے بعد موٹر چند ثانیوں تک گھڑ گھڑاتی رہی پھر جب پوری قوت سے چلی تو اس میں سے جناتی ہارمونیم بجنے کی سی آواز آرہی تھی۔ اس مظاہرے کے بعد کیلے کو تیئیس سرمایہ کاروں کی مالی معاونت حاصل ہو گئی۔ جب یہ سرمایہ کار اس نئی ایجاد کی بہتر قسم کی ساخت کے لیے چیک لکھ رہے تھے تو وہ اس ایجاد سے کروڑوں ڈالر پیدا کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے، جو بغیر ایندھن کے چلتی تھی۔ جب کیلے نے وہ چیک کیش کرائے تو اسے پتا چلا کہ موجدوں کے حلقے میں داخل ہونے کے بعد اس کی زندگی کس قدر بدل گئی تھی۔ وہ ۱۸۲۷ء میں فلاڈلفیا میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا آغاز ایک کنسرٹ میں وائلن نواز کی

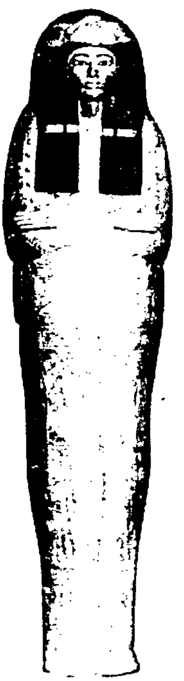

طلائی کفن: یہ ایک مصری راہبہ کا طلائی کفن ہے جو دیوتا آمن کی خدمت کرتی تھی اور مندر میں عبادت کے دوران اس کی شان میں گیت اور مناجات کہتی تھی۔ اس کو تین کفنوں میں ملفوف کیا گیا تھا جس میں سے یہ کفن لکڑی سے بنایا گیا ہے جس پر سونے کی تصویریں بنائی گئی ہیں اس کے چہرے پر موجود سکون لافانیت کی عکاسی کرتا ہے۔

حیثیت سے کیا تھا۔ پھر وہ کارپینٹر بنا ایک سفری پیٹنٹ میڈیسن شو میں جادو کے کرتب دکھائے۔ جب آباد کاروں کے لیے مغربی سرحدیں کھلیں تو وہ فوراً ہی روکی ماؤنٹین میں آگیا اور فروالے جانوروں کا شکاری بن گیا۔ اس کی یہ سرحدی زندگی کا دور اس وقت ختم ہو گیا جب شکاری حقوق پر انڈینوں کے ایک قبیلے سے جھگڑے میں اس کی کمر میں ایک تیر لگا اور وہ زخمی ہو گیا۔ اس کے بعد کیلے نے وہ زندگی ترک کر کے دوبارہ فلاڈلفیا آکر کسی اور کام میں قسمت آزمائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ دسمبر ۱۸۸۳ء میں کیلے کے سرمایہ کاروں کا صبر جواب دے گیا اور وہ اس پراسرار موٹر کے بارے میں مزید معلومات کا مطالبہ کرنے لگے۔ "ہم نے دولت خرچ کی ہے۔" سرمایہ کاروں کے ایک ترجمان نے کہا: "مگر ہمیں اس کے بدلے میں کچھ نہیں ملا۔ ہمیں موٹر کو تجارتی پیمانے پر بنانے کے لیے اس کی ڈرائنگ اور پلان کی ضرورت ہے۔"

"ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔" کیلے نے جواب میں کہا۔ "اب یہ مسلسل احتیاط اور راز کا خاتمہ ہونا چاہیئے۔" سرمایہ کار نے کہا: "اگر تمہاری موت واقع ہو گئی تو ساری رقم ڈوب جائے گی۔" "میں اس ایجاد کا راز ہر ایک پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔" کیلے نے کہا: "لوگ پھر اس کے بارے میں کھل کر باتیں کرنے لگیں گے۔ اگر یہ راز غلط ہاتھوں میں پڑ گیا تو ہماری اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔ صرف ایک سائنس داں کا تقرر کر دو جو میری ورک شاپ میں آسکے۔ میں اپنا پلان اس کے سامنے ظاہر کر دوں گا۔ میں موٹر کی ہم آہنگ توانائی کا راز بھی اسے بتا دوں گا۔ اگر وہ مطمئن ہو گیا تو پھر وہی اپنی مثبت رپورٹ سے تم لوگوں کی تشفی کر سکے گا۔"

کیلے کے سرمایہ کاروں نے ایک معزز سائنس داں ایڈورڈ بکیل کو موٹر چیک کرنے کے لیے مقرر کر دیا۔ موجد کے ساتھ کئی روز تک کام کرنے کے بعد بکیل نے رپورٹ دی۔ "میں قائل ہو گیا ہوں کہ جون کیلے نے فطرت کی قوت کا راز جان لیا ہے۔" اس نے کہا۔ "دراصل میں اس کی وضاحتوں کو پوری طرح سے سمجھ نہیں پایا ہوں اور نہ ہی میں خود کو اس اہلیت کا حامل پاتا ہوں کہ اس کے نتائج پر بحث کر سکوں۔" اگلے پانچ برسوں کے دوران کیلے کے ناراض سرمایہ کار بار بار اسے چھیڑتے رہے اور اصرار کرتے رہے۔ وہ اکثر فلاڈلفیا تک کا سفر کر کے اس کی لیب میں آتے اور مطالبہ کرتے کہ انہیں وعدے نہیں کام چاہیئے۔ کبھی کبھی یہ سرمایہ کار اس قدر مشتعل ہو جاتے کہ اس پر چیختے چلاتے اور خوب ڈانٹتے۔ "مجھے کچھ وقت اور دو اور ہم اپنے تصور سے بھی کہیں زیادہ مال دار ہو جائیں

گے"۔ کیلے ہر بار انہیں یقین دہانی کراتا۔ ان ہنگامہ خیز برسوں کے دوران میں جب سرمایہ کار آ آ کر کیلے پر غراتے تھے' دھمکیاں دیتے تھے اور غصہ کرتے تھے' کیلے نے بڑی شرافت اور تحمل کا مظاہرہ کیا۔ کام میں کسی قسم کی پیش قدمی نہ پا کر آخر کار یہ سرمایہ کار دندناتے ہوئے اس کی لیباریٹری سے چلے گئے اور کیلے سے تعلقات منقطع کر لیے مگر فوراً ہی اسٹاک ہولڈرز کا ایک اور گروپ اس کے مالی تعاون کے لیے سامنے آ گیا۔ مگر یہ دوسرا گروہ بھی کیلے کے مسلسل لیت و لعل سے تنگ آ گیا۔ انہوں نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا اور اس موجد کے خلاف فیصلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ عدالت نے کیلے کو حکم دیا کہ وہ اپنی توانائی کے پراسرار ذرائع کو ظاہر کرے۔ کیلے نے انکار کر دیا۔ اسے گرفتار کر لیا گیا اور توہین عدالت کے جرم میں جیل بھیج دیا گیا۔ وہ سلاخوں کے پیچھے ہی پڑا رہتا مگر ایک مالدار بیوہ کو اس پر رحم آ گیا۔ وہ اس کی آزادی کے لیے آگے بڑھی' جرمانہ ادا کیا اور اگلے عشرے کے لیے اس کے تجربات میں مالی مدد بھی کی۔ ۱۸۹۸ء میں کیلے اپنی موٹر کی توانائی کا راز ظاہر کئے بغیر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گیا۔ ابھی کیلے کی قبر کی مٹی سوکھی بھی نہیں تھی کہ اسٹاک ہولڈرز کا ایک گروہ اس کی لیباریٹری میں گھس گیا اور اس راز کی تلاش میں لیباریٹری کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ آخر اس مشتعل گروہ نے عمارت کے تہہ خانے میں اس موٹر شاپ کے ٹھیک نیچے ایک بہت بڑا فولادی ٹینک دریافت کر لیا۔ "ہمیں دھوکا دیا گیا ہے۔" وہ لوگ چلائے۔ یہ کمپریسڈ ہوا کا ٹینک ہے جس سے کیلے نے موٹر تک نلکیاں لگا رکھی تھیں۔ وہ اس موٹر کو کمپریسڈ ایئر سے چلاتا تھا۔"

اسٹاک ہولڈرز کے ایک اور گروہ نے دعویٰ کیا کہ اپنی موت سے برسوں پہلے کیلے نے انہیں کمپریسڈ ایئر کا یہ ٹینک دکھا دیا تھا۔ "جب موٹر پوری رفتار سے چلتی تو ٹینک کی ہوا اسے ٹھنڈا کرتی تھی۔" ایڈورڈ ڈبکل نے کہا: "ٹینک میں ہوا کا اتنا دباؤ نہیں تھا جو موٹر کو چلا سکتا۔" آخر ان آزردہ خاطر اور مشتعل اسٹاک ہولڈرز کو احساس ہو گیا کہ کیلے کی موٹر کا اور اس کی ہم آہنگ توانائی کا راز موجد کے ساتھ ہی زمین میں دفن ہو چکا تھا۔ آج تک جون کیلے' اس کی ایجاد اور اس کی کارکردگی کے گرد ایک متنازعہ اسرار چھایا ہوا ہے۔ کچھ لوگ اب بھی یہ دعویٰ کرتے نہیں چوکتے کہ جون کیلے نے ہم آہنگ یا مرتعش آواز کی توانائی کی دریافت میں ایک عظیم پیش رفت کی تھی۔ جب کہ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ محض ایک فریب کار تھا جس نے اپنی زبان دانی اور پھر چرب زبانی سے لالچی سرمایہ کاروں کو اپنے چکر میں لے لیا تھا۔ میڈم ایچ پی بلاوتسکی نے اپنی کتاب "دی سیکریٹ ڈوکٹرائن" "The Secret Doctrine" میں جون کیلے کی ہم آہنگ توانائی کے بارے میں بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ہم کہتے ہیں اور مانتے بھی ہیں کہ آواز میں ساحرانہ قوت پوشیدہ ہے۔ اتنی قوت کہ دس لاکھ نیاگراؤں سے پیدا ہونے والی بجلی اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہو سکتی۔ ایسی آواز بھی پیدا کی جا سکتی ہے جو شی اوپس کے اہرام کو فضا میں بلند کر دے' مرتے ہوئے آدمی میں بلکہ لبِ دم آدمی میں دوبارہ جان ڈال دے اور اس میں جوانوں کی سی طاقت اور توانائی پیدا کر دے۔ کیونکہ آواز ایسے اجزاء کو متحرک کر سکتی ہے یا اپنی طرف کھینچ سکتی ہے جو ایک ایسا اوزون پیدا کر سکتی ہے جو الکیمی کی حدوں میں ہوتے ہوئے بھی کیمیائی

ساخت سے بعید ہوتی ہے۔ آواز میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ کسی انسان یا جانور کے جسم کو اگر وہ ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیا گیا ہو اور اس کی مقناطیسی یا غشائیہ تانت منقطع نہ ہو تو اسے دوبارہ زندہ کر سکتی ہے۔ خود مصنفہ بھی تین مرتبہ اس تجربے سے گزر چکی ہے اس لیے وہ ذاتی طور پر اس بارے میں سب کچھ جانتی ہے اور اگر یہ بات غیر سائنسی لگتی ہے تو پھر سائنس ہی اس کی میکانکی یا طبیعی وضاحت کرے کہ حال ہی میں ایجاد کی گئی یہ کیلے کی موٹر کیا بلا تھی۔ آخر وہ کیا قوت تھی جو نادیدہ تھی مگر پچیس ہارس پاور کے انجن کو پوری قوت سے متحرک کر دیتی تھی اور بھاری مشینوں کو اٹھانے اور فولادی سلاخوں کو موڑ دینے کی طاقت رکھتی تھی اور یہ سب ایک سارنگی یا وائلن کے مضراب کا کمال تھا جسے بار بار ثابت کیا گیا تھا۔ جون کیلے نے جو ایتھر توانائی دریافت کی تھی وہ کوئی واہمہ نہیں تھا بلکہ امریکا اور یورپ والے بھی اس سے خوب واقف تھے۔ کیلے کی عملی ناکامی کے باوجود اس کی یہ دریافت پچھلے چند برسوں میں بڑی حیرت انگیز بلکہ معجزانہ حد تک فوق الفطرت بلکہ فوق البشر تھی۔ اگر کیلے کو کامیاب ہو جانے کا موقع دیا جاتا تو وہ خلاء میں موجود ایٹموں کی ایک پوری فوج اتنی ہی آسانی سے مختصر کر دیتا جتنا کہ اس نے ایک مردہ بیل کو مختصر کر کے اپنی ایجاد کا مظاہرہ کیا تھا۔ چنانچہ توانائی کی اس نئی قسم پر پوری توجہ دینے کی ضرورت ہے جسے اس کے موجد نے انٹرایتھرک فورس کا نام دیا تھا۔ مسٹر کیلے کے قریبی دوستوں کی طرح ماہرینِ علوم اسرار کی بھی یہی رائے ہے کہ کیلے کائنات کے پوشیدہ ترین راز کی دہلیز تک پہنچ چکا تھا۔ وہ راز جو طبیعی قوتوں کے اسرار کی بنیاد ہے۔ فلسفۂ اسرار (Occult Philosophy) میں کائنات کے ظاہر اور باطن نظام کو ایک اکائی کی صورت میں قدماء کی طرح' سونے کے انڈے سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے دو قطبین ہیں۔ یہ مثبت قطب (Pole) ہے جو مادی دنیا کے ظاہری حصے پر عمل کرتا ہے جب کہ منفی قطب باطن کے

عبادت گزار: یہ راہبہ خاتون جس کا نام دینیوا این خونس ہے دونوں ہاتھ اٹھائے دیوتا رے۔ ہاراکھتی کے سامنے عبادت کر رہی ہیں جبکہ عقاب کے سر والا دیوتا صلیب جسے نسل اور طویل عمری کی علامت سمجھا جاتا ہے دستی موگرا اٹھائے ہوئے ہے جبکہ اس کے دوسرے ہاتھ میں ترشول ہے۔

اسرار کی پہنائیوں میں گم ہے اور یہی کیلے کے ایتھرومیٹیریل ساخت کے نظریے کی بنیاد ہے۔ میڈم بلاوتسکی نے "مستقبل کی قوتیں" (The Coming Force) نامی باب میں کیلے کے بارے میں پیشین گوئی کرتے ہوئے لکھا ہے: "یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "سیلف موٹر" کا موجد میری اصطلاح میں پیدائشی جادوگر تھا۔ اسے اپنی باطنی توانائیوں کے بارے میں کبھی مکمل ادراک نہیں ہو سکا تھا۔ وہ صرف اپنی انہی قوتوں اور قابلیتوں

کو کام میں لاسکا تھا جو اس نے اپنے اندر اتفاقیہ طور پر دریافت کرلی تھیں"۔ میڈم شاید یہ کہنا چاہ رہی ہے کہ کیلے نے وہ قوتیں دریافت کرلی تھیں جو قدیم مصری راہبوں کے استعمال میں تھیں۔ اے پی سینیٹ نے اپنی کتاب "دی پیرامڈ اینڈ اسٹون ہینج" مطبوعہ تھیوسوفیکل سوسائٹی ۱۹۲۳ء میں لکھا ہے "جادو کی چھڑیاں، قدیم زمانے میں قدرت کے سربستہ رازوں کو آشکارا کرنے کی طاقت رکھتی تھیں. خفیہ الفاظ، مرتعش موٹر، لہروں کی طوالت اور گرینائٹ کے جناتی بلاکوں کو ہوا میں اڑانا یہ سب ان چھڑیوں کے دائرۂ اختیار میں تھا۔ بیشتر باتیں تو بالکل سائنس فکشن کی طرح لگتی ہیں۔ کیا ان نظریات کی کوئی سائنسی بنیاد بھی ہو سکتی ہے ؟" اس سوال کا امکانی جواب حاصل کرنے کے لیے ہم بیسویں صدی میں آجاتے ہیں۔ "۱۸۸۴ء کے ایک حبس زدہ دن ہنگری کا ایک دراز قامت دبلا پتلا آباد کار ایلس آئی لینڈ، نیویارک کے امیگرینٹ آفس سے نکلا اور موجد کے انتہائی متنازعہ پیشے میں شامل ہو گیا۔ یہ نکولا ٹیسلا "(Nikola Tesla)" تھا جس نے جلد ہی اپنے نقادوں اور بدگوئی کرنے والوں کو دیوار سے لگا دیا۔ اس نے ہزاروں مسائل کے چہروں پر پڑی نقاب نوچ کر پھینک دی۔ اس کے نمایاں کاموں میں ایک کام نیاگرا آبشار پر پاور ٹرانس مشن سسٹم بنانا اور الیکٹرک ٹرانس فارمر یا ٹیسلا کوائل ایجاد کرنا ہے۔ درجنوں میدانوں میں اس کی بے شمار ایجادوں نے قابل قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ ٹیسلا ایک ذہین، تنہا اور جھکی مزاج آدمی تھا اس لیے اس کے دشمنوں کی تعداد دوستوں سے کہیں زیادہ تھی. وہ اپنے بارے میں بدگمانی اور تنقید کرنے والوں کی ذرا پروا نہیں کرتا تھا۔ "یہ لوگ سائنس داں نہیں ہیں۔" اس نے ایک پریس کانفرنس میں ان کے بارے میں کہا۔ "انہوں نے ٹیسلا کی طرح کوئی بڑی دریافت نہیں کی ہے۔ انہوں نے کالجوں کی ڈگریاں حاصل کر کے یہ سیکھا ہے کہ کیا نہیں کیا جاسکتا. کچھ زندگی انہوں نے ڈگریاں حاصل کرنے میں گزار دی ہے باقی زندگی کچھ نہ کرتے ہوئے گزار رہے ہیں۔" اس قسم کی باتیں اخبار کے لیے تو چٹپٹی خبر بن سکتی تھیں مگر ٹیسلا کے دشمنوں کے لیے جلتی پر تیل کا کام کرتی تھیں۔ ٹیسلا کی کامیابیوں کو کبھی نہیں سراہا گیا۔ لوگ ہمیشہ اس خوف میں مبتلا رہتے تھے کہ اگر اسے کسی کانفرنس میں بلوایا گیا تو یہ جھکی ہنگری مین سارے سائنس دانوں کے بخیے ادھیڑ ڈالے گا۔ "تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہنگری کا یہ پاگل آدمی کیا کر ڈالے گا۔" یہ عام جملہ تھا جو اس کے بارے میں کہا جاتا تھا۔ نہ صرف وہ اپنے دشمنوں کو زچ کیے رکھتا تھا بلکہ ٹیسلا انا پرست بھی بہت تھا. "دنیا میں کسی کے اتنے دشمن نہیں ہیں جتنے میرے ہیں۔" اس نے ایک بار کہا۔ "مگر میرے سارے دشمن چھوٹے چھوٹے کم ذہن آدمی ہیں۔ ذہانت میں وہ عظیم ٹیسلا کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتے۔" ٹیسلا کے دشمن بھی حتی المقدور اس کے زہریلے جملوں کا جواب دینے کی کوشش کرتے رہتے۔ وہ اسے ایک سنکی آدمی سمجھتے تھے۔ "دراصل ٹیسلا قابلِ رحم آدمی ہے۔" ایک الیکٹریکل پاور انڈسٹری کے ایگزیکٹو نے کہا۔ "بلاشبہ یہ آدمی ذہین ہے اور دلچسپ پروجیکٹ پر کام کر سکتا ہے مگر کسی اور کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ اس میں ٹیم ورک کی صلاحیت ہے ہی نہیں۔ اسے ہمیشہ یہی شکایت رہتی ہے کہ لوگ اس کی ایجادیں چرا لیتے ہیں اور اس کے تخلیقی کام کا گلا گھونٹ دینے کے چکر میں رہتے ہیں۔" اس کا بـ

معاندانہ رویہ حقیقت پر مبنی تھا۔ اس کے بد معاش نائبوں نے اس کی کئی ایجادات چرالی تھیں۔ ٹیسلا کی عادت تھی کہ وہ کوئی فارمولا' کوئی نظریہ' کوئی ڈیزائن کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر لکھ لیا کرتا تھا۔ غیر حاضر دماغ اور بھلکڑ ہونے کی وجہ سے وہ یہ قیمتی پرچیاں ادھر ادھر رکھ کر بھول جاتا تھا۔ اس کا کوئی نہ کوئی نائب ان پرچیوں کو اٹھالیتا اور پیٹنٹ آفس کی طرف دوڑ جاتا۔ تھامس ایڈیسن نے ڈائریکٹ کرنٹ یا ڈی سی (DC) میں بڑی دولت خرچ کی تھی۔ اس برقیاتی نظام میں قریب میں الیکٹریکل جنریٹنگ پلانٹ لگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ٹیسلا اس وقت ایڈیسن کے ساتھ کام کر رہا تھا کہ اس کے ذہن میں آلٹرنیٹنگ کرنٹ (AC) کا خیال آیا۔ ایک ایسا برقیاتی نظام جس میں بجلی دور دراز فاصلوں تک پہنچائی جاسکتی تھی۔ ڈی سی پر تھامس کی اجارہ داری تھی اور وہ اپنے مقابلے میں کسی اور نظام کا حامی نہیں تھا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ ٹیسلا آلٹرنیٹنگ کرنٹ کا خیال ترک کر دے مگر ٹیسلا نے اس کے بجائے ایڈیسن کا ساتھ چھوڑ دیا اور اپنے طور پر اے سی پر کام کرنے لگا۔ یہ وہ برقی نظام ہے جو اب پوری دنیا میں کام کر رہا ہے۔ اس نظام کی اور دیگر ایجادات کی کامیابی کے بعد ٹیسلا نے محسوس کیا کہ سرمایہ کار اور بڑی بڑی کارپوریشنز جو اس کی ایجادات سے فائدہ اٹھا رہی تھیں رائیلٹی دینے میں اس کے ساتھ دھوکا کر رہی تھیں۔ ٹیسلا نے ارتعاشی توانائی پر بھی تجربے شروع کر دیئے۔ وہ توانائی جس کا تذکرہ سرّیت سے متعلق کتابوں میں مذکور ہے اور جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ عظیم اہراموں کی تعمیر میں اسی توانائی سے کام لیا گیا تھا۔ ٹیسلا پاور کمپنیوں' ہم عصر موجدوں اور ہر اس شخص سے حالتِ جنگ میں تھا جو اس کے قریب تھا۔ ایسے ہی ایجادی دور میں ٹیسلا نے مین ہٹن کے وسط میں ایک عمارت کے تہہ خانے میں اپنی لیباریٹری قائم کی۔ اب اس کے ذہن میں "موت کی شعاع" ایجاد کرنے کا خیال سمایا ہوا تھا جسے لیزر یا لیزر شعاع کی ابتدائی صورت کہا جاسکتا ہے۔ اس نے کئی برقی آلات ایجاد کیے پھر انہیں دیگر میکنکس سے ضروری پارٹ خریدنے کے لیے فروخت کر دیا۔ ایک دوپہر بقول اس کے ایک نائب کے ٹیسلا اس کباڑ خانے کو ساتھ لیے ایک ارتعاشی مشین "Vibratory Machine" بنانے میں جتا ہوا تھا۔ اس کے ذہن پر یہ مشین جسے وہ دورانِ جنگ استعمال کرنا چاہتا تھا' آسیب کی طرح سوار ہو چکی تھی۔ "ذرا سوچو!" وہ اپنے نائبین کے سامنے چلایا۔ یہ چھوٹی سی مشین دشمن کے کسی شہر میں نصب کرو۔ پھر اس کا بٹن دبا دو۔ اس میں سے ایسے غیر مسلسل ارتعاشی جھٹکے نکلیں گے کہ اس شہر کی ساری عمارات اور پل تباہ ہو جائیں گے اور ذرا سی دیر میں پورا شہر ملبے کا

معیاری کلس: مندروں میں راہب رسومات کے دوران یہ معیاری کلس یا چھجہ ساتھ ساتھ لیئے رہتے تھے یہ علامت کے طور پر مندروں کے اوپر سجائے جاتے تھے تصویر میں آپ پیپرس کا کلس ملاحظہ کر رہے ہیں جس کے اوپر عقابی دیوتا ہورس کی تصویر ہے جو مصر کے بادشاہوں کی علامت کے طور پر جانا جاتا ہے ہورس کے پاس بالائی اور زیریں مصر کے مشترکہ تاج تھے۔

ڈھیر بن جائے گا۔" تھوڑے ہی عرصے میں ٹیسلا نے اس مشین کا نمونہ بنالیا۔ مشین میں ایک پسٹن لگا ہوا تھا جس سے غیر مسلسل ارتعاش پیدا ہوتا تھا کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ٹیسلا نے اس مشین کو چلانے کے لیے آواز کی طاقت استعمال کی تھی۔ ٹیسلا نے اپنی مشین چالو کر دی اور اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نتائج کا انتظار کرنے لگا۔ چند سیکنڈ بعد ہی اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی لیبارٹری ہل رہی تھی۔ بعد میں وہ عمارت جس کے تہہ خانے میں یہ لیبارٹری تھی لرزنے لگی۔ چند منٹوں کے اندر اندر وہ بلاک یوں ہل رہا تھا جیسے ملبے کا ڈھیر بن جائے گا اور ہوا بھی یہی۔ کسی کو پتا نہیں تھا کہ کیا ہو رہا تھا۔ اپنے جوش کامرانی میں ٹیسلا پورے نیویارک شہر کو تباہ کر سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کے ابتدائی چند تجربات نے پولیس کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ جب پولیس کو اطلاع ملی کہ ایک پورا بلاک ملبے کا ڈھیر بن چکا ہے تو پولیس کپتان فوراً ہی ٹیسلا کی لیب میں گھس گیا اور مشین کو بند کر دیا اور پھر ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی۔ ٹیسلا نے بڑی معافی مانگی اور معذرت کی اور وعدہ کیا کہ وہ ابھی اس مشین کو تباہ کر دے گا۔ "میں کسی کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔" اس نے کہا۔ ٹیسلا نے اپنی کئی ایجادات کے پیٹنٹ حاصل کر لیے تھے مگر الیکٹرک پاور کمپنیوں سے اس کی جنگ جاری رہی۔ اس نے کئی کمپنیوں پر رائلٹی کی ادائیگی کے لیے دعویٰ کیا ہوا تھا مگر اس کی شنوائی نہیں ہو رہی تھی آخر اس نے کمپنیوں سے انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا۔ جب پاور کمپنیوں نے اس کے نئے منصوبے کے بارے میں سنا تو ان کا جی چاہا کہ قریب کھڑکیوں سے چھلانگ لگا دیں۔ ٹیسلا نے اعلان کیا تھا کہ وہ پوری دنیا کو برقا دیگا۔ "میں دنیا کا واحد آدمی ہوں جو بجلی کی اصلیت سے واقف ہے۔" اس نے کہا۔ "دوسروں کے لیے بجلی محض ایک معمہ ہے 'ایک اسرار ہے۔ انہیں ذرا علم نہیں ہے کہ بجلی کیسے کام کرتی ہے یا یہ دراصل ہے کیا چیز۔ وہ صرف ہدایات پر عمل کرتے ہیں اور انہی کے مطابق اسے کنٹرول کرتے ہیں۔ میرا منصوبہ ہے کہ میں پوری زمین کو برقی طور پر چارج کر دوں گا اور جب میں ایسا کروں گا تو کوئی بھی شخص زمین سے محض ایک سلاخ گاڑ کر مطلوبہ بجلی حاصل کر لے گا۔ پھر ٹرانس مشن لائنوں کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ لائنیں 'جناتی جنریٹنگ پلانٹس اور اس قسم کا تمام سامان ناکارہ ہو کر رہ جائے گا۔ جب میں اپنا یہ کام ختم کرلوں گا تو پوری دنیا میں ہر ایک کے لیے بجلی مفت ہو جائے گی۔" ظاہر ہے کہ اس اعلان کے بعد تمام پاور کمپنیوں کے نزدیک ٹیسلا کی حیثیت ایک کھڑ کھڑے سانپ کی سی ہو گئی تھی۔ پاور انڈسٹری کے لیے ماہانہ بلوں کی ناحصولی کا خیال ایک خوف ناک خواب کی طرح تھا۔ اگر ٹیسلا کامیاب ہو گیا تو ہر کوئی زمین میں ایک سلاخ گاڑ کر بجلی حاصل کر لے گا۔ مفت اور ہمیشہ کے لیے۔ ٹیسلا نے اس اعلان کے فوراً بعد ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ اس کے اس نظریے کی بنیاد 'وائبریٹری الیکٹرومیگنیٹک ٹرانس مشن فورسز" پر ہے۔ اخباری نمائندے حیرت سے آنکھیں پھاڑے ٹیسلا کی صورت تک رہے تھے جو انہیں اپنے منصوبے کا تفصیلی خاکہ بتا رہا تھا۔ "بجلی کو" وہ کہہ رہا تھا "آواز کی مرتعش لہروں کے ذریعے پوری دنیا میں ترسیل کیا جا سکتا ہے۔"

اس پریس کانفرنس کے بعد یہ سنکی موجد روکی ماؤنٹینس کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے پوری

پہاڑی کو لیز پر حاصل کیا۔ کارندے ملازم رکھے اور لاکھوں ڈالر پہاڑی ڈھلوان تیار کرنے پر خرچ کر دیئے۔ ''یہ ضروری ہے''۔ اس نے تماشائیوں سے کہا۔ ''پوری دنیا کو بھاری برقی چارج کرنے کے لیے یہ ڈھلان ضروری ہے''۔ آخر کئی بار کی تاخیر کے بعد اس کا پروجیکٹ تیار ہو گیا۔ اس تاریخی موقع پر وہاں اخباری نمائندوں کا بے پناہ ہجوم تھا جب ٹیسلا پوری دنیا کو برقانے کے لیے بٹن دبانے والا تھا۔ ٹیسلا مسکرایا۔ اس نے بٹن دبایا۔ روشنیاں مدھم پڑ گئیں۔ اس نے تاریخ کا سب سے بڑا فیوز اڑا دیا تھا۔ کولیروڈو کے ارد گرد کے سارے قصبے تاریکی میں ڈوب گئے۔ مغربی ریاستوں کے پاور اسٹیشنوں میں لگے سارے میٹرو حشیانہ انداز میں گھومنے لگے۔ ٹیسلا نے میلوں دور تک برقی نظام کو معطل کر دیا تھا گویا اس کا تجربہ ناکام ہو گیا تھا۔ ''یہ تخریب کاری ہے۔ وہ چلایا۔ یہ پاور کمپنیوں کی بدمعاشی ہے۔ انہوں نے میرے کارکنوں میں اپنے تخریب کار شامل کر دیئے ہیں۔ یہ لوگ ڈرتے تھے کہ کہیں پوری دنیا کو مفت بجلی نہ ملنے لگے۔''

ٹیسلا پر کئی مقدمات دائر کر دیئے گئے۔ محدود رقم کی وجہ سے وہ اب اپنے منصوبے پر مزید کام کرنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ نیویارک میں اپنے اسی ہوٹل کے کمرے میں آ گیا جسے وہ اپنا گھر کہتا تھا۔ اپنی یہ شامیں وہ نیویارک لائبریری کے قریب کبوتروں کو دانا کھلاتے ہوئے گزارتا تھا اور بڑبڑاتا رہتا تھا کہ تخریب کاروں نے اس کے منصوبے کو تباہ کر دیا۔ ۱۹۳۴ء میں اس نے ایک اور پریس کانفرنس بلوائی اور ''موت کی شعاع'' نامی ایجاد پر کام شروع کرنے کا اعلان کیا۔ اس نے اعلان کیا کہ یہ مشین آواز کی لہروں کے ذریعے کام کرے گی۔ ''یہ ایک غیر مرئی شعاع ہو گی جو تین سو میل دور تک دشمن طیاروں کو مار گرائے گی۔'' اس نے بتایا۔ ''اس مشین کے ذریعے دس لاکھ افراد کی فوج کو منٹوں میں تباہ کیا جا سکے گا۔'' امریکا میں یہ ڈپریشن (کسادبازاری) کا دور تھا۔ حکومت اور شہری معاشی بحالی کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ''موت کی شعاع'' سائنسی کہانی کا حصہ دکھائی دیتی تھی جو عملی طور پر ناممکن تھی۔ نتیجتاً قومی پریس میں ٹیسلا کے اس منصوبے کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ بہر حال ۱۹۳۸ء میں بات سامنے آ گئی کہ دوسری جنگ عظیم ناگزیر تھی۔ واشنگٹن میں کسی کو یاد آیا کہ نکولا ٹیسلا نے کبھی موت کی شعاع کی بات

کام کے لیے تیار: قدیم مصر کا یہ نوجوان خوش نویس آلتی پالتی مارے ایک گول تختے پر کمر سیدھی کئے بیٹھا ہے اور اس کی گود میں پیپرس کاغذ ہے جس پر وہ لکھنے کے لیے پر تول رہا ہے قدیم مصر میں نشست کا یہ خاص انداز تھا۔

کی تھی۔ یو ایس آرمی نے ٹیسلا کو پکڑ لیا اور ''موت کی شعاع'' کا راز پوچھنے کی کوشش کی۔ ٹیسلا نے اپنا منصوبہ ان کے حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس وقت سے اپنی موت تک یعنی ۱۹۴۳ء تک ہنگری کا یہ آباد کار ایف آئی اے کی مسلسل نگرانی میں رہا۔ جہاں کہیں ٹیسلا جاتا ایجنٹ اس کے تعاقب میں رہتے اور وہ پرچیاں چنتے رہتے جن پر ٹیسلا کوئی فارمولا' کوئی ڈیزائن وغیرہ لکھ کر گرا دیتا تھا۔ جب وہ مرا تو ایف آئی اے نے فوراً اس کا ہوٹل والا کمرہ سیل کر دیا۔ اس نے اس کے تمام کاغذات اور نوٹ بکس اپنے قبضے میں لے لیں۔ کارڈبورڈ ڈبے جو اس کی تحریروں اور ڈرائنگوں سے بھرے ہوئے تھے چیکنگ کے لیے سائنس دانوں کی ایک ٹیم کے پاس پہنچا دیئے گئے۔ ''ایف بی آئی اور دیگر انٹیلی جنس گروپ برسوں تک ٹیسلا کی نگرانی کرتے رہے تھے۔'' برسوں بعد مجھے بتایا گیا۔ میرا انفارمر یو ایس انٹیلی جنس ایجنسی کے ایک انتہائی حساس ادارے کا اعلیٰ حاکم تھا۔ ٹیسلا نیم پاگل تھا۔ ایک سر پھرا مگر بے حد ذہین۔ میرے خیال میں کوئی شخص بھی اس کی دشمنی مول لے کر چین سے نہیں رہ سکتا تھا اور نہ ہی کوئی حکومت یہ چاہ سکتی تھی کہ وہ اس کے دشمنوں سے مل جائے۔ امریکا کو یہی ڈر تھا کہ کہیں ٹیسلا جرمن ایجنٹوں کے چکر میں نہ پھنس جائے۔ جرمن اس کے دوست بن جاتے' اس کی ہر خواہش پوری کرتے اور اس سے اس خطرناک منصوبے کو حاصل کر کے پورا پورا فائدہ اٹھاتے۔ ٹیسلا تاریخ کا سب سے زیادہ نگرانی کیا جانے والا آدمی تھا۔ اس کی ہمیشہ سے عادت تھی کہ کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پُرزوں پر بیش قیمت فارمولے اور نوٹس وغیرہ لکھتا رہتا تھا۔ وہ لنچ لیتے وقت میز پر بھی کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا تھا۔ ایجنٹوں کے ذمے یہ ڈیوٹی تھی کہ اس طرح کا کوئی پرزہ گم نہ ہونے پائے اور اسے حاصل کر کے فوراً اسے واشنگٹن روانہ کر دیا جائے۔''

سرّیت کے چند ماہرین کے مطابق ٹیسلا نے ارتعاش اور آواز کے وہ راز دریافت کر لیے تھے جو قدماء کا حصہ تھے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ مصری راہب بڑے بڑے پتھروں کو جادو کی چھڑی سے پیدا کیے ہوئے ارتعاش کی مدد سے فضا میں اڑا کر مطلوبہ جگہ پہنچا دیتے تھے۔ ٹیسلا بھی اکثر ایسی ایجاد کی بات کیا کرتا تھا جو کشش ثقل پر غالب آ سکتی تھی۔ اسے علم تھا کہ آواز اور مالیکیول کا ارتعاش بے وزنی کی کیفیت حاصل کرنے کی کنجی تھے۔ آج امریکا کے پاس اپنے ہولناک ہتھیاروں کے ذخیرے میں ''موت کی شعاع'' خارج کرنے والی مشین بھی موجود ہے۔ یہ خطرناک مشین آواز کی لہروں سے کام کرتی ہے۔ اس مشین سے ایسی آواز کی لہریں نکلتی ہیں جو ٹھوس دیوار کو چیر کر عمارت میں موجود افراد کے دماغوں کو مختل کر دیتی ہیں اب ٹیسلا کے الیکٹرو میگنیٹک اور اینٹی گریویٹی والے آلات دیوانے کی بڑ نہیں رہے ہیں۔ حکومت امریکا اور دیگر بے شمار ممالک کشش ثقل کو فتح کرنے اور اسے اپنے قابو میں کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اس طرح شاید ہم اس کوشش میں ہوں کہ قدیم راہبوں کے وہ راز جان لیں جن پر وہ بجا طور پر فخر کرتے تھے۔

☆

اہراموں اور یو ایف اوز کے رابطہ کار

نکولا ٹسلا کی طرح ایک اور منحرف سائنس داں ڈاکٹر ایم کے جیسوپ (Dr. M.K.Jessup) تھا جو سائنس کے مروجہ اصول و قوانین و نظریات کے لیے ایک چیلنج بن گیا تھا۔ ڈاکٹر جیسوپ ایک ایسا ممتاز سائنس داں تھا جس نے دیو قامت یک سنگی عمارات کے اسرار پر بہت زیادہ علمی اور تربیتی کام کیا تھا۔ ڈریک یونیورسٹی اور یونیورسٹی آف مشی گن میں ریاضی اور فلکیات کی درس و تدریس کے بعد اس نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ تھوڑے عرصے بعد وہ مشی گن یونیورسٹی کی گرانٹ پر جنوبی افریقہ چلا گیا۔ وہاں اس نے دنیا کے اس نصف کرہ میں دنیا کی سب سے بڑی انعکاسی دوربین نصب کی اور اسے آپریٹ کیا۔ جیسوپ کے جنوبی افریقہ میں قیام کے دوران میں بے شمار نئے ستارے دریافت ہوئے۔ ان میں کئی دوہرے ستارے بھی شامل تھے۔ بعد میں ان ستاروں کی "رائل ایسٹرونومیکل سوسائٹی" انگلینڈ نے ایک فہرست بھی مرتب کی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں وہ امریکا کے زرعی محکمے کے ایک مشیر کی حیثیت سے جنوبی امریکا چلا گیا جہاں اسے امیزان کے جنگلات میں خام ربڑ حاصل کرنے کے ذرائع دریافت کرنے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب اسے اپنی ذمہ داریوں کی بجا آوری کے لیے سفر کے دوران میں جنوبی امریکا کی قدیم یک سنگی عمارات کے کھنڈرات سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ گہرے مطالعہ اور تحقیق کے بعد اس نے ۱۹۵۵ء میں "دی کیس فار یو ایف اوز" نامی کتاب تحریر کی جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ کس قدر ماہر ریاضی داں اور ماہرِ طبیعیات و اثریات و فلکیات تھا۔ وہ یو ایف اوز کے وجود پر یقین رکھتا تھا۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ غیر ارضی خلائی مخلوق ہزاروں لاکھوں برسوں سے ہمارے اس سیارے پر موجود تھی۔ جیسوپ ڈاکٹر البرٹ آئن

خوش نویس اور ان کا نگہبان: یہ دونوں خوش نویس چرمی کاغذ پر الفاظ لکھنے میں مصروف ہیں ان دونوں کے سامنے بریف کیس اور دستاویز رکھنے والا تھیلا موجود ہے جبکہ ایک سپروائزر ان کی حرکات کو توجہ سے دیکھ رہا ہے کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں۔ یوں قدیم مصر میں بھی محققین کی درباری قسم ہوا کرتی تھی جس کا کام حاکم کی ہاں میں ہاں ملا کر "جو حکم ہے آقا" کہہ کر تاریخ کو رقم کرنا تھا تاہم مصر میں احکام سے زیادہ نگرانی اس لیے کی جاتی تھی تاکہ غلطی کا کوئی احتمال نہ ہو کیونکہ نگراں نرا جاہل نہیں ہوتا تھا بلکہ ایڈیٹر ٹائپ کی چیز ہوتا تھا۔

اسٹائن کی ''یونی فائیڈ فیلڈ تھیوری'' کا بھی بڑا سرگرم پیروکار تھا۔ڈاکٹر جیسوپ اس قابل تھا کہ انسانیت کے ماخذ اور نقطۂ آغاز کے گرد لپٹی ہوئی متنوّع سرّیت میں سے کسی ایک پر سے پردہ اٹھا سکتا تھا۔اس کی سائنسی تربیت اور متجسّس ذہن یو ایف اوز کے مطالعہ کے لیے ایک گراں قدر سرمایہ کی حیثیت رکھتا تھا۔جہاں اس کے ہم منصب اس موضوع پر بات کرنے سے بھی گھبراتے تھے جیسوپ وہاں ڈٹ جاتا تھا اور کسی اختلاف کی پروا نہیں کرتا تھا۔اسے اہراموں' دنیا بھر میں پھیلی ہوئی دوسری دیو قامت سنگی عمارتوں اور برمودا ٹرائینگل کی سریت سے خاص دلچسپی تھی۔بد قسمتی سے اس کی تحقیق کا عمل ابھی ابتدائی مراحل ہی میں تھا کہ وہ ڈیڈ(Dade) کاؤنٹی پارک' فلوریڈا کے قریب کھڑی ہوئی اپنی گاڑی میں مردہ پایا گیا۔ یہ ۲۹ اپریل ۱۹۵۹ء کا دن تھا۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں نے اسے خودکشی قرار دیا تھا۔انھوں نے اس کی اسٹیشن ویگن کے ایگزہاسٹ پائپ سے منسلک ایک ہوز کی وجہ سے یہ نتیجہ نکالا تھا۔وہ ہوز گاڑی کے پیچھے سے گھما کر کار کے اندر آیا ہوا تھا۔پولیس افسران نے بتایا کہ ڈاکٹر جیسوپ اپنی بیوی سے طلاق کی وجہ سے شدید مایوسی کا شکار تھا۔یو ایف اوز کے چند ایک محققین کی رائے تھی کہ اس طرح جیسوپ کی زبان بند کر دی گئی تھی اور جب وہ ان حقائق کو دنیا کے سامنے لانے کے قابل ہوا تو اسے قتل کر دیا گیا۔مگر آج تک قتل کے نظریے کے ثبوت کے طور پر کوئی بھی بات سامنے نہیں آسکی ہے۔اپنی موت سے قبل ڈاکٹر جیسوپ نے ہوا میں پرواز' اہرام اور دنیا میں بکھری ہوئی دیگر سنگی عمارتوں کے بارے میں اپنے نظریات پر سیر حاصل گفتگو کی تھی۔اس گفتگو کا کچھ حصہ پہلی بار یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔ اس میں سے غیر ضروری باتیں حذف کر دی گئی ہیں۔

سوال :آپ کو اس بات کا یقین کیوں ہے کہ قدماء فضاء میں اڑنے اور چیزوں کو اڑانے کا فن جانتے تھے ؟

جواب : ذرا تحریری ریکارڈ کو چیک کریں۔آپ دیکھیں گے کہ قدماء کے پاس مشینی پرواز کی کچھ صورتیں موجود تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ ایک لاکھ سے ڈھائی لاکھ سال پہلے کی بات ہے۔ تقریباً پوری دنیا میں بھاری بھرکم پتھروں کی تعمیرات بکھری ہوئی ہیں۔اگر آپ ان تعمیرات پر غور کریں تو لازماً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اس زمانے میں پوری دنیا میں صرف ایک ہی تہذیب کی حکمرانی تھی۔وہ لوگ میکانکی طور پر بہت آگے تھے مگر یقیناً ان کا انداز ہماری موجودہ تہذیب کا سا نہ تھا۔آج ماہر بشریات جتنی تہذیبوں کو شناخت کر سکے ہیں وہ سب کی سب اس قدیم تہذیب کی باقیات ہیں جو ایک لاکھ سال پہلے دنیا میں موجود تھی مثال کے طور پر بابلی تہذیب 'یونانی' چینی' سلطنت روما' پیرو اور ہندوستانی تہذیب یہ ساری تہذیبیں اس ایک تہذیب کا حصہ ہیں جسے ''جدی تہذیب'' (Parent Civilization) کہا جا سکتا ہے۔اس کے ثبوت میں ہم ان عظیم بلکہ جناتی سنگی تعمیرات کو پیش کر سکتے ہیں جو عجوبۂ روزگار بنی آج بھی سینۂ گیتی پر ایستادہ ہیں۔اس سلسلے میں کچھ تحریری مسودات بھی ہیں مگر ان میں سے بیشتر ضائع ہو چکے ہیں۔ مجھے یہ سوچ کر بے حد دکھ ہوتا

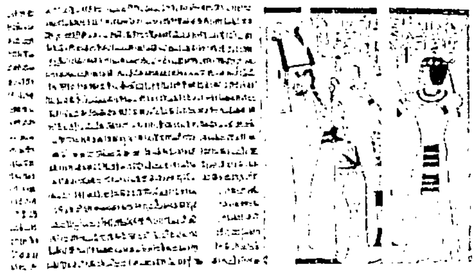

یہ دو مسودات ملاحظہ کیجئے جو پیپرس پر لکھے اور نقش کئے گئے ہیں خوش نویسوں کے لیئے یہ بہت آسان طریقہ تھا کہ وہ تحریر کے ساتھ ساتھ تصویری رسم الخط ہیروغلافی کے ذریعے تیزی سے اپنا کام کرتے تھے تحریر کے ساتھ آپ بڑے پادری کو دیکھ رہے ہیں کہ جو دیوتا اوسرس کو نذر نیاز دے رہا ہے اور ساتھ میں تحریری خط ہے۔

ہے کہ ماضی کی عظیم لائبریریوں کو لوٹ کر اور جلا کر تباہ کر دیا گیا تھا۔ بہر حال یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس جدی تہذیب نے سنگی تعمیرات کے فن کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا تھا۔ انہیں ایسے ذرائع، ایسے طریقے معلوم تھے کہ وہ بڑے بڑے بھاری پتھروں کو دور دراز فاصلوں تک بڑی آسانی سے لے جا سکتے تھے۔ ان کا وہ طریقہ ہمارے آج کے دور کے ہر طریقے سے زیادہ سہل اور کارآمد تھا۔

سوال: کیا آپ اس کی کوئی مثال پیش کر سکتے ہیں؟

جواب: مصر کے عظیم اہراموں پر نگاہ ڈالو۔ کہا جاتا ہے کہ ہزاروں غلاموں کی مدد سے یہ عمارات تعمیر کی گئی ہیں۔ اندازہ ہے کہ ان بھاری پتھروں کو ڈھلانوں سے لڑھکا کر' پانی کی نہروں سے بہا کر لایا گیا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انہیں لکڑی کے کندوں پر چرخی چڑھا کر رسوں کے ذریعے یا کسی اور طرح کے لیور کے ذریعے حرکت دی گئی تھی۔ دنیا کے کسی علاقے میں چلے جائیں آپ کو ہر جگہ ناقابلِ یقین حد تک بھاری بھرکم سنگی بلاک ملیں گے جنہیں پتھر کی کانوں میں سے نکالا گیا تھا' دور دراز کے فاصلوں تک لایا گیا تھا اور پھر ایک کے اوپر ایک رکھ کر عمارت بنائی گئی تھی۔ یہ یک سنگی دیو قامت عمارات آپ کو ایسٹر آئی لینڈ' ایشیا' مشرق وسطیٰ' مصر' جنوبی امریکا اور دوسرے بے شمار علاقوں میں نظر آئیں گی۔

سوال: کوئی خاص مثال دیں۔

جواب: جب میں جنوبی امریکا میں تھا تو میں پیرو میں اینڈیز پہاڑوں کے بلند ترین حصے واقع سیکسا ہومان کے قلعہ کو دیکھنے گیا تھا۔ یہ قلعہ انکا سے پہلے دور کے شہر کُزکو کے اوپر واقع ہے۔ یہ عمارت بڑے بڑے پتھروں کو رگڑ کو ایک دوسرے پر جما کر تعمیر کرنے کی ابتدائی ترین مثال ہے۔ آج کل ہم یہ طریقہ اپنی ہائی پاور دوربینوں کے عدسوں کو رگڑ کر ان میں فٹ کرنے کے لیے اپنائے ہوئے ہیں۔ میں سیکسا ہومان قلعے کے نچلے حصے کے تین سنگی زینے دیکھ کر بے حد متاثر ہوا جنہیں اسی طریقے سے پتھروں کو رگڑ رگڑ کر سل کی صورت میں ڈھال کر فٹ کیا گیا تھا۔

سیکسا ہومان کے کونے کے پتھر سیاہ بسالٹ کے ہیں جو بہت سخت' مضبوط اور ٹھوس ہوتا ہے۔ ان میں

کئی پتھر بارہ سے پندرہ مربع فٹ کے ہیں۔ وہ تقریباً بیس فٹ بلند ہیں اور وزن ڈھائی سو ٹن کے قریب ہے۔ ذرا تصور کریں ان پتھروں کو ان کی کانوں سے سائٹ تک لانے میں کس قدر قوت صرف کرنی پڑی ہوگی۔ سائٹ پر لاکر انہیں اس جگہ سے اوپر بھی اٹھانا پڑا ہوگا۔ پھر انہیں ایک دوسرے پر صحیح جمانے کے لیے آگے پیچھے حرکت بھی دینی پڑی ہوگی۔ یہ رگڑائی اور اٹھانے جمانے کا کام انتہائی وقت اور محنت طلب کام رہا ہوگا۔ بسالٹ پر کام کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ ان پتھر کی جناتی سلوں کو ایک دوسرے کے اوپر اس نفاست سے چنا گیا ہے کہ ان کے جوڑ میں کاغذ کا پرزہ بھی نہیں جا سکتا۔

سوال: کیا ان معماروں نے بلاک اینڈ ٹیکل (وزن اٹھانے کی چرخیوں کا کندہ) استعمال کیا تھا؟

جواب: لگتا تو نہیں ہے۔ پہلے کونے کے پتھر لگائے گئے ہوں گے پھر ان کے ساتھ ساتھ دوسرے پتھروں کو چنا گیا ہوگا۔ حالانکہ یہ پتھر سائز میں بہت بڑے ہیں' ان کا وزن بھی کہیں زیادہ ہے۔ میں یقین نہیں کر سکتا کہ انہیں حرکت دینے کے لیے مطلوبہ افرادی قوت لگائی جا سکی ہوگی۔ پتھر کو دھکیلنے یا کھینچنے کے لیے اتنے بہت سارے آدمیوں کے لیے جگہ کی ضرورت ہوتی ہے جو ان پتھروں کے گرد ہرگز میسر نہیں آسکتی تھی۔ ذرا سوچو انہیں ناہموار زمین پر دو سو ٹن وزنی پتھر دھکیلنا تھا۔ اس میں بے حد زیادہ قوت درکار ہوتی ہے۔ دنیا میں اب تک بھی کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہو سکی ہے جو یہ کام کر سکے۔ ایک مقام پر مرکوز کرنے کے لیے انتہائی توانائی کی ضرورت ہوتی ہے تب کہیں جا کر یہ وزنی پتھر کھسکتے ہیں۔

سوال: کیا اس کام کے لیے میکانکی کے بجائے کوئی کیمیائی توانائی استعمال کی گئی ہوگی؟

جواب: امیزان میں قیام کے دوران میں' میں نے ایک غیر معمولی پرندے کے بارے میں سنا۔ میرے گائڈ نے بتایا یہ پرندہ چٹانوں میں گھر بناتا تھا۔ یہ پرندہ اپنی چونچ سے گرینائٹ کی چٹان کی چوٹی پر کھدائی کر کے اپنا گھر بنایا کرتا تھا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ پہلے یہ پرندہ اپنی چونچ میں دبا کر کہیں سے ایک پتّا لاتا تھا پھر چٹان کھودتا تھا۔ میں نے اس پرندے کے بارے میں کچھ اور باتیں معلوم کرنے کی کوشش کی مگر نہ تو وہ پرندہ مجھے دکھائی دیا اور نہ ہی وہ پتا جس کی مدد سے وہ پرندہ پتھر کو کھود لیا کرتا تھا۔ اس میں شاید کوئی ایسے کیمیائی اجزا ہوں جو پتھر کو نرم کر دیتے تھے یا اس کی چونچ میں اس قدر طاقت اور تیزی پیدا کر دیتا تھا کہ پرندہ اس سے پتھر کو کھود لیتا تھا۔ اس قسم کا کوئی مرکب پتھروں کو نرم کر کے اپنی مرضی کے مطابق تراش میں معاون ثابت ہو سکتا تھا۔ جب تک کچھ اور معلومات حاصل نہ ہوں میری نظر میں اس پرندے کی حیثیت جنوبی امریکا کی لوک داستانوں سے زیادہ نہیں ہے۔

سوال: کیا آپ کو یقین ہے کہ قدماء کے پاس کسی قسم کی میکانی قوت موجود تھی؟

جواب: آپ سمجھ سکتے ہیں کہ پتھروں کی تعمیر کا جو کام انہوں نے کیا ہے اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ وہ کسی بے مثال قسم کی قوت کے حامل تھے۔ اس قوت یا توانائی کا واقعی کوئی وجود تھا اس میں مجھے ذرا

بھی شبہ نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ انہیں یہ قوت محدود پیمانے پر حاصل تھی۔ یہ کوئی ایسی قوت نہیں تھی جسے وہ ہر کہیں استعمال میں لا سکتے تھے۔ یہ شاید ہمارے دور جیسی کوئی صنعتی ٹیکنالوجی تھی لیکن انہوں نے اس ٹیکنالوجی کو زیادہ وسعت نہیں دی اور سنگی تعمیرات سے آگے نہیں بڑھے۔ شاید ان کی یہ توانائی صرف پتھروں پر ہی کارآمد ہو یا غیر مقناطیسی چیزوں پر اثرانداز ہوتی ہو۔ بس یہی ایک منطقی وضاحت سمجھ میں آتی ہے۔

سوال: کیا اس قدیم توانائی کے سلسلے میں آپ کا اپنا کوئی خاص نظریہ ہے؟

جواب: یہ یقیناً کوئی میکانکی، برقی یا برق مقناطیسی توانائی نہیں تھی۔ ہمیں کسی ایسی قدیم سائنس کے ارتقاء پر غور کرنا چاہیئے جو ان کے لئے یہ توانائی پیدا کرتی تھی۔ یہ سائنس یا تو جدی تہذیب کے دور کی پیداوار تھی یا پھر کسی غیر ارضی مخلوق کا زمینی انسانوں کے لیے تحفہ تھا۔ لگتا تھا اس توانائی میں کششِ ثقل کو کنٹرول کرنے کی خاصیت تھی۔ بہت سارے لوگ فضاء میں پرواز کے نظریے کا مذاق اڑاتے ہیں مگر تقریباً ہر کلچر میں اس قسم کی داستانیں موجود ہیں۔ اس کا ثبوت مستقبل میں آئن اسٹائن کی "یونی فائڈ فیلڈ تھیوری" کے ذریعے مہیا ہو سکتا ہے۔ ایسے کئی شواہد موجود ہیں کہ کششِ ثقل کو کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ ایسا وقت آنے والا ہے جب ہم کششِ ثقل کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکیں گے۔ ان سنگی تعمیرات کا کام فضاء میں پرواز والی ہی کسی تکنیک سے لیا گیا تھا۔ شاید تحقیق کے بعد یا محض اتفاقاً قدماء نے اس حیرت انگیز توانائی کو دریافت کر لیا ہو اور ہم بھی اسے شاید دوبارہ دریافت کرنے کے قابل ہو جائیں۔ ڈاکٹر جیسوپ اپنی کتاب "دی کیس فار یو ایف اوز" میں فضاء میں پرواز کے طریقے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

'یہ فضاء میں پرواز والی کون سی قوت تھی؟ اگر ہم فرض کر لیں کہ انہیں ہمارے رسّوں، کیبلز، بلاکس اور چرخیوں والے میکانکی اصول میسر تھے تو بھی وہ بارہ سو ٹن وزنی پتھر کو کھینچنے کے لیے رسا کہاں سے لا سکتے تھے اور کیسے اس پتھر کو اس کی جگہ تک پہنچا سکتے تھے؟ پتھروں میں مقناطیسیت نہیں ہوتی۔ کیا پانی تیرا کر یہ کام کرنا سمجھ میں آ سکتا ہے؟ ریت کی ڈھلانیں بھی مناسب ذریعہ

تصویری خط ہیرو غلافی اور اس کا ماخذ: مصری خوش نویس اپنے تصویری خط کے لیئے تصاویر پوری دنیا سے لیتے تھے خرمن الو (barn owl) کو حروف علت کے طور پر "ایم" کی جگہ مستعمل کیا جاتا تھا تصویر میں آپ "الو" کو شاہی نام آمن ایم ہت (Amen emhat) کا حصہ دیکھ رہے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اُلو کو مصر والے ذہین پرندہ قرار دیتے تھے اور یہی ذہانت بعد ازاں مغرب والوں نے اختیار کی جب وہاں کسی کو الو کہا جاتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے کہ اسے ذہین کہا گیا ہے جبکہ مشرق والے الو کو بے وقوف قرار دیتے ہیں اور الو بے وقوف شخص کو کہا جاتا ہے۔

نہیں ہو سکتیں۔ میں نے فضاء میں پرواز کا لفظ طاقت یا قوت کے متبادل کے طور پر استعمال کیا ہے۔ میں نے یہ بھی کہا ہے کہ اڑن طشتریاں کوئی ایسا طریقہ یا ذریعہ استعمال کرتی تھیں جو میدانِ ثقل میں رد عمل ظاہر کرتا تھا۔ اس طرح سے پورے جسم کے لیے اٹھان یا رفتار کی قوت استعمال کر سکتے تھے۔ یہ قوت جسم کے اندر اور باہر یکساں طور پر اثر انداز ہوتی تھی اور صرف سطح پر خارجی قوت یا دباؤ پر مدار نہیں رکھتی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ ان بھاری بھر کم پتھروں کو اٹھانے اور جمانے کے لیے ایسی ہی کسی قوت سے کام لیا گیا ہوگا اور مجھے یقین ہے کہ اٹھانے یا فضاء میں پرواز میں معاون ثابت ہونے والی یہ توانائی، قوت یا طریقہ اچانک ہی معدوم ہو گیا تھا۔"

جیسوپ آخر میں کہتا ہے کہ : "بلند کرنے والا انجن خلائی جہاز تھا۔ شاید کوئی بہت ہی بڑا جو دوسرے سیاروں کی مخلوق کو زمین کے مختلف حصوں میں لے کر آیا تھا اور اسی نے یہ عظیم سنگی عمارتیں کھڑی کرنے میں مدد کی تھی۔ اس کے خیال میں یہی نظریہ ہے جس کی بناء پر زمین پر پھیلی ہوئی ان محیر العقول تعمیرات کا راز سمجھا جا سکتا ہے۔ دوران انٹرویو، جیسوپ نے بڑے وثوق سے کہا کہ اڑن طشتریوں کا تعلق قدیم براعظم میو(Mu) سے تھا' کتاب میں لکھا ہے۔

سوال : کیا ان اڑن طشتریوں کا تعلق بیرونی خلاء سے تھا؟

جواب : مجھے یقین ہے کہ ان کا تعلق اس قدیم تہذیب سے تھا جسے ہم میو(Mu) کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ وہ جدی تہذیب ہے جو قدیم ترین زمانے میں ہونے کے باوجود سائنس میں بہت آگے تھی۔

سوال : کیا آپ کے خیال میں میو کسی خوفناک تباہی یا سیلاب کی نظر ہو گیا؟

جواب : پوری کی پوری تہذیب کو اس انداز میں تباہ کرنے کے لیے کہ اس کے وجود کی اکی دکی شہادتیں ہی بچ سکیں، کسی بہت تیز رفتار اور بے حد ہولناک طوفان یا تباہ ناکی کی ضرورت تھی۔ میں نے سنا ہے میو(Mu) کو زلزلے نے تباہ کیا تھا مگر میں نہیں سمجھتا کہ کوئی انتہائی شدید زلزلہ بھی اس قدر ہولناک تباہی لا سکتا تھا۔ اس کے بجائے میرا خیال ہے کہ یہ کسی بیرونی خلائی شئے کا کارنامہ ہے جو ہمارے سیارے سے ٹکرائی تھی اور سب کچھ ملیامیٹ کر کے رکھ دیا تھا۔

سوال : کیا یہی آپ کی کتاب کا موضوعِ سخن ہے؟

جواب : میں نے اپنے مسودے میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ زمانۂ قدیم میں ایک ایسی تہذیب موجود تھی جو سائنس میں بہت آگے تھی۔ اس تہذیب کے حامل لوگوں نے فضاء میں پرواز کا ایک ایسا طریقہ دریافت کر لیا تھا جو بعد میں خلائی سفر کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ یہ تہذیب اچانک ہی تباہ ہو گئی اور صرف وہی چند ایک لوگ بچ سکے جو کسی پناہ گاہ میں موجود تھے۔ میرا تو یہ بھی خیال ہے کہ اس ہولناک تباہی کے وقت ایک یا دو خلائی جہاز محوِ پرواز تھے بس ان کے مسافر ہی بچ سکے تھے اور یہ انہی لوگوں کی نسل ہے جو اب بیرونِ خلاء میں آباد ہے۔ مصنف جون کیل کے خیال میں اہراموں کی تعمیر کے بارے میں جیسوپ کی وضاحت تسلی بخش نہیں ہے۔ اپنی کتاب "ان آور ہانٹڈ پلینٹ" (فاسٹ بکس ۱۹۷۱ء) میں جیسوپ کے فضاء میں پرواز کے نظریے پر تبصرہ کرتے ہوئے جون

کیل لکھتا ہے : ''اگر آسمان میں کوئی ایسی سپر سوسائٹی موجود ہے جو ٹیکنالوجی میں اس قدر آگے ہے کہ بہت بڑا خلائی جہاز بنا سکتی ہے جو ہمارے حقیر سیارے تک اڑ کر آسکتا ہے تو پھر انہیں یہاں محض پتھر کے بلاکوں سے کھیلنے کی کیا ضرورت تھی ؟ اگر واقعی وہ لوگ اپنی آمد کی کوئی شہادت چھوڑنا ہی چاہتے تھے تو پھر انھوں نے بہت ہی حقیر کام کیا ہے کیونکہ ہم ابھی تک ان یک سنگی عمارتوں کا مطلب نہیں سمجھ سکے ہیں۔ کیا وہ ہمارے لیے ان اہراموں کے اندر کوئی خوبصورت پیغام لکھ کر نہیں جا سکتے تھے کیا وہ لوگ دنیا کی پچھتر (۷۵) زبانوں میں سارا ماجرا درج نہیں کر سکتے تھے ؟ عظیم اہرام میں پائی جانے والی واحد تحریر کچھ آڑی ترچھی لکیریں ہیں جو بالائی چیمبر کی چھت پر کھینچ دی گئی ہیں اور جنہیں ماہر اثریات سنگی معماروں کے نشانات سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے ہو سکتا ہے یہ لکیریں محض کسی کھلنڈرے مزدور کا کارنامہ ہو جیسے کوئی لڑکا کسی تاریخی مقام کی سیر کرتے ہوئے چپکے سے دیوار پر یوں لکھ دیتا ہے ''کلورائے یہاں آیا تھا۔''

جارج آدمسکی وہ پہلا شخص ہے جو دوسرے سیارے کی مخلوق سے رابطہ قائم کرنے کا دعوے دار ہے۔ وہ اپنے گھر کے عقبی صحن سے دوربین کے ذریعے دو سالوں تک اڑن طشتریاں دیکھتا رہا تھا۔ ۲۰ نومبر ۱۹۵۲ء کو آدمسکی نے دعویٰ کیا کہ اس نے وینس کے اڑن طشتری والوں سے گفتگو کی ہے۔ آدمسکی اور اس کے خلائی بھائی نے یہ گفتگو ٹیلی پیتھی کے ذریعے کی تھی'' اس نے کہا کہ اس کا نام ''اور تھون'' تھا۔'' آدمسکی نے بعد میں بتایا'' اس کے دانت بہت سفید تھے' چہرہ گول تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ ہماری دنیا کے لیے ان کا رویہ دوستانہ ہے۔ انہیں صرف ریڈیائی لہروں اور ہمارے ہاں ایٹم بم کی ٹیسٹنگ کے نتائج کی فکر ہے۔'' آدمسکی کے حامیوں نے فوراً اس کے دعوے کا یقین کر لیا۔ تاہم ''فلائنگ ساسر میگزین'' (امہرسٹ پریس' امہرسٹ' وسکانسن) کے رے پامر کو یقین ہے کہ آدمسکی فراڈ ہے۔ ''وہ ۱۹۴۰ء میں میرے پاس ایک کتاب کا مسودہ لے کر آیا تھا۔'' پامر نے حال ہی میں بتایا۔ ''اس وقت میں 'امیزنگ اسٹوریز' میگزین کا ایڈیٹر تھا۔ اس کتاب میں حضرت یسوع مسیح کی اڑن طشتری میں زمین پر واپسی کا تذکرہ تھا۔ پامر نے وہ مسودہ واپس کر دیا۔'' میں نے آدمسکی سے کہا کہ حضرت یسوع مسیح کو ایک خلائی انسان کے روپ میں بیان کرنے پر عیسائی اور یہودی دونوں مشتعل ہو جائیں گے۔'' پامر نے بتایا'' جب آدمسکی کی وہ کتاب چھپی تو میں نے دیکھا کہ اس نے حضرت یسوع مسیح کی جگہ وینس کا خلائی آدمی لکھ دیا تھا۔'' آدمسکی کے دعوے' چاہے غلط ہوں یا صحیح' اہراموں اور اڑن طشتریوں کے رابطے میں دلچسپی پیدا ہونے کا باعث بنے۔ ''یہ اہرام ہمارے خلائی بھائیوں کے نشانیاں ہیں'' آدمسکی نے اپنے پیروکاروں سے کہا۔ ''یہ کائناتی شعور کی نمائندگی کرتے ہیں جسے ایک دن دنیا کا ہر شخص سمجھ لے گا۔'' آدمسکی نے کہا۔ ''ایک اڑن طشتری اہرام کے اندر چھپی ہوئی ہے جب دنیا اس قابل ہو جائے گی تو ہم ان کمروں میں پوشیدہ رازوں کو دریافت کر لیں گے۔''

آدمسکی کا دعویٰ ہے کہ پوشیدہ سرنگیں اور خفیہ کمرے صدیوں سے میڈیمس (Mediums)

(وہ لوگ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مردوں کی روحوں سے گفتگو کر سکتے ہیں) سائی ککس (غیب بین) اور صوفیوں کا موضوعِ سخن رہے ہیں۔ جب انسانیت 'سچے نطق' کو وصول کرنے کے قابل ہو جائے گی تو خفیہ کمروں کا راز آشکار ہو جائے گا۔ اڑن طشتریوں سے رابطہ قائم کرنے والے اکثر لوگ بھی اسی خیال کے حامل ہیں تاہر بشریات جارج ہنٹ ویلیمسن پچاس کی دہائی کے ابتدائی زمانے میں اس دعوے کی تکرار کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''عظیم اہرام کے معماروں نے اپنا ایک خلائی جہاز اس عمارت کے قریب دفن کر دیا تھا۔ بلاشبہ اب یہ بات جلد ہی ظاہر ہونے والی ہے کہ عظیم اہرام میں خفیہ کمرے ہیں اور اس کا اصل داخلی دروازہ اس خاموش چیز کے نیچے پوشیدہ ہے جو شیر کی طرح ہوتے ہوئے بھی ایک انسان کی طرح ہے (یعنی میمون (Sphinx) غزہ کے اہرام کے قریب دیو ہیکل مجسمہ جس کا دھڑ شیر کا اور چہرہ عورت کا ہے) اب یہ مجسمہ زیادہ عرصے تک خاموش نہیں رہے گا۔''

ایک اور اڑن طشتری کے رابطہ کار نے اسی قسم کا دعویٰ کیا تھا۔ کیر نے' نیبر اسکا کے مویشیوں کے ایک تاجر این ہولڈ شمٹ نے اڑن طشتری کے جرمن بولنے والے ایک سوار سے مبینہ رابطے کا دعویٰ کیا تو اس کے ہاتھ میں اسٹیٹ مینٹل ہاسپٹل کا یک طرفہ ٹکٹ تھما دیا گیا۔ نفسیاتی معائنے کے بعد اسے ہاسپٹل سے رخصت کر دیا گیا اور چند ہفتوں بعد وہ مشنریوں میں اپنے تجربات کے بارے میں لیکچر دیتا پھرا۔ شمٹ کے دعوے کے مطابق ۹/ فروری ۱۹۶۰ء کی رات اسے ایک اڑن طشتری میں دنیا کے گرد خلاء کی سیر کرائی گئی۔ قطب شمالی' روس اور کئی دوسرے ممالک پر سے پرواز کرتے ہوئے' شمٹ کے دعوے کے مطابق وہ لوگ مصر پہنچے جہاں شمٹ کو اہراموں کے خفیہ کمروں کی سیر کرائی گئی۔ یو ایف او والوں نے شمٹ کو وہ اصل صلیب دکھائی جس پر حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کیا گیا تھا۔ اسے موٹے موٹے کاغذوں جیسی بتیس تختیوں کا معائنہ کرنے کی بھی اجازت دے دی گئی جو کسی قدر گہرے رنگ کی تھیں۔ ''آپ میری حیرت کا اندازہ نہیں کر سکتے جب میں نے دیکھا کہ ان تختیوں پر ماضی' حال اور مستقبل کے واقعات لکھے ہوئے تھے اور جدید انگریزی زبان میں' سیاہ روشنائی میں اور بڑے بڑے حروف والی صاف ستھری تحریر میں لکھے ہوئے تھے۔'' ان نسخوں میں لکھا ہوا تھا ''زمین کا موجودہ دور ۱۹۹۸ء میں ختم ہو جائے گا۔'' ایک اور یو ایف او رابطہ کار (Contactee) نے اہراموں کے راز کو ذرا زیادہ سائنسی انداز میں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مسٹر جی ایل نیبر اسکا یونیورسٹی کا ایک ستائیس سالہ طالب علم تھا۔ کرسمس کی چھٹیوں میں وہ اپنے گھر اوماہا جا رہا تھا۔ یونیورسٹی لاء اسکول کے طالب علم کی حیثیت سے اس کا منصوبہ ایک رات کار میں لنکن جانے اور مڈٹرم امتحان کی تیاری کرنے کا تھا۔ ''یہ ۲۵/ دسمبر کی رات کی بات ہے۔'' اس نے بتایا ''میں اب بھی جب اپنے اس تجربے کے بارے میں بات کرتا ہوں تو کسی قدر نروس ہو جاتا ہوں۔'' جی ایل نے تسلیم کیا۔ ''میں اس وقت بین الریاستی ہائی وے پر لنکن کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے ایک موڑ کاٹا اور ہائی وے پر اوپر جاتی ڈھلان پر کار دوڑائی پہلی بات جو میرے ذہن میں آئی وہ یہی تھی کہ آگے ایک اڑن

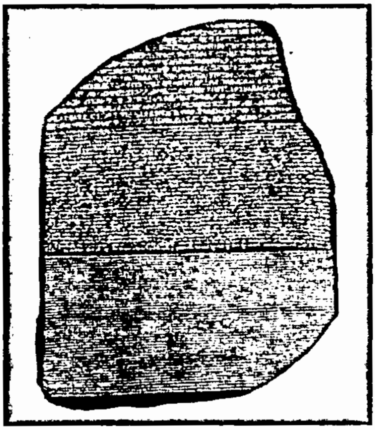

روزیٹا اسٹون: روزیٹا پتھر کو ۱۷۹۹ء میں ڈھونڈا گیا جس پر تین خط رقم ہیں نچلے حصے میں یونانی رسم الخط ہے درمیان میں عوام کے روزمرہ زندگی کا مصری خط رقم ہے جو جدید یونانی زبان سے مشابہ ہے اور سب سے اوپر ہیروغلافی خط ہے جس میں دوسری صدی قبل مسیح میں حکومت کرنے والے یونانی بادشاہ بطلیموس پنجم کی تحریر بھی تھی جس کی وجہ سے ہیروغلافی کے خط کا ترجمہ کرنا آسان ہوگیا اس طرح قدیم مصر کی تاریخ واضح ہو کر سامنے آگئی۔

طشتری تھی اور دوسری بات یہ آئی کہ میں اس میں سیر کرنے والا تھا اور آخری پیغام جو میں نے اپنے دماغ میں محسوس کیا وہ یہ تھا کہ میرے علم میں اضافہ ہونے والا تھا۔"

"بہت خوب!" جی ایل چلایا۔ "اس لمحے جب یہ پیغامات میرے دماغ میں آئے میں نے گویا ٹاپ گریڈ حاصل کرلیا۔ آگے تقریباً چوتھائی میل دور' ہائی وے کے دائیں جانب' ایک بہت تیز روشنی دکھائی دی۔ میں نے سمجھنے کی کوشش کی کہ یہ کیا چیز ہو سکتی تھی۔ میرے خیال میں یہ کوئی ہوائی جہاز ہو سکتا تھا اور امید تھی کہ ابھی مجھے اس کی سرخ' نیلی اور سبز بتیاں دکھائی دینے لگیں گی۔ روشنیاں اب بھی ہائی وے پر لہرا رہی تھیں مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا چیز تھی۔ جتنا میں روشنی کے قریب ہوتا گیا اتنی ہی میری الجھن بڑھتی رہی۔" جی ایل نے اپنی کار کو بریک لگائے اور سڑک کے ایک جانب کار روک دی۔ "میں نے انجن بند کیا' کار سے نکلا اور روشنیوں کی طرف دیکھا۔" اس نے بتایا "مجھے یاد ہے ہوا کا ایک تیز جھونکا مجھ سے ٹکرایا تھا۔ ایک تیز اندر تک گھس جانے والی بھنبھناہٹ سنائی دی۔ ایک دو سیکنڈ بعد میں براہِ راست اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر جیسے میں نے پلکیں جھپکائیں۔ اس جھپکی کے دوران میں' مجھے ایک دھاتی شئے دکھائی دی۔ وقت بھی اچانک ہی کچھ آگے کھسکتا محسوس ہوا۔ روشنی کے گرد ایک سفید ہالا سا بنا ہوا تھا۔ میرے خیال میں یہ جہاز کے گرد ہوا کا آیونائزیشن تھا۔"

جی ایل واپس اپنی کار میں بیٹھا' روشنی کا تعاقب کرنے کا سوچا پھر خیال بدل دیا اور لنکن میں اپنے اپارٹمنٹ میں آگیا۔ "میں جب اوماہا سے نکلا تھا اس وقت دس بج رہے تھے اور خبریں نشر ہو رہی تھیں۔" اس نے بتایا۔ "میں لنکن میں اپنے اپارٹمنٹ میں آیا۔ آئس باکس سے بیئر کا ایک ڈبا نکالا اور کلاک میں الارم سیٹ کر دیا۔ مجھے یاد ہے اس وقت گھڑی میں بارہ بجنے میں دس منٹ تھے۔ میں تھک گیا تھا اس لیے میں نے بیئر پی اور سو گیا۔" کئی دن بعد جی ایل کو احساس ہوا کہ اس روز کار میں اوماہا سے لنکن آنے میں اسے ایک گھنٹہ پچاس منٹ لگے تھے۔ "اتنا وقت تو نہیں لگنا چاہئے تھا۔" اس نے

وضاحت کی۔ ”کچھ جسمانی اثرات بھی محسوس کر رہا تھا۔“ پہلی بات تو یہ کہ میں سورج کی تمازت کے اثرات محسوس کر رہا تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ نیبراسکا میں اس وقت سردی کا موسم تھا۔ میری جلد پر بھورے پن کی جھلک تھی اور میرے رخسار پر دھبے سے بھی پڑ گئے تھے۔ مگر چند روز بعد جلد صاف ہو گئی تھی۔ جس رات وہ روشنی دیکھی تھی اس کی صبح میری آنکھیں بھی جل رہی تھیں۔ میں اپنے اندر ایک عجیب سی بے چینی بھی محسوس کر رہا تھا۔ یوں سمجھ لیں جیسے میری زندگی اتھل پتھل ہو کر رہ گئی تھی۔“ اس عرصے میں جی ایل کی زندگی کی اقدار کے بارے میں تصور میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔ ”میرے بنیادی نظریات میں اپنی تہذیب‘ اپنے معاشرے کے ساتھ تعاون شامل تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”لیکن اب میں عالمی اقدار کو زیادہ اہم سمجھنے لگا تھا۔“ یہ بات سمجھنے میں بھی جی ایل کو کافی دن لگے کہ شاید وہ یو ایف اوز کا خاموش رابطہ کار رہا ہو۔ یو ایف اولوجی کی زبان میں ’خاموش رابطہ‘ ایک خاص اصطلاح ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے یو ایف اوز کو دیکھا ہے‘ اکثر چند منٹ یا گھنٹوں کے گم ہو جانے کی شکایت کرتے رہے ہیں۔ ”میں نے ایش لینڈ‘ نیبراسکا کے ایک پٹرول مین کا قصہ سنا تھا کہ اس نے ایک یو ایف او دیکھی تھی اور اس کی زندگی کے تیس منٹ گم ہو گئے تھے۔“ جی ایل کہہ رہا تھا ”اس بات نے مجھے اپنے اوماہا سے لنکن تک کے سفر کے دورانیہ کو ٹٹولنے پر راغب کیا۔ اس سفر میں پچاس منٹ سے زیادہ نہیں لگنے چاہئے تھے اور میں ایک گھنٹہ پچاس منٹ میں لنکن پہنچا تھا۔ اس طرح گویا میری زندگی کا پورا ایک گھنٹہ کہیں گم ہو گیا تھا۔ میں خوفزدہ ہو گیا پتا نہیں اس ایک گھنٹے میں مجھے انہوں نے کس طرح استعمال کیا ہو گا۔“ جی ایل کو یقین تھا کہ اس ایک گھنٹے میں ضرور اس سے کوئی کام لیا گیا تھا۔ ”ایک گھنٹہ گم ہو جانے کا احساس ہوتے ہی میں عملِ تنویم سے گزرا۔“ جی ایل نے بتایا۔ ”ان نشستوں کے دوران میں کچھ باتیں میرے ذہن کی تہوں سے باہر آئیں۔ پھر اس رات کے بارے میں زیادہ غور و فکر کرنے پر مجھے اور بہت سی باتیں یاد آگئیں۔“ جی ایل نے جب دوسرے رابطہ کاروں سے میرے کام کے بارے میں سنا تو وہ میرے پاس آگیا۔ ”ایک رابطہ کار کو غیر معمولی حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میرے خیال میں اسے طویل مشاہدے کے تحت رکھ کر اس کے رویوں‘ خیالات اور نظریات کے بارے میں جاننا چاہئے اور پھر دیکھنا چاہئے کہ کیا اس کے خیالات‘ اس کی سوچ میں کوئی ربط ہے یا اس کی ساری توانائیاں صرف ایک ہی نقطہ پر مرکوز ہیں۔ اگر سارے رابطہ کاروں کے تجربے کے نتیجے میں کوئی ایک بات سامنے آتی ہے تو اس سے یو ایف اوز کے مقاصد کے بارے میں کسی قدر اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے رابطہ کاروں کے اذہان میں کوئی خاص بات بٹھا دی ہو یا سب کو کسی ایک خاص تجربے سے گزارا ہو۔ ہم اسی بات کی تلاش میں ہیں۔“

یو ایف اوز کے تجربے کے بعد جی ایل نے قانون کی تعلیم ترک کر دی۔ ایک دوسرے کالج میں داخلہ لیا اور فلسفے کی ڈگری حاصل کر لی۔ اس وقت وہ ایک کارپوریشن سے منسلک ہے۔ ”قدیم سائنس اور اہراموں کے بارے میں میرے خیالات میں بتدریج وسعت آنے لگی۔“ اس نے بتایا۔ ”یہ بات اس

وقت سے ہونے لگی تھی جب میرے ذہن میں اچانک ہی ایک نام آیا تھا۔ یولیکس پنجم۔ اس نام کا تعلق اس رات کے مشاہدے سے بڑا گہرا تھا۔'' جی ایل کو یقین ہے کہ مصر کے اہرام انسانی وجود کی کنجی ہیں۔ اس کتاب کے لیے ایک مضمون میں وہ لکھتا ہے ''ایٹم 'ایٹم' ایٹم۔ اس صدی میں یہ لفظ کس نے بار بار نہیں سنا مگر کون کہہ سکتا ہے کہ اس لفظ کی ابتداء کیا ہے' ماخذ کیا ہے۔؟ بہت سارے قاری کہہ سکتے ہیں کہ ڈالٹن نے جو ایک خود آموختہ شخص تھا اور کبھی کبھی اسکول میں بھی پڑھایا کرتا تھا' اس لفظ ایٹم کو سب سے پہلے استعمال کیا تھا۔ اس نے اپنے شاگردوں سے اس کی وضاحت کی تھی کہ کائنات ایسے ذرات سے مل کر بنی ہے جنہیں نہ تقسیم کیا جا سکتا ہے اور نہ تباہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے لوگ جو ایٹم کی تاریخ سے کسی قدر واقف ہیں' کہتے ہیں کہ یہ یونانی زبان کا لفظ ہے۔ ''یاد رکھیں۔'' وہ کہتے ہیں۔ ''یہ لیوسی پس اور ڈیموکریٹس (Damocritus) تھے جنہوں نے سب سے پہلے بتایا تھا کہ یہ دنیا چھوٹے چھوٹے اجسام سے بنی ہوئی ہے جنہیں ایٹم کہا جاتا ہے۔'' جو لوگ اس تشریح سے مطمئن ہیں وہ اپنی معلومات میں اضافہ کر سکتے ہیں کیونکہ اتفاق سے ''مردوں کی مصری کتاب'' "Egyptian Book Of The Dead" پڑھتے ہوئے یہ پیراگراف میری نظر سے گزرا تھا۔ آپ کی بھی نذر ہے: ''میں آسمانی وسعتوں کا خدا ہوں۔ میں نے وقت اور شکل تخلیق کیے ہیں۔ اس وقت جب خلاء ایک بے کراں مائع کی طرح وسیع تھی مجھے کسی نے تخلیق نہیں کیا کیونکہ میں ہر شئے کے وجود سے قبل تخلیق کیا گیا تھا۔ ساحرانہ قوت کی وساطت سے ان تمام لوگوں کے لیے جنہیں میں نے نام دیا تھا' میں نے ایک آسمانی نظامِ مراتب ترتیب دیا اور ایک الوہی مادہ بنایا جو خود کار تخلیق کی صفت کا حامل تھا۔ میں ''اے ٹم'' Atum ہوں۔ میں وہ ہوں جو ابتدائے آفرینش کہلاتا ہے اور میں وہ ہوں کہ جب یہ سب کچھ اپنے اختتام کو پہنچے گا تو ایک عظیم تابوت میں دفن ہو جائے گا۔'' آپ دیکھیں گے کہ Atum اور Atom کے لہجے میں تو ضرور فرق ہے مگر ان کا تلفظ ایک ہی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی کچے ہجے والے نے Atom کو Atum لکھ دیا ہو۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس پیراگراف کا مطلب کیا ہے؟ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ Atum کی شخصیت کا تعلق خلائی وقت کے نظریے اور ایک ایسے مادہ کے وجود سے ہے جو زندگی سے محروم تھا آج ہم Atom کے بارے میں اسی انداز میں سوچتے ہیں کہ خلائی وقت مادی دنیا میں منٹ کی اکائی پر مبنی ہے اور اس کی کوئی زندہ شکل نہیں ہے۔ یہ بنیادی کیفیت ہمارے ہم عصر

جین فرانکوئز شیمپولین: فرانسیسی ماہر آثار قدیمہ۔ شیمپولین نے دریائے نیل کے مغربی کنارے سے دریافت کردہ بسالٹ کی چٹان روزیٹا کی تحریر پڑھنے میں کئی سال صرف کر دیے اور بالآخر قدیم مصر کے خط ہیروغلافی کا ترجمہ کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کی وجہ سے فرعونوں اور اہرام کی تصویر سامنے آگئی۔

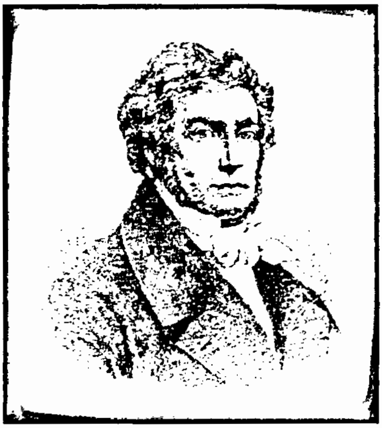

سائنس دانوں کے نزدیک مادی وجود کی ابتداء ہے۔اس قدیم ایٹمی فلسفے سے "نمود بہ مقابلہ وجود" کے نظریے کا گہرا تعلق ہے۔یونانیوں کا ایک گروہ دعوے دار تھا کہ حقیقت صرف وہی ہے جسے آدمی اپنی تمام ترحسیات (Senses) کے ذریعے تجربے کی کسوٹی پر پرکھ سکے۔ اس نظریے کے پرچارک "سوفسٹ"(Sophists) کہلاتے ہیں۔"ظہور"(Phenomena) کے نظریے کو مقبول بنانے میں ہم ان لوگوں کے رہینِ منت ہیں۔'ظہور' کے معنی 'وہ جو ظاہر ہو' کے ہیں۔ وہ لوگ جو ظہور پر یقین رکھتے ہیں انہیں "Sophisticated" سوفسطائی کہا جاتا ہے۔طنزاً سوفسطائی اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ظاہر پر یقین رکھتا ہے۔وہ چیز جو ان کی عقل کی گرفت میں آسکے۔ یہ لوگ دنیاوی معاملات میں بڑے کائیاں ہوتے ہیں۔افلاطون' اس نظریے کا سب سے بڑا مخالف' کہتا ہے کہ اصل وجود نظریاتی صورت میں بقا کا حامل ہوتا ہے جو خود کو فطری ظہور میں بھی ڈھال سکتا ہے مگر یہ حسی صفات سے ماوراء ہوتا ہے۔ افلاطون کے نزدیک دوراستے ہیں جن کے ذریعے علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ایک وجدانی (روحی) راستہ جو موجود اشکال کو ظاہر کرتا ہے اور دوسرا تجرباتی راستہ جو حسیات کے استعمال سے موجود اشکال کی حقیقت ظاہر کرتا ہے۔ اس کی مثال افلاطون نے اپنی کتاب Republic میں "Allegory Of The Cave" کے عنوان سے یہ تشریح بیان کی ہے چونکہ جدید سائنس نے اپنے فہم کے لیے سوفسطائی طریقہ اختیا کرر کھا ہے اس لیے میں اس کے مزید مطالعے کو اپنے قارئین پر ہی چھوڑتا ہوں۔ان کی اپنی صفات ہوں گی اپنی حدود ہوں گی اور چونکہ میں حقیقت کے ادراک کے سلسلے میں ایک مختلف نظریے کا حامل ہوں اس لیے میں ان کی ترجمانی کے فرائض انجام نہیں دے سکتا۔اس کے برخلاف میں اپنے فہم وبصیرت کے لیے افلاطونی نظریے کا پیروکار ہوں اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ وجود اس سے کہیں زیادہ اہمیت و صفات کا حامل ہے جتنا ہم محض جو اس کے ذریعے اس کا ادراک کر سکتے ہیں۔

☆

قدیم مصری اور موت

ٹیلی ویژن والے پرانی موویز کے سلسلے میں کبھی کبھار اپنے ناظرین کو ڈرانے کے لیے خوف ناک فلمیں دکھاتے ہیں۔ فرینکن اسٹین کی مووی دیکھ کر ہمارے دل میں دیوتا یا تخلیق کار ہونے کی خواہشیں انگڑائیاں لینے لگتی ہیں۔ وولف مین ہمارے اندر پوشیدہ سفلی اور حیوانی جذبات کے خلاف جنگ کی علامت ہے۔ ممی (Mummy) بھی محض دہشت ہے ان لوگوں کے لیے جو قدیم مصری مقبروں کو کھنگالتے ہیں اور ان کی ابدی آرام میں خلل کا باعث بنتے ہیں۔

علمائے اسرار کا کہنا ہے کہ ممی کے خوفناک انتقام کی داستانوں میں بہر حال کچھ نہ کچھ حقیقت ہے۔ ۱۹۱۶ء میں ایک غیر معمولی واقعہ ہوا تھا جس کا تعلق مصر کی "شاہوں کی وادی" (Valley of the Kings) میں واقع توتخ آمن کے مقبرے سے تھا۔ ماہر اثریات (Archaeologist) ہاورڈ کارٹر دوپہر کا کھانا کھا کر ذرا دیر آرام کرنے لیٹا تھا کہ تیز اندر تک اتر جانے والی کراہوں نے اس کے مکان کے خاموش پر سکون ماحول کو منتشر کر دیا۔ کارٹر اس وقت ایسے مہم جویوں کی ٹیم میں شریک تھا جنہیں توقع تھی کہ وہ کسی قدیم فرعون کا زیرِ زمین مدفن تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ کراہیں سن کر اس نے آنکھیں کھولیں تو اچانک ایک جھریوں بھرے چہرے والا عرب اپنے ڈھیلے روایتی چوغے میں ملبوس اس کے کمرے میں گھس آیا۔ مدقوق سا اخروٹی رنگ جلد والا بوڑھا عرب بری طرح ہانپ رہا تھا۔ "آفندی" وہ جوشیلے انداز میں ہاتھ لہراتا ہوا بولا۔ "میں ہر ممکن تیزی سے دوڑتا ہوا آیا ہوں۔ قبروں کے ڈاکو پھر لوٹ مار پر تلے ہوئے ہیں۔ ان بدبخت چوروں کے دو گروہوں میں قدیم قبروں سے نکلنے والے سامان کو حاصل کرنے پر جنگ ہو رہی ہے۔ جیتنے والا گروہ زمین کھود کر مقبرے میں گھس جائے گا اور سارا مال سمیٹ لے گا"۔ اس دن کے واقعات کو ہاورڈ کارٹر بعد میں لکھتے ہوئے کہتا ہے: "سہ پہر ہو چکی تھی میں نے جلدی جلدی اپنے چند کارندوں کو جو آرمی لیبر لیویز کے مفرور سپاہی تھے، ساتھ لیا اور ضروری سامان اور آلات لے کر جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ اس مہم کے لیے ہمیں اٹھارہ سو فٹ بلند کرنا پہاڑی پر چڑھنا تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو رات آدھی گزر چکی تھی۔ چاند کی روشنی میں گائڈ نے ایک رسے کی طرف اشارہ کیا جو چوٹی سے بندھا نیچے کی طرف لٹک رہا تھا۔ غور سے سننے پر ایسی آوازیں سنائی دینے لگیں جیسے ڈاکو واقعی زمین کھودنے میں مصروف ہوں۔ سب سے پہلے تو میں نے ان کا وہ رسہ کاٹ ڈالا جو انہوں نے اپنی واپسی کے لیے لٹکا رکھا تھا۔ پھر میں نے اپنا مضبوط رسہ باندھ کر نیچے لٹکا دیا۔ اس رسے کے ذریعے میں چوٹی سے نیچے اترا۔ چاندنی راتوں میں مقبروں کی کھدائی کر کے ان میں دفن مال لوٹنا وہاں کے ڈاکوؤں کا عام شغل تھا۔ میں جب وہاں پہنچا تو آٹھ آدمی بڑی تندہی سے کھدائی میں مصروف تھے۔ مجھے دیکھ کر سب ساکت ہو گئے۔ میں نے ان کے سامنے تجویز

پیش کی کہ اگر وہ چاہیں تو میرے رسے کے ذریعے واپس جا سکتے ہیں ورنہ پھر میں چلا جاتا ہوں اور وہ سب وہیں پڑے رہیں گے کیونکہ ان کے فرار کا رستہ میں پہلے ہی مسدود کر چکا تھا۔ کچھ دیر سوچ بچار کے بعد انہوں نے وہاں سے خاموشی سے چلے جانے کو ترجیح دی۔ ان کے جانے کے بعد میں نے باقی رات وہیں گزار دی۔"

یہ آٹھوں افراد ایک ایسے گاؤں کے رہنے والے تھے جس پر کبھی عبدالرسول کی حکمرانی تھی جو مصری روایات میں مدفون خزانوں کو لوٹنے کے سلسلے میں خاصی شہرت کا حامل تھا۔ ان بد قسمت چوروں کو فرار ہوتے وقت مصری پولیس نے گرفتار کر لیا اور فوری انصاف کے تحت انہیں سولی پر چڑھا دیا گیا۔ ایک انگریزی اخبار نے لکھا: "وہ بادشاہ توتخ آمن کے مقبرے کی بددعا کے پہلے شکار تھے۔" شاہوں کی وادی کا یہ سحر زدہ راستہ سیدھا توتخ آمن کے مقبرے تک جاتا تھا۔ فرعون کے مدفن کے دروازے تک پہنچنے کے لیے پتھروں، چٹانوں اور دیگر کھنڈرات اور رکاوٹوں کو ہٹانے میں مزدوروں کو برسوں لگ گئے تھے۔ پھر بڑی احتیاط سے دروازہ کھولا گیا اور مہم کے دوسرے لیڈروں کے ساتھ ہاورڈ کارٹر ایک سرنگ سے گزرتا ہوا مقبرے میں جا پہنچا۔ "کیا یہاں کچھ ہے؟" لارڈ کارناروان نے پوچھا۔ ہاورڈ کارٹر نے اپنی ٹارچ کی روشنی چاروں طرف ڈالی۔ "یہ جگہ تو نوادرات سے بھری ہوئی ہے۔" اس نے بتایا۔ کارٹر کی ٹارچ کی روشنی میں کئی سنہرے دیوان دکھائی دیئے۔ ایک ہیرے جواہرات سے جڑا ہوا تخت تھا۔ سونے کے بے شمار مجسمے تھے دو سونے کے متبرک ظروف تھے جن کی شکلیں سانپوں جیسی تھیں۔ ان کے علاوہ مقبرے کی دیواروں پر کئی بددعائیں تحریر تھیں۔ "جو کوئی بھی فرعونوں کے آرام میں خلل کا باعث ہوگا موت اپنے پروں کو تیزی سے پھڑپھڑاتی ہوئی انہیں دبوچ لے گی" ایک دیوار پر یہ تحریر سونے کے حروف میں لکھی ہوئی تھی۔ ایسی ہی اور بددعائیں چمڑے کے ٹکڑوں پر سونے کی تکیاؤں پر لکھی ہوئی دیواروں پر چسپاں تھیں۔ ان کے ساتھ ساتھ دیواریں سونے کے مقدس بھونروں اور قدیم مصری مقدس علامات سے سجی ہوئی تھیں۔ ان عظیم اثری دریافتوں کی داستانوں کے بارے میں چھپی ہوئی خبروں کی روشنائی خشک بھی نہیں ہوئی تھی کہ اخباری نمائندوں اور خبروں کے بھوکے ایڈیٹروں نے "ممی کی بددعا" اور "فرعونوں کا قہر" کے نام سے بلندوں کے بلندے شائع کرنے شروع کر دیئے۔ فرعونوں کے مقبروں کی کھدائی کے خوفناک نتائج کے بارے میں خوفناک پیش گوئیاں کر کر کے اخبارات نے اپنے قارئین کے وسیع حلقے میں سنسنی اور ہیجان سا پیدا کر دیا۔ اور جب ٦ اپریل ١٩٢٣ء کو لارڈ کارناروان صرف تین ہفتے بیمار رہ کر مر گیا تو فرعونوں کے قہر کی داستان زبان زد عام ہو گئی۔ لارڈ کو ایک کیڑے نے کاٹ کھایا تھا اور پھر وہ جاں بر نہ ہو سکا۔ "بیس سے زیادہ افراد جو کسی نہ کسی طرح اس مشہور مقبرے کی کھدائی سے منسلک تھے یکے بعد دیگرے پراسرار اموات کا شکار ہو گئے" سی ڈبلیو سیرام نے اپنی کتاب "دیوتا" قبریں اور محقق: داستان اثریات" نامی کتاب میں لکھا اور قارئین کو حیرت و خوف میں مبتلا کر دیا۔ ان پراسرار اموات کا اثر یہ ہوا کہ جب انتہائی دقیانوسی قسم کے ماہر مصریات کے سامنے بھی اگر کوئی شخص توتخ آمن بادشاہ کے مقبرے کی بددعا کا تذکرہ کرتا

تو وہ بھی کپکپا کر رہ جاتا۔ وہ انگریز جو ہاورڈ کارٹر کا سیکریٹری تھا جب ایک بالکل صحت مند اور خوش باش رات اپنے بستر پر سویا تو پھر صبح اس کی لاش ہی مل سکی تھی۔ کارونر کے بیان کے مطابق اس کی موت کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ لارڈ ویسٹ بری بھی جو اس مہم سے منسلک تھا اور جو انگلینڈ کی ایک انتہائی ممتاز شخصیت تھا ایک دن اپنے مکان کی ساتویں منزل کی کھڑکی سے باہر کود کر جان گنوا بیٹھا۔ اے سی میک جو ہاورڈ کا شریک کار تھا اور توتخ آمن کے مقبرے کی کھدائی میں بڑا فعال تھا چند روز بعد اچانک ہی انتقال کر گیا۔ اس کھدائی سے منسلک افراد کے رشتے دار بھی اس قہر سے نہیں بچ سکے تھے۔ آبری ہربرٹ نے جو لارڈ کارناروان کا سوتیلا بھائی تھا' چند روزہ پاگل پن کے بعد خودکشی کر لی۔ فروری ۱۹۲۹ء میں ایک اور پراسرار موت نے دنیا کو حیرت زدہ کر دیا۔ لیڈی الزبتھ کارناروان ایک کیڑے کے کاٹنے سے عجیب و غریب بیماری میں مبتلا ہو کر مر گئی۔ اس کی موت کی خبروں کے ساتھ مصر کے مقدس بھنورے کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ سات سال کے اندر اندر بیس سے زیادہ افراد جنہوں نے توتخ آمن کے مقبرے کی کھدائی میں حصہ لیا تھا اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

۲۹ مارچ ۱۹۳۷ء کو اسکاٹ لینڈ کے ایک معزز آدمی سر الیگزینڈر سیٹن نے ایک پریس کانفرنس بلوائی اور اعلان کیا کہ وہ ایک نقرئی ہڈی مصر واپس پہنچا کر آرہا ہے۔ "یہ ہڈی کسی قدیم فرعون کی ہے۔" سیٹن نے کہا: "میری بیوی کو یہ ہڈی مصر میں ملی تھی اور وہ اسے یادگار کے طور پر ساتھ لے آئی تھی۔ اس نادر شئے کی وجہ سے ہمارے گھر میں عجیب و غریب واقعات ہونے لگے ہیں۔" سر الیگزینڈر نے بتایا "ہڈی آنے کے بعد سے ہمارے گھر میں ایک سرپوش بھوت نظر آنے لگا ہے۔ گھر میں آنے والے مہمان کثرت سے اس کی شکایت کرنے لگے ہیں"۔ اس کے خوف سے ہمارے ملازم بھی بھاگ گئے ہیں۔ گھر کی ملازمائیں روزانہ اسے دیکھنے کی شکایت کرنے لگی ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی واقعات ہوئے تھے جن کی وجہ سے سر الیگزینڈر اور لیڈی ایسٹن دونوں بہت ہی پریشان تھے۔ "گھر میں بلا سبب دو مرتبہ آگ لگ چکی ہے" اس نے اخباری نمائندوں کو بتایا۔ "رات میں الماری میں سے شیشے کے برتن گرتے ہیں اور ٹوٹ جاتے ہیں۔" "کہیں یہ آپ کا واہمہ تو نہیں ہے؟ ایک شکی مزاج اخباری نمائندے نے سوال

زرو جواہر سے تراشا ہوا مقدس بھنورا۔ اس تصویر میں جو مورتی دکھائی گئی ہے وہ سورج دیوتا کی علامت ہے جس کے اوپر عام طور پر اسٹیمپ کے طور پر علامت بنائی جاتی تھی جبکہ اندرونی خانے میں تصویری خط میں کوئی نہ کوئی واقعہ یا کہانی رقم کی جاتی تھی اس بڑے مقدس بھنورے میں فرعون آمن ہوتپ سوئم کی کہانی بیان کی گئی ہے جس نے اپنے دور میں ۱۰۲ شیروں کا شکار کیا۔

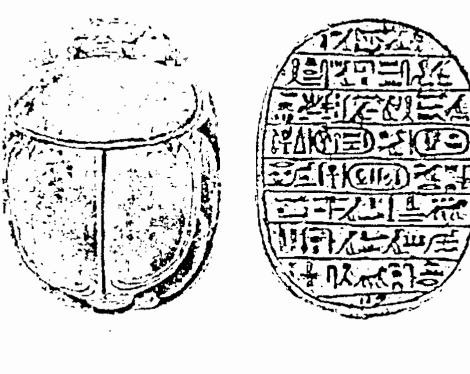

کیا۔ ''میں ایسا نہیں سمجھتا۔'' سر الیگزینڈر نے جواب دیا۔ ''ایک سرجن ٹیسٹ کرنے کے لیے وہ ہڈی مجھ سے مانگ کر لے گیا تھا۔ اس رات اس کی ایک ملازمہ سرپوش بھوت کو دیکھ کر ڈر کر بھاگی اور اپنی ٹانگ توڑ بیٹھی۔ ڈاکٹر دوسرے دن وہ ہڈی مجھے واپس دے گیا اور ہمارے گھر میں پھر سے وہی واقعات شروع ہو گئے۔'' لیڈی سیٹن ۱۹۳۶ء میں مصر کی سیاحت کے لیے گئی تھی تو غزہ کے قریب ایک مقبرے سے یہ ہڈی یادگار کے طور پر ساتھ لے آئی تھی۔ ''میں ایک سیدھا سادہ اسکاٹ مین ہوں۔'' سر الیگزینڈر نے کہا۔ ''میں مردوں اور روحوں کو بلانے والوں اور اس قسم کی دوسری خرافات پر یقین نہیں رکھتا لیکن میرے گھر میں ہونے والے ان عجیب و غریب واقعات نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔ لگتا ہے اس ہڈی سے کوئی بد دعا یا کوئی نحوست یا کوئی اور بلا منسلک ہے۔'' ''ہم اب مصر واپس جا رہے ہیں۔ میری بیوی اس ہڈی کو اسی مقبرے میں رکھ کر آئے گی جہاں سے اسے اٹھا کر لائی تھی۔'' سر الیگزینڈر کہہ رہے تھے۔ ''ہم اس ہڈی کو کسی اور کے ہاتھ بھیجنے کے بجائے خود وہاں جا رہے ہیں کہ یہ چیز یقینی طور پر واپس اپنی جگہ پہنچ سکے۔ اب یہ خوفناک باتیں ہماری برداشت سے باہر ہوتی جا رہی ہیں انہیں اب بند ہو جانا چاہیئے۔'' ایک اور نمائندے نے شرارت آمیز نظروں سے سر الیگزینڈر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ یہ نادر شے میرے ہاتھ فروخت کرنا پسند کریں گے؟'' دونوں میاں بیوی نے بیک وقت اپنے سر نفی میں ہلا دیئے۔ ''ہرگز نہیں۔'' ''ہم اس بدبخت ہڈی کی وجہ سے بڑی مصیبت میں مبتلا رہے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ کوئی اور اس کی وجہ سے ویسی ہی پریشانیوں میں سے گزرے جن سے ہم گزر رہے ہیں۔'' پریس کانفرنس کے بعد دونوں میاں بیوی مصر روانہ ہو گئے انہوں نے وہ نقرئی ہڈی غزہ کے مقبرے میں رکھ دی۔ فرعون کی پریشان کن بد دعا کا اثر ختم ہو گیا۔ سیٹن پھر اپنے گھر میں آرام و سکون سے رہنے لگے۔ ان کے گھر میں پھر وہ سرپوش بھوت کبھی نہیں دیکھا گیا۔ پھر یہ سب کچھ ایک ناخوشگوار یاد بن کر رہ گیا۔ ''میں یہ نہیں کہتا کہ میں ان باتوں کو سمجھتا ہوں۔'' سر الیگزینڈر نے کہا۔ ''میں صرف یہ جانتا ہوں کہ ایسا ہوا تھا۔ یقیناً دنیا میں ایسی غیر معمولی قوتیں اور طاقتیں ہیں جو ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔ میں بڑا شکر گزار اور مطمئن ہوں کہ اب وہ سب کچھ ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔''

۱۹۴۸ء میں پراسرار علوم کا ایک مال دار طالب علم جون جیمز نار تھ ویل پراسرار حالت میں موت کا شکار ہو گیا۔ اس کی ذاتی لائبریری میں اس موضوع پر تین ہزار سے زیادہ نادر کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ مسز مارگریٹ نارتھ ویل کا دعویٰ تھا کہ اس کے شوہر کی موت ایک ممی کے ہاتھ کی براہِ راست نحوست کا نتیجہ تھی۔ اس نے اپنے شوہر کی موت کی تفصیلات کے بارے میں اخبار میں ایک خط لکھا۔ وہ لکھتی ہے: ''۱۹۴۷ء تک ہم بڑی خوشی اور اطمینان سے رہ رہے تھے۔ غیر معمولی چیزوں کی تلاش کا شوق پورا کرنے کے لیے ہمارے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ اس موسم گرما میں ہم مصری اہراموں کی پراسراریت کی تحقیق کے لیے مصر گئے۔ جب ہم مصر میں تھے تو ایک بدو ہمارے پاس آیا اور ایک مصری شہزادی کا ممی شدہ ہاتھ ہمیں فروخت کرنے کی پیش کش کی۔ وہ عرب یقیناً قبروں کا چور تھا

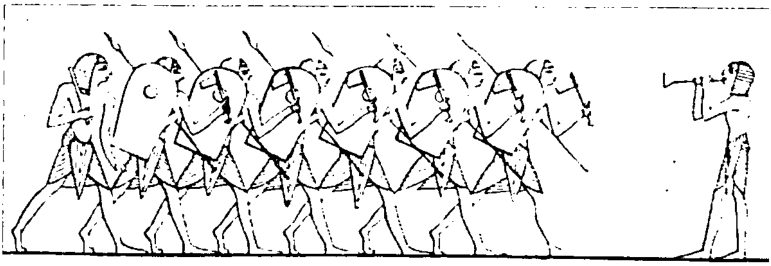

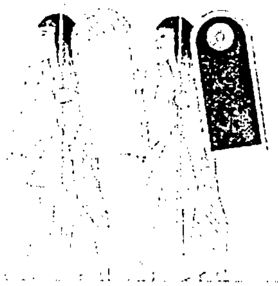

میدان جنگ میں بھاری اسلحے کے بجائے قدیم مصری لکڑی کی بنی ہوئی بڑی بڑی ڈھالیں استعمال کیا کرتے تھے ان کے ایک ہاتھ میں تیر اور دوسرے ہاتھ میں کلہاڑی ہوتی تھی اور میدان جنگ میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی شرکت کیا کرتی تھیں جنگ کا آغاز شہنائی بجا کر کیا جاتا تھا۔

تاہم لگتا تھا جیسے وہ اس ہاتھ کی تاریخ سے پوری طرح واقف تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ ہاتھ ایک مصری شہزادی کا تھا جو مینس (Menes) (پہلے فرعون) کے دور حکومت سے تعلق رکھتی تھی۔ ہم نے وہ خوفناک ہاتھ خرید لیا اور اس کے فوراً ہی بعد میرا شوہر بے خوابی کا مریض ہو گیا۔ بستر پر پڑنے کے بعد گھنٹوں بعد جا کر اس کی آنکھ لگتی اور جب اس کی آنکھ لگ جاتی تو وہ فوراً ہی گھبرا کر جاگ اٹھتا۔ وہ ایک خوفناک خواب دیکھتا تھا جیسے کوئی ہاتھ اس کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ کئی ماہ تک اس کی یہی کیفیت رہی اور پھر ایک رات وہ نیند کی حالت ہی میں چل بسا۔ ڈاکٹروں کے مطابق رات نیند کے دوران میں تکیوں کی وجہ سے اس کا دم گھٹ گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس ممی کے ہاتھ کی نحوست کا شکار ہوا تھا۔ میں نے اس منحوس ہاتھ کو تباہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اپنی لائبریری میں تیز آگ دہکائی اور وہ ہاتھ اس آگ میں پھینک دیا۔ اس ہاتھ کو مکمل طور پر جلنے میں تین گھنٹے لگے تھے۔ مجھے مصریوں کی ایک روایت یاد تھی کہ انسانی جسم کو قطع برید سے محفوظ رہنا چاہئے۔ اب میں ایک تعویز پہنے رہتی ہوں تاکہ اس منحوس ہاتھ کی بددعا سے محفوظ رہ سکوں۔'' اس خط کو لکھنے کے کچھ عرصے بعد مارگریٹ نارتھ ویل کا نیند کے دوران میں انتقال ہو گیا۔ کارونر کی رپورٹ کے مطابق موت دم گھٹنے کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔ ایک عام خیال یہ ہے کہ فنِ حنوط کاری ماضی کی پہنائیوں میں گم ہو چکا ہے۔ تاہم مصری طریقِ اموات کے ماہرین نے کچھ مسودات کو ڈی کوڈ کر کے معلوم کیا ہے کہ مصری ممی کیسے تیار کرتے تھے۔ سر ولیس بج ایک ممتاز ماہر مصریات نے اپنی کتاب ''دی ممی'' (مطبوعہ ۱۹۲۵ء لندن) میں فن حنوط کاری پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے وہ لکھتا ہے: ''یہ سوال ابھی حل طلب ہے کہ آیا فنِ حنوط کاری مصر کے قدیم باشندوں کا اپنا شاہکار تھا یا انہوں نے یہ فن ایشیا کے نوواردوں سے سیکھا تھا۔ یہ بات ہمیں یقینی طور پر معلوم ہے کہ آکسفورڈ میں

اس دور کے ایک اعلیٰ عہدے دار کی نقشین لوح محفوظ ہے جو تقریباً چار ہزار قبل مسیح میں دوسر۔
سلسلہ سلاطین کے پانچویں بادشاہ 'سینٹ' کے دور میں بنائی گئی تھی۔ اس نقشین لوح پر کندہ تصاویر ا
تحریر سے' جن میں دیوتا سے منت کی گئی ہے کہ مرنے والے کو اس کی لحد میں کھانوں کی کمی نہ ہو'
چلتا ہے کہ اس ابتدائی دور میں بھی قبروں اور مقبروں کا فن کس کمال تک پہنچ چکا تھا۔ جس شخص
لیے یہ لوح بنائی گئی تھی اس کا نام ''شیرا'' تھا اور اسے پیغمبر کا درجہ حاصل تھا اس نقشین لوح سے یہ
چلتا ہے کہ وہ 'سُوتن ریک' یعنی شاہی رشتے دار تھا۔

وہاں جو تحریریں نظر آئی ہیں ان میں ایسی دعائیں بھی شامل ہیں کہ دیوتا مرنے والوں کو اگلی دنیا
ہزاروں بیل عطا کریں' لینن کی پٹیاں دیں' کیک دیں' شراب سے لبریز صراحیاں دیں' خوشبو
دیں' وغیرہ وغیرہ۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی اعتقادات' تدفینی رسومات' مرنے کے ب
ایک اور زندگی پر یقین ان مصریوں کی زندگی کا ایک لازمی حصہ بن چکا تھا۔ بادشاہ سینٹ کے د
حکومت میں ایک طبی مسودہ مرتب کیا گیا تھا۔ یہ کام برسوں کے تجربات اور تحقیق پر محیط تھا جس
پتا چلتا تھا کہ مصریوں کو اناٹومی (علم تشریح الاعضاء) سے اس قدر واقفیت بہر حال تھی جو انسانی ج
کی حنوط کاری کے لیے لازمی تھی۔ پھر اگر ہم دیکھیں کہ مسودے اور دیگر ہم عصر یادگاروں سے ا
بادشاہ کے وجود کی تصدیق ہوتی ہے اور اس کے دورِ حکومت میں جو پادری تدفینی رسوم کے ذمہ
تھے ان میں سے چند ایک کے نام ہمارے علم میں آ چکے ہیں تو پھر ہمیں یہ جاننے میں ذرا بھی دق
محسوس نہیں ہوتی کہ وہ تدفینی رسوم کیا تھیں اور یہ بھی کہ وہ مرنے کے بعد جی اٹھنے پر بھی ی
یقین رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے مردوں کے اجسام کی بڑی حفاظت کرتے تھے اور بعد میں انہ
خفیہ مقامات میں دفن کر دیتے تھے۔

حالانکہ میرے علم میں کوئی اور ایسی یادگار اب تک سامنے نہیں آ سکی ہے یا دریافت نہیں ہو سکی۔
جیسی کہ سینٹ کے دور کی نقشین لوح جس سے یہ بات پایۂ یقین کو پہنچ جاتی ہے کہ حنوط کاری پ
سلسلۂ شاہی سے ہی شروع ہو چکی تھی۔ اس دور میں ممیاں بنائی جاتی تھیں اور مصری اناٹومی
ضروری علم سے واقف تھے جو حنوط کاری کے لیئے لازمی حیثیت رکھتا تھا۔ مانیتھو کے ذریعے ہمیں پتا
ہے کہ پہلے سلسلۂ شاہی کے دوسرے بادشاہ ٹی ٹانے ۴۳۶۶ قبل مسیح میں اناٹومی پر ایک کتاب لک
تھی اور ہر وقت دواؤں سے تجربات کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ اس بادشاہ کی ماں جس کا نام شیش
(Shesh) تھا ایک ہیئر واش (Hair Wash) ایجاد کرنے کے سلسلے میں مشہور تھی۔ کچھ قد
مصریوں کے اجسام جو ابتدائی چار سلسلہ شاہی کے ادوار سے تعلق رکھتے ہیں اپنے تابوتوں
ڈھانچوں کی شکل میں پائے گئے ہیں۔ یہ اجسام تقریباً چھ ہزار سال سے آج تک بند ہی پڑے تھے۔
حقیقت اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ مصر میں ابتدائی شاہی ادوار میں حنوط کاری کا رواج نہیں تھ
تاہم وہ جسم کی حفاظت کا کوئی اور طریقہ ضرور اختیار کرتے تھے کیونکہ ڈھانچوں کی ہڈیاں صحیح سلا
اور اصل رنگ پر تھیں اور ان میں سے بٹومین (تارکول یا رال) کی تیز بو آ رہی تھی۔ اپنے مردوں

ریم مصری جس طرح حنوط کیا کرتے تھے اس کا علم ہمیں یونانی مورخوں کی کتابوں سے اور ممیوں کے
تزیہ کرنے سے ملتا ہے۔ ہیروڈوٹس کے مطابق "جب کسی خاندان کا کوئی قابل ذکر آدمی مر جاتا تو اس
اندان کی ساری عورتیں اپنے سر اور منہ کو کیچڑ میں لت پت کر لیتیں اور مرنے والے کو گھر ہی میں
ھوڑ کر شہر میں نکل جاتیں۔ اپنے سروں کو پیٹتیں' سینے ننگے کر لیتیں' کپڑے پھاڑ لیتیں باقی رشتے دار
ن کے پیچھے پیچھے چلتے رہتے۔ اس کے بعد مرد یہی حرکت کرتے۔ جب یہ نوحہ بازی ہو جاتی تو پھر
ش کو حنوط کرنے کے لیے لایا جاتا۔ شہر میں مخصوص آدمی تھے جو یہ کام کرتے تھے۔ جب ان کے
س لاش کو لایا جاتا تو وہ ان لوگوں کو لکڑی کے پینٹنگ کیے ہوئے تابوتوں کے نمونے دکھاتے۔ پھر
ہ انہیں بتاتے کہ اس انداز میں لاش کو حنوط کرانے پر اس قدر زیادہ خرچہ آئے گا۔ پھر وہ انہیں دوسری
سم کے کم قیمت تابوت دکھاتے اور آخر میں سستے ترین تابوتوں کی باری آتی تینوں قسم کے تابوت اور
نوط کے طریقے بتا کر فیصلہ وہ ان پر چھوڑ دیتے کہ جس طرح چاہیں' جتنے میں چاہیں وہ اپنے مردے کو
نوط کروالیں۔ لوگ انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر کے مردہ ان کے پاس چھوڑ جاتے اور پھر یہ حنوط کے
ہر اپنی ورکشاپ میں اس پر کام شروع کر دیتے۔ سب سے پہلے یہ لوگ لوہے کے ایک ہک کو ناک
کے ذریعے مردے کے سر میں ڈال کر اس کا مغز نکالتے۔ کچھ حصہ اس طرح نکال کر وہ اس خالی جگہ
یں کوئی دوائیں بھر دیتے۔ پھر وہ ایک تیز نوکیلے پتھر سے اس کے پیٹ میں چیرا لگاتے اور آنت اور
وجھڑی نکال لیتے۔ معدہ کو کھجور کی شراب سے دھو کر پیٹ میں خوشبو چھڑکتے۔ پھر معدے میں
ختلف قسم کی خوشبوئیں بھر کر دوبارہ اندر رکھ کر پیٹ کو سی دیتے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ لاش
و نیٹرم کے محلول بھرے ٹب میں ڈبو دیتے اور ستر دن تک اس کے اندر رہنے دیتے کسی جسم کو اس
سے زیادہ عرصے تک نیٹرم میں ڈبوئے رکھنا خلاف قانون سمجھا جاتا تھا۔ ستر دن کے بعد وہ لاش کو باہر نکال کر خوب اچھی طرح دھوتے پھر جسم کو لچکدار لیڑے کی پٹیوں میں لپیٹ کر انہیں گوند سے چپکا دیتے۔ مصری عام طور پر پٹیاں چپکانے کے لیے لسی اور گلیو کی جگہ گوند ہی استعمال کیا کرتے تھے۔ پھر لاش رشتے داروں کے حوالے کر دی جاتی جو انسانی جسم کی طرح ساختہ لکڑی کے تابوت میں بند کر کے اسے تہہ خانے کی دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیتے اور اتنے اخراجات اور وقت کے بعد لاش حنوط شدہ صورت اختیار کر لیتی۔ وہ لوگ جو زیادہ اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوتے وہ درمیانی طریقہ اختیار کرتے تھے۔ اس طریقے

پہلے پہل مصر میں کشتیاں پیپرس کو ملا کر بنائی جاتی تھیں سیاح تھور ہیئر ڈال نے پیپرس سے بنائی ہوئی کشتی را کے ذریعے مصر سے امریکہ تک سفر کر کے اس بات کا ثبوت فراہم کیا کہ پیپرس سے کشتیاں بنائی جا سکتی ہیں اور یہ بخوبی سمندر میں چل بھی سکتی ہیں۔

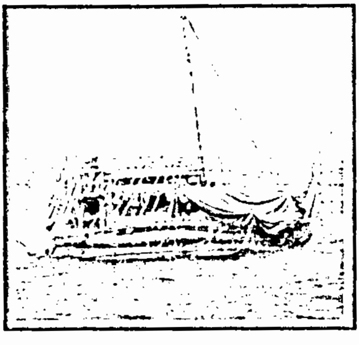

سے نہ لاش کا پیٹ چاک کیا جاتا نہ آنتیں وغیرہ نکالی جاتیں بلکہ سرنج کے ذریعے سفید دیودار کا تیل معدے میں بھر دیا جاتا پھر جسم کو مقررہ عرصے تک نیٹرم کے محلول میں ڈبو دیا جاتا۔
آخری دن لاش کو نکال کر انجکشن ہی کے ذریعے پیٹ میں بھرا ہوا تیل نکال لیا جاتا۔ یہ تیل اس قدر طاقت ور ہوتا تھا کہ اندر آنتوں اور دوسرے اعضاء کو گلا دیتا اور گوشت کو بھی چاٹ جاتا۔ اب لاش میں ہڈیوں اور کھال کے سوا کچھ بھی باقی نہ بچتا۔ پھر یہ لاش رشتے داروں کے حوالے کر دی جاتی۔ تیرا طریقہ غربا کے لیے مخصوص تھا۔ اس طریقے میں لاش کو پہلے سائری کے محلول سے دھویا جاتا پھر ستر دن تک نیٹرم میں رکھ کر لواحقین کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ تورات کی کتاب اول کے باب ۳ : ا میں مذکور ہے کہ حضرت یعقوبؑ کو چالیس دن میں حنوط کیا گیا مگر ان کا سوگ ستر دن ہی منایا گیا تھا۔ مصری مسودات سے پتا چلتا ہے کہ مصریوں کے ہاں آدمی کے مرنے اور دفنانے کے عرصے میں بڑا اختلاف تھا۔ ایک حالت میں حنوط میں سولہ دن لگتے تھے۔ پٹیاں پینتیس (۳۵) دن میں باندھی جاتی تھیں اور تدفین ستر دن بعد ہوتی تھی اس طرح کل ۱۲۱ دن لگتے تھے۔ ایک اور حالت میں حنوط میں ساٹھ دن لگتے تھے۔ دفنانے کی تیاری میں چار دن لگتے تھے اور دفنانے میں چھبیس دن لگتے تھے اس طرح کل چھیانوے دن لگتے تھے۔ ایک اور جگہ بتایا گیا ہے کہ حنوط میں ستر یا اسی دن لگتے تھے اور تدفین میں دس مہینے لگتے تھے۔ ڈایوڈورس کئی معاملات میں ہیروڈوٹس سے متفق ہے بلکہ کچھ اور تفصیلات بھی بیان کی گئی ہیں۔ اس کے مطابق جب کوئی آدمی مر جاتا تھا تو اس کے تمام رشتے دار اور دوست اپنے سروں اور چہروں پر کیچڑ ملتے مٹی ڈالتے اور جب تک مردہ کو دفنا نہ دیا جاتا پورے شہر میں سینہ کوبی کرتے، آہ وبکا کرتے چکر لگاتے رہتے تھے۔ اس دوران میں وہ لوگ نہ نہاتے نہ شراب پیتے نہ اپنی پسند کا کھانا کھاتے اور نہ ہی اچھے کپڑے پہنتے۔ ان کے خیال میں بھی حنوط کے یہ تین طریقے تھے۔ پہلا طریقہ مہنگا تھا اس میں چاندی کا ایک ٹیلنٹ (تقریباً ایک ہزار ڈالر) لگتا تھا۔ دوسرے میں بیس مینی (تقریباً دو سو چالیس ڈالر) اور تیسرے میں یقیناً بہت ہی کم خرچ آتا تھا۔ حنوط کرنے والے لوگ اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جن کے ہاں وراثتاً یہ فن چلا آرہا تھا۔ یہ لوگ حنوط کے مختلف طریقوں کو لکھ کر رکھتے ۔تنے ان کی قیمتیں درج کرتے تھے لور پھر مرنے والوں کے عزیزوں سے معاملات طے کر کے کام شروع کرتے تھے۔ جب مرنے والے کے لواحقین کسی ایک طریقے پر متفق ہو جاتے تو لاش ان حنوط کرنے والوں کے حوالے کر دی جاتی تھی یہ لوگ لاش ان لوگوں کو دے دیتے جو حنوط کے طریقوں میں مہارت رکھتے تھے۔ یہ لوگ جسم کو زمین پر رکھ کر سب سے پہلے اس کے دائیں جانب نشان لگاتے پھر ایک دوسرا آدمی تیز دھار والے پتھر سے اس نشان زدہ حصے کو چیر دیتا۔ اس کے بعد یہ دونوں آدمی وہاں سے بھاگ اٹھتے۔ ان کے شاگرد مڑ مڑ کر پتھر مارتے اور جنتر منتر پڑھتے تاکہ انسانی پیٹ چاک کرنے کے جرم کے انتقام

یہ ممی آپ فرعون توتنخ آمن کی ملاحظہ کر رہے ہیں جس میں بادشاہ نے شاہی تاج پہنا ہوا ہے اور اس کے ایک طرف عقابی دیوتا اور دوسری طرف انسانی سر والا پرندہ موجود ہے جو بادشاہ کی روح کی نمائندگی کرتے ہیں یہ مجسمہ بادشاہ کے شاہی خزانے کے نگران اعلیٰ "مایا" کے نام موسوم ہے۔

سے بچ سکیں۔ کیونکہ مصریوں کے ہاں ہمیشہ سے انسانی جسم کو کسی بھی طرح نقصان پہنچانے کو بے حد مکروہ جرم سمجھا جاتا تھا۔ حنوطیوں کی معاشرے میں بڑی قدر تھی کیونکہ وہ راہبوں کے دوست تھے اور یوں آزادی سے مندروں میں آجا سکتے تھے جیسے پیدائشی پاک صاف ہوں۔ پھر یہ لوگ دوبارہ آکر لاش کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ ان میں سے ایک لاش کے جسم میں لگائے گئے زخم کے اندر ہاتھ ڈال کر دل اور پھیپھڑوں کے سوا ہر چیز کھینچ کر نکالتا تھا۔ دوسرے لوگ آنتوں کو کھجور کی شراب اور دیگر خوشبویات سے دھوتے آخر میں جسم کو صنوبر اور دیگر تیلوں سے دھو کر اس میں کئی دوائیں اور مسالہ جات بھر دیتے اور اسے ایسی مکمل صورت میں لے آتے کہ ان کی بھنوؤں اور پلکوں تک میں خلل نہیں پڑتا تھا۔ اس طرح برسوں بلکہ صدیوں بعد بھی ان کی بآسانی شناخت ہو سکتی تھی۔ بے شمار مصری ایسے تھے جو اپنے آباؤاجداد کی لاشوں کو عالی شان مقبروں یا کمروں میں رکھتے تھے تاکہ آنے والی نسلیں بھی ان کی زیارت سے مستفید ہو سکیں اور ان کے نقوش میں اپنے نقوش کی مماثلت پا کر فخر کر سکیں۔ ڈایوڈورس تھوڑا سا آگے چل کر کہتا ہے کہ یہ حنوطی پادریوں کے بڑے اچھے دوست تھے اور جیسا کہ واقعی یہی بات تھی یہ لوگ اس طرح جسموں کو حنوط کر کے گویا ایک بڑی رسم ادا کرتے تھے اور دوسرے لوگوں کی طرح لاش کے انتقام کے خوف سے آزاد تھے۔ بعض معاملات میں ڈایوڈورس غلطی پر بھی تھا حنوط کے بارے میں اس کو محض ابتدائی علم ہی سمجھا گیا تھا۔ وہ بہت بعد کے زمانے کی پیداوار تھا۔ (تقریباً ۴۰۲ قبلِ مسیح) اس لیئے اسے تھیبان کی ممیوں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل نہیں تھیں۔ اس کی معلومات کا دارومدار صرف مصری رومن ممیوں تک محدود تھا جن کے بازو وغیرہ علیحدہ سے پٹیوں میں لپیٹے جاتے تھے اور چہروں کو اس طرح دبا دیا جاتا تھا کہ ان کی شناخت مشکل ہو جاتی تھی۔ بعض یونانی مصنفین نے لاش سے نکالی گئی آنتوں کے بارے میں ایک عجیب ہی نظریہ پیش کیا ہے۔ پلوٹارک نے دو جگہ لکھا ہے کہ مصری جب کسی لاش میں سے آنتیں نکال لیتے تھے تو پھر انہیں دھوپ میں رکھ دیتے تھے تاکہ مردے نے جو غلطیاں اور گناہ کیے ہیں وہ اس سے پاک ہو جائے اور پھر وہ ان آنتوں کو دریا میں بہا دیتے تھے جب کہ باقی جسم کو حنوط کر کے محفوظ کر دیتے تھے۔ پورفری (Porphyry) نے بھی یہی بات

بیان کی ہے۔ اس نے تو وہ فار مولا بھی بتایا ہے جو حنوطی آنتوں کو دھوپ میں رکھتے وقت استعمال کرتے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نسخے کو ایکفنٹوس نے ان کی اپنی زبان سے جو یقیناً مصری تھی' یونانی زبان میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ اس وقت وہ لوگ سورج کو اور دوسرے ان دیوتاؤں کو' جو انسانوں کو زندگی عطا کرتے تھے مخاطب کرتے' ان سے درخواست کرتے کہ مرنے والے کو سدا زندہ رہنے والے دیوتاؤں کی ہم جلیسی عطا ہو۔ مردے کی طرف سے اس بات کا اقرار کیا جاتا کہ اس نے زندگی میں تمام دیوتاؤں کی دل سے پوجا کی تھی۔ بچپن ہی سے اپنے والدین کا اور ان کے دیوتاؤں کا احترم کیا تھا۔ اس نے زندگی میں نہ کبھی کسی آدمی کو نقصان پہنچایا تھا نہ کسی کو قتل کیا تھا۔ یہ ساری باتیں ایک ایسا شخص بھی مردے کی طرف سے لکھ کر ممی کے ساتھ رکھ دیتا تھا جو ''مردوں کی کتاب'' (Book Of Dead) کے باب پندرہ کے 'معکوس اقرار نامے' کا پوری طرح ادراک رکھتا تھا۔ اس کے بر خلاف یونانیوں کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ بھی یہی طریقہ استعمال کرتے تھے کیونکہ مصریوں کی طرح نہ ہی وہ آنتوں پر عمل کرتے وقت کسی قسم کا اخراج کرتے تھے اور نہ ہی انہیں دریا میں بہاتے تھے بلکہ وہ آنتوں کو بھی حنوط کر کے مردے کی ٹانگوں یا بازوؤں کے درمیان رکھ کر ان پر بھی پٹیاں باندھ دیتے تھے تاکہ مستقبل میں جب اسے دوسری دنیا میں دوبارہ زندہ کیا جائے تو اس کا جسم کسی عضو کے بغیر نہ رہ جائے۔ مصری ممیوں کے جائزے سے پتا چلتا ہے کہ ہیروڈوٹس اور ڈایوڈورس کے بیانات بڑی حد تک درست ہی ہیں کیونکہ وہاں پیٹ کو چیری ہوئی اور سالم دونوں ہی قسم کی ممیاں دریافت ہوئی ہیں۔ بعض ممیوں کو خوشبویات اور گوند میں لپیٹا گیا تھا اور بعض کو تارکول یا رال اور نیٹرم کے ذریعے محفوظ کیا گیا تھا۔ ممیوں کی کھوپڑیاں جو تھیبس کے قریب سیکڑوں کی تعداد میں غاروں اور کھڈوں میں ملی تھیں اندر سے بالکل خالی تھیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مصری حنوطی نہ صرف کھوپڑیوں کے اندر سے مغز نکالنے پر قادر تھے بلکہ وہ ناک کی ہڈی یا کسی اور ہڈی کو نقصان بھی نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ ممیوں کی ایسی کھوپڑیاں بھی ملی ہیں جن میں رال' کپڑے (لینن) کی دھجیاں یا لاکھ بھری ہوئی تھی۔ جن جسموں میں رال یا لاکھ بھری ہوئی تھی ان کے رنگ سبزی مائل تھے اور کھال ایسی تھی جیسے دھوپ میں رکھ کر سکھالی گئی ہو۔ ایسی ممیوں کو جب کھولا گیا تو وہ آسانی سے ٹوٹ پھوٹ کر تباہ ہو گئیں۔ بہر حال رال یا خوشبودار گوند بھری ممیوں کے دانت اور بال بالکل صحیح حالت میں پائے گئے ہیں۔ وہ اجسام جن کی آنتیں نکال کر انہیں رال یا بٹومین بھر کر محفوظ کیا گیا تھا عام طور پر سیاہ اور سخت ہوتے تھے۔ ان کے نقوش تو محفوظ رہتے تھے مگر جسم بھاری اور ٹیڑھے ہو جاتے تھے۔ بٹومین (معدنی رال جیسے اسفالٹ) پوری طرح ہڈیوں میں سرایت کر جاتا ہے اور بعض اوقات یہ جاننا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ بٹومین ہے یا کوئی ہڈی ہے۔ اس طرح سے محفوظ کیے گئے بازو' ٹانگیں' ہاتھ اور پیر جب ٹوٹتے ہیں تو

ایسی آواز آتی ہے جیسے کوئی شیشے کی ٹیوب ٹوٹتی ہو۔ وہ بڑی آسانی سے جل جاتے ہیں اور بہت حرارت پیدا کرتے ہیں۔ اگر انہیں یونہی رہنے دیا جائے تو عرصہ دراز تک محفوظ رہ سکتے ہیں۔ جب کسی جسم کو نیٹرم یعنی کاربونیٹ' سلفیٹ اور نمک کے تیزاب سے محفوظ کیا جاتا ہے تو اس کی کھال سخت ہو جاتی ہے اور اسی طرح ہڈیوں سے لٹک جاتی ہے جیسے مالٹا میں فلوریانا کے کیپوچن کانوینٹ میں محفوظ مردہ راہبوں کے ڈھانچوں کی کھالیں لٹکی ہوئی ہیں۔ اس قسم کی ممیوں کے بال ہاتھ لگتے ہی گر جاتے ہیں۔ مصری اپنے مردوں کو شہد میں بھی محفوظ کیا کرتے تھے۔ عبد الطیف کا بیان ہے کہ اسے ایک مصری نے جو بڑا با اعتبار سمجھا جاتا تھا' بتایا کہ ایک بار جب وہ اپنے دوسرے کئی ساتھیوں کے ہمراہ اہرام کی قبروں کی کھدائی اور خزانے کی تلاش میں مصروف تھا تو اسے ایک سیل بند مرتبان ملا تھا۔ انہوں نے مرتبان کھولا تو وہ شہد سے بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے وہ شہد کھانا شروع کر دیا۔ پارٹی میں سے ایک آدمی نے بتایا کہ شہد میں انہیں ایک بال پڑا نظر آیا۔ آدمی نے انگلی ڈال کر وہ بال نکالا تو وہ ایک چھوٹا سا بچہ تھا جس کے ہاتھ پیر اور جسم بالکل صحیح سلامت تھا بچے کے جسم پر خوبصورت لباس تھا اور جسم پر کئی قسم کے چھوٹے چھوٹے زیورات بھی تھے۔ سکندر اعظم کا جسم بھی ''سفید شہد میں جو پگھل نہیں سکتا تھا'' محفوظ کیا گیا تھا۔ غریبوں کے جسموں کو بہت ہی سستے طریقوں سے محفوظ کیا جاتا تھا۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ جسم کو نمک اور گرم بٹومین میں ڈبو دیا جاتا تھا۔ دوسرے طریقے میں صرف نمک ہی استعمال کیا جاتا تھا پہلے طریقے میں جسم کے ہر سوراخ میں بٹومین بھر دیا جاتا اور بال غائب ہو جاتے۔ ظاہر ہے اس طرح صرف جسموں ہی کو محفوظ کیا جاتا تھا جن کے سبب سے لفظ ممی یا بٹومین ایجاد ہوا تھا۔ نمک زدہ خشک جسم آسانی سے شناخت کیا جا سکتا تھا۔ مگر اس کی کھال کاغذ کی طرح ہو جاتی بال اور نقوش غائب ہو جاتے اور ہڈیاں سفید اور بھر بھری ہو جاتی تھیں۔ دنیا کی قدیم ترین ممی جس کی تاریخ میں کوئی شبہ نہیں ہے' پاپائی اول کے بیٹے سیکریم سیف -Seker-em Sa-f کی ہے جو پاپائی دوئم کا بڑا بھائی تھا۔ یہ ممی ۳۲۰۰ قبل مسیح کی تھی جو سکارا میں ۱۸۸۱ء میں دریافت ہوئی تھی اور اب غزہ میں موجود ہے۔ یہ ممی نچلے جبڑے سے محروم ہے۔ اس کی ایک ٹانگ لانے لے جانے کی وجہ سے جگہ سے ہٹ گئی ہے (Dislocate) مگر نقوش بالکل محفوظ ہیں اور بالوں کے ایک گچھے سے پتا چلتا ہے کہ آدمی جوان تھا۔ جسم کے معائنے اور تجزیے سے بھی یہی پتا چلا کہ سکریم سیف کی موت جوانی ہی میں واقع ہوئی تھی۔ سکارا میں اس کے اہرام میں بہت ساری پٹیاں بھی ملی تھیں جو بالکل ویسی ہی تھیں جو بعد میں استعمال میں آئیں جس سے پتا چلتا ہے کہ قدیم سلطنت میں فن حنوط کاری عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ کرنل ہاورڈ وائس کو غزہ میں مائی سرینس کے اہرام میں ایک جسم کے کچھ حصے ملے تھے جس سے اندازہ لگایا گیا کہ یہ اس بادشاہ کے دور سے بھی پہلے کے تھے۔ مگر اس بات کا کوئی ثبوت بہر حال نہیں مل سکا اور چونکہ یہ حصے

کسی عورت کے جسم کے بجائے مرد کے جسم کے ہیں اس لیے خیال ہے کہ یہ مائی سرینس کی ممی ہی کے حصے تھے۔ سنگی تابوتوں میں کچھ ڈھانچے ملے تھے جن کا تعلق پہلے چھٹے شاہی سلسلے سے تھا۔ ان ڈھانچوں کو جب ہوا لگی تو وہ مٹی میں تبدیل ہو گئے اور ان میں سے بٹومین کی بو آنے لگی۔ گیارھویں سلسلہ شاہی کی ممیاں بہت خستہ حالت میں ملی تھیں۔ ان کے رنگ زرد تھے' چھونے میں بھر بھری تھیں اور بڑی آسانی سی منتشر ہو گئی تھیں۔ ان کے بازوؤں کو بھی کہیں کہیں پٹیاں لگی ہوئی تھیں اور جسموں پر کپڑا باندھ کر ایک لمبی لینن کی چادر میں لپیٹ دیا گیا تھا۔ بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی پر مقدس بھنورے کی انگوٹھی تھی اس کے علاوہ جسم پر نہ کوئی تعویز تھا اور نہ کوئی اور زیور تھا۔ اس دور کی ممیوں کے تابوت میں ٹوکریاں' اوزار' آئینے' پیالے اور تیریں وغیرہ ملی تھیں۔

بارھویں سلسلہ شاہی کی ممیاں سیاہ اور خشک کھال والی تھیں۔ ان پر پٹیاں بھی بندھی ہوئی نہیں تھیں اور وہ بھی یونہی ڈھیلے ڈھالے انداز میں رکھ دی گئی تھیں۔ اس دور کے تابوتوں میں مقدس بھنورے کے تعویز' دیوتاؤں کی تصویریں وغیرہ ملی تھیں۔ تیرھویں اور سترھویں خاندان کی ممیوں کی حالت بہت بری تھی اور وہ بڑی تیزی سے تباہ ہو گئی تھیں۔ اٹھارھویں سے اکیسویں ممفس خاندان کی ممیاں سیاہ تھیں اور اس قدر خشک حالت میں تھیں کہ ہلکے سے چھونے سے بھی ٹوٹ جاتی تھیں۔ ان کے سینے کے خلاء میں ہر قسم کے تعویز بھرے ہوئے تھے اور سینوں پر ''مردوں کی کتاب'' کے باب تیس کے اقتباسات کی تختیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اسی دور میں تھیبس میں پائی جانے والی ممیوں کا رنگ زرد اور چمک دار تھا۔ ان کے ہاتھ اور پیروں کے ناخن سلامت تھے اور ان پر مہندی لگی ہوئی تھی۔ ان کے بازو بغیر ٹوٹ پھوٹ کے کسی طرف بھی گھمائے جا سکتے تھے۔ فن پٹی بندی کا عمل درجۂ کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ بائیں ہاتھ میں انگوٹھیاں اور بھنورے کی علامتیں تھیں اور ممی کے ایک جانب یا اس کے نیچے ''مردوں کی کتاب'' کے اقتباسات رکھے ہوتے تھے۔ اکیسویں خاندان کے بعد اس رسم میں تبدیلی آئی اور لاشوں کو ڈبوں میں رکھا جانے لگا۔ ان ڈبوں کو جھالروں سے سی دیا جاتا تھا اور ان پر شوخ رنگوں سے ایسی تصویریں بنائی جاتی تھیں جن میں مرنے والے کو دیوتاؤں کی عبادت کرتے دکھایا جاتا تھا۔ سولھویں خاندان کے دور میں اور سکندر اعظم کے مصر فتح کرنے کے وقت ممیوں کو سجانے کا فن عروج پر پہنچ چکا تھا اور ڈبوں پر نقش و نگار اور سجاوٹ سے پتا چلتا تھا کہ مصری اس فن میں یونانیوں سے متاثر تھے۔ ممی کا سر ایک ماسک میں لپیٹ دیا جاتا تھا اور ماسک پر شوخ رنگوں سے نقش و نگار بنائے جاتے تھے۔ تابوت کا ڈبہ بس اتنا ہی بڑا بنایا جاتا تھا کہ جسم اس میں فٹ آجاتا تھا۔ اس کی ٹانگوں پر ایک چادر لپیٹ دی جاتی تھی۔ دیوتاؤں کی تصویریں' بے شمار تعویز اور وہ تمام چیزیں جو زندگی میں اس کے استعمال میں رہی تھیں اس کے ساتھ ہی رکھ دی جاتی تھیں۔

بطلیموس کے دور میں ممیاں پھر سیاہ اور بھاری ہو گئیں۔ پٹیاں اور جسم ٹھوس بٹومین میں تبدیل کر دیے گئے جنہیں صرف کسی کلہاڑی یا بسولے ہی سے کھرچ کر دیکھا جا سکتا تھا۔ ایسی ممیوں پر لپیٹی جانے والی چادروں پر بے معنی مناظر اور تحریریں لکھ دی جاتی تھیں جن کا مطلب لکھنے والا خود اپنی مرضی سے جو چاہے نکال سکتا تھا۔ تقریباً ۱۰۰ قبل مسیح میں ممیوں پر بڑی احتیاط سے پٹیاں لپیٹی جاتی تھیں۔ ہر بازو الگ الگ رکھا جاتا تھا اور اس کی واضح صورت باقی رہتی تھی اور چہرے کے نقوش کسی قدر دب جانے کے باوجود بھی قابلِ شناخت رہتے تھے۔ پچاسویں سن عیسوی میں مرنے والوں کے رشتے داروں اور دوستوں کی خواہش پر کہ ''مرنے والے کا چہرہ دیکھیں گے'' لکڑی کا ماسک بنا کر اس پر مرنے والے کا چہرہ پینٹ کر کے تابوت میں رکھ دیا جاتا اس طرح ان کی تسکین ہو جاتی تھی۔ اس وقت سے لے کر چوتھی صدی عیسوی تک کی ممیاں کچھ زیادہ دلچسپ نہیں رہیں کیونکہ وہ محض بنڈل ہو کر رہ گئی تھیں۔ ان کے جسموں پر آڑے ٹیڑھے مناظر پینٹ کر دیے جاتے تھے جن میں مرنے والوں کو مصری دیوی دیوتاؤں کی عبادت کرتے دکھایا جاتا تھا۔ پھر ان تصویری تحریروں کی جگہ یونانی تحریر نے لے لی۔ ایسی ہی ایک گریکو رومن ممی کی قابلِ ذکر مثال جو شاید چوتھی صدی عیسوی کی ہے' برٹش میوزیم میں نمبر ۲۱۸۱۰ کی ہے۔ یہ ممی کئی کپڑوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ اس کے اوپر پلاسٹک کا ایک کور ہے جس پر سرخ گلابی رنگ پینٹ کیا ہوا ہے۔ چہرے پر مردے کا پورٹریٹ جس پر سنہرا تاج سجا ہوا ہے' رکھا ہے۔ سینے پر سونے کا ایک کالر ہے جس کے دونوں سروں پر عقاب بنا ہوا ہے۔ ہمارے دور کی ابتدائی صدیوں میں مال دار لوگوں کی ممیوں کو شاہی لباس میں جو بہترین ریشم کا بنا ہوا ہے' رکھا گیا ہے۔ جب کاپٹوس کے بشپ اور اس کا پیروکار جون ''چیمی پہاڑی'' (Mountain Of Tchemi) کے مقبرے میں گئے تو وہ مقبرہ ممیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان تمام ممیوں کے نام ایک چرمی کاغذ پر لکھے ہوئے تھے جو ان کے قریب ہی رکھا ہوا تھا۔ ان دونوں راہبوں نے ممیوں کو اٹھا کر ایک دوسرے کے اوپر رکھ دیا۔ ان کے تابوت جن کے اندر یہ رکھی ہوئی تھیں اندر سے بے حد سجے ہوئے تھے۔ دروازے کے قریب والی ممی ساخت میں بہت بڑی تھی۔ اس

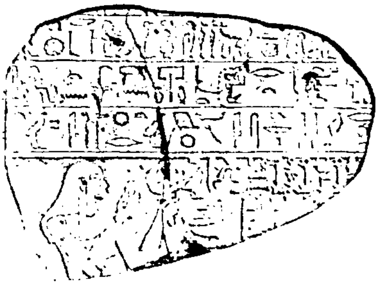

قدیم مصر کے مرد اور عورت خوبصورتی کے رسیا تھے بہت سی ملکاؤں کے نام کے آگے نیفر کا صیغہ استعمال ہوتا تھا جس کا مطلب خوبصورت ہے جیسے نیفریت' نیفرتتی' نیفرطاری آپ اس مصر میں ایک معزز خاتون کو ایک ہاتھ میں آئینہ اٹھائے اپنے گالوں پر پاؤڈر لگاتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔

کی انگلیوں اور پنجوں کو الگ الگ پٹیوں میں باندھا گیا تھا۔ جس لباس میں وہ ملبوس تھی وہ بہترین ریشم کا بنا ہوا تھا۔ جس راہب نے یہ ممی دریافت کی تھی اس نے ان تابوتوں کے 'ان ممیوں کے اور ان کے لباس وغیرہ کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا تھا۔ باہر کا بھاری کفن جس کا اس نے حوالہ دیا تھا وہ بہت پرانے زمانے کا تھا اور اندر سے بہترین انداز میں سجا ہوا تھا۔ انگلیوں اور پنجوں پر بندھی ہوئی پٹیاں بھی قدیم رومن انداز کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ اس نے ممیوں کے گرد لپیٹے ہوئے ریشم کے کپڑے کا تجزیہ کیا تو پتا چلا کہ پچھلے کئی برسوں میں جو ممیاں دریافت ہوئی تھیں ان پر بھی ایسا ہی ریشمی لباس لپٹا ہوا تھا۔ برٹش میوزیم میں اس ریشم کا ایک بہترین نمونہ رکھا ہوا ہے جس پر دو گھڑ سوار' چار کتے اور پھول وغیرہ بڑی خوب صورتی سے کڑھے ہوئے ہیں۔ یہ تمام تصویریں سرخ زمین پر سبز اور زرد رنگوں میں ابھاری گئی ہیں اور یہ کام پھولوں سے بنے ہوئے دائرے کے اندر ہے۔ یہ کڑھا ہوا کپڑا پھر زرد ریشم کے ٹکڑے پر سلا ہوا ہے اور اس ٹکڑے کو سیدھے ایک ممی کے کپڑے پر سی دیا گیا ہے۔

رومن دور کی ممیاں مخصوص لکڑیوں کے لیبل سے پہچانی جاتی ہیں۔ یہ لیبل یا تختیاں پانچ انچ ضرب دو انچ اوسطاً سائز کی ہیں اور مردوں کی گردنوں میں لٹکی ہوئی تھیں۔ ان تختیوں پر آنجہانیوں کے نام اور بعض اوقات ان کے والدین کے نام اور ان کی عمریں بھی لکھی ہوتی تھیں۔ کچھ تختیوں پر یونانی زبان کندہ تھیں بعض پر دو زبانیں یونانی اور مصری تحریریں تھیں اور بعض میں تصویری تحریریں بھی تھیں۔ بد قسمتی سے ان کی نقالی بڑی آسان تھی کیونکہ مقامی لوگ پرانے تابوتوں کی لکڑیاں لے کر ان تحریروں کی نقل کر لیتے پھر ہر سال سیکڑوں کی تعداد میں سیاحوں کے ہاتھوں فروخت کر دیتے۔ مصر کے عیسائیوں نے حنوط کاری کے فن کو اپنا لیا اور مصری دیومالا کے ساتھ اپنے عیسائی اعتقادات کو بھی شامل کر لیا۔ ہمارے دور کی تیسری صدی میں حنوط کاری کے فن کو زوال آنا شروع ہو گیا حالانکہ مالدار عیسائی اور غیر عیسائی اب بھی ممی کرانا پسند کرتے تھے تاہم چوتھی صدی تک اس کا رواج تقریباً بالکل ہی معدوم ہو گیا۔ میرے خیال میں اس کی وجہ مصر میں عیسائیت کی ترویج تھی۔ مصری اپنے مردوں کو اس لیے حنوط شدہ کرواتے تھے کہ ان کے عقیدے کے مطابق موت کے بعد کسی وقت جسم میں روح لوٹ آنی تھی اور ایک بار مردہ پھر پہلے کی طرح زندہ ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ لوگ پوری کوشش کرتے تھے کہ قبر میں ان کے مردوں کے جسموں کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔ عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ ان کے جسموں کو صحیح سلامت زندہ کر دیں گے اس لیے انہیں اپنے مردوں کو مسالا اور دوائیں لگا کر حفاظت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مصر کے قابلِ ذکر عیسائی خاندان اپنے مردوں کو مسالا لگا کر اپنے گھروں میں رکھنا معیوب اور مکروہ سمجھتے تھے اور اینتھونی دی گریٹ نے اپنے دو وفادار ساتھیوں کو سختی سے تاکید کی تھی کہ اس کی لاش کو مصر نہ لے جایا

جائے اور ایسی نامعلوم جگہ دفن کیا جائے جس کا علم ان کے سوا کسی کو نہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ اس کی لاش کو لے جا کر اس کے محل میں دفن کر دیں۔ وہ اس رواج کے سخت خلاف تھا اور لوگوں کو منع کرتا تھا کہ اپنے مردوں کو زمین پر رکھنے کی عادت ترک کر دیں بلکہ جلد از جلد کہیں دفن کر دیا کریں۔ اس کا کہنا تھا ''حشر کے دن جب سارے مردے اٹھائے جائیں گے میرا جسم یسوع مسیح مجھے صحیح سلامت لوٹا دے گا۔''

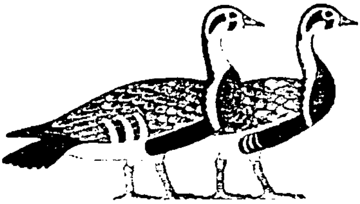

قدیم مصری فطرت کے بہت رسیا تھے اور جانوروں کے ساتھ ان کا اٹوٹ رشتہ تھا۔ ان بڑی بطخوں کی تصاویر تقریباً ہر اہرام سے ملی ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ بعد از مرگ انہیں غذا فراہم ہوتی رہے گی۔

بعد کے زمانے میں انسانوں اور جانوروں کی لاشوں کو سوتی کپڑوں میں لپیٹا جاتا تھا۔ ۱۶۴۶ء میں گریویس نے اپنی کتاب ''پیرامیڈیا گرافیا'' میں لکھا: پٹیاں' جو میں نے دیکھیں' لینن کی ہوتی تھیں جو مصری پادریوں کا طریق کار تھا۔ وہ مزید لکھتا ہے۔ ''ان میں زیادہ تر پٹیاں اتنی مضبوط اور مکمل تھیں جیسے کل ہی بنائی گئی تھیں۔ رونیل اپنی کتاب Memoires de l'Academie R.des Sciences مطبوعہ ۱۷۰۹ء میں کہتا ہے کہ اس نے ممی کے ہر لباس کا کپڑا جو دیکھا وہ کاٹن کا تھا اور دوسروں نے بھی اس کی بات سے اتفاق کیا۔ جونارڈ کا خیال ہے کہ ممی کی پٹیوں کے لیے کاٹن اور لینن دونوں کپڑوں کی پٹیاں ہی استعمال ہوتی تھیں۔ گرین ول اپنی کتاب Philosophical Transaction For 1825 میں صفحہ ۲۷۴ پر اس نظریے کی تائید کرتا نظر آتا ہے۔ آخر اس سوال کا جواب حتمی طور پر مسٹر تھامسن نے اپنی کتاب Philosophical Magazine میں دیا۔ اس نے اس موضوع پر بارہ سال کی تحقیق کے بعد لکھا کہ یہ پٹیاں عالمگیر پیمانے پر لینن ہی کی ہوا کرتی تھیں۔ ممی کی ان پٹیوں کی لمبائی چوڑائی تین فٹ ضرب ڈھائی انچ سے لے کر تیرہ فٹ بائی ساڑھے چار انچ ہوا کرتی تھیں۔ بعض پٹیوں کے دونوں سروں پر جھالر ہوا کرتی تھی جیسے رومال سی دیے گئے ہوں اور بعض پر اس دھاگے سے بڑی مہارت سے حاشیہ بنا دیا جاتا تھا۔ مقبروں میں سے کئی مربع فٹ کی لینن کی چادریں بھی دست یاب ہوئی ہیں۔ زعفرانی رنگ کی چادریں جو عام طور پر ممیوں کے اوپر لگائی جاتی تھیں آٹھ فٹ ضرب چار فٹ کی ہوتی تھیں۔ ممی کی بینڈ تیج کے لیے عام طور پر دو یا تین قسم کا لینن استعمال کیا جاتا تھا۔ ممی کے کپڑے بہت کم حالت میں سادہ پائے گئے ہیں۔ صرف یونانی دور میں ہی ایسا ہوا تھا کہ ان کپڑوں پر دیوتاؤں وغیرہ کی رنگ برنگی تصویریں کاڑھ دی جاتی تھیں۔ یورپ کے عجائب گھروں میں موجود لینن کے کئی کئی مربع گز کپڑوں کو نیلی

دھاریوں سے سجایا گیا تھا اور یہ بات یقینی ہے کہ جن دھاگوں سے ان کپڑوں کو بنا گیا تھا انہیں پہلے نیلے رنگ میں رنگ لیا جاتا تھا۔ ایمے نوفس سوئم کے وقت تک ممی کے کپڑوں پر مقدس تصویریں اور تحریریں کاڑھنے کا رواج تھا۔ ان کے ساتھ "مردوں کی کتاب" کے چند باب بھی نقل کر دیئے جاتے تھے۔ سولھویں خاندان شاہی کے بعد سے تصویری تحریروں کا مقصد ہی ممیوں کے لباس کی سجاوٹ رہ گیا تھا یہاں تک کہ پٹیوں پر بھی یہ نقش کاڑھے جاتے تھے مگر چوڑائی کم ہونے کی وجہ سے وہ پڑھنے میں نہیں آسکتے تھے۔ ایسی کم چوڑی پٹیوں کے دونوں سروں پر عام طور پر گل کاری ہی کی جاتی تھی۔

لینن سازی کا شاندار فن جو مصریوں کا طرۂ امتیاز تھا مقامی مصری شاہوں کے زوال کے بعد ختم نہیں ہو گیا بلکہ کوپٹس یعنی مقامی عیسائیوں نے بعد میں اس فن کو ہمارے دور کی بارھویں صدی میں انتہائی کامیابی کے ساتھ آگے بڑھایا اور عروج پر پہنچا دیا۔ حالانکہ ان عیسائیوں نے اس امید میں کہ حضرت عیسیٰ حشر میں ان کے جسموں کو صحیح سلامت لوٹا دیں گے' اپنے مردوں کو ممی کرنے کے لیے لینن کے استعمال کو ترک کر دیا تاہم وہ اپنے لباس اور پردوں وغیرہ میں اسے زیادہ سے زیادہ خوبصورت بنا کر استعمال کرتے رہے۔ اس دریافت کی ایک بہترین مثال ۱۸۸۴ء میں قدیم پینوپولس کے آخمم (Akhmim) میں دیکھی گئی۔ آخ مم میں قبریں پانچ فٹ گہری کھودی جاتی ہیں اور ان پر قبروں کی نشان دہی کے لیے کوئی تعویز وغیرہ نہیں بنا جاتا۔ ان قبروں سے جو لاشیں دستیاب ہوئی ہیں ان پر نیٹرون (Natron) چھڑکا گیا تھا کیونکہ کئی لاشوں کے لباسوں پر اس مادے کے کرسٹل پائے گئے ہیں اور ان لوگوں کو اپنے بہترین لباسوں میں ہی دفن کیا گیا تھا۔ ان کے سروں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ بعض کے سر پر ٹوپیاں بھی تھیں اور سروں کے نیچے تکیے رکھے ہوئے تھے۔ ان کے جسموں پر چوغے تھے پیروں میں موزوں کے ساتھ سینڈل یا جوتے تھے۔ اور سر' سینہ' بازو اور انگلیاں زیورات سے سجی ہوئی تھیں۔ ان کی زندگی کے حالات ایک لکڑی کی تختی پر لکھ کر ان کی قبروں میں رکھے ہوئے تھے اور بعض میں ان کے آلات واوزار بھی موجود تھے جو وہ زندگی میں استعمال کرتے رہے تھے۔ ان کے جسموں کو لینن کے کپڑوں میں لپیٹ کر لکڑی کے تختوں پر رکھ کر قبروں میں اتارا گیا تھا خاص زیورات جو آخ مم کی قبروں میں مردوں کے ساتھ پائے گئے ہیں' یہ ہیں : لکڑی یا ہڈیوں کے بنے ہوئے ہیئر پن اور کنگھے' کئی طرح کے شیشے کے بنے ہوئے بندے' چاندی اور کانسی کے جڑاؤ زیورات' سونے کی چھوٹی چھوٹی گولیاں' لوہے کے عقیق جڑے جھمکے' عنبر کی نیکلس' رنگین شیشے' چمکدار موتیوں کی مالائیں' گلوبند' کانسی کی ہنسلی' کھلنے بند ہونے والی کانسی' شیشے' لوہے اور سینگوں کی بنی ہوئی پہنچیاں (بریسلیٹ) کانسی کی انگوٹھیاں' عیسائی صلیب کی صورت کانسی کے بیلٹ اور بکل۔ ان کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں ہاتھی دانت کی صلیبیں بھی ملی ہیں جو صرف

سجاوٹ کے لیے ہی نہیں بلکہ تبرک کے طور پر بھی استعمال ہوتی تھیں۔ قدیم مقبرے جو بڑی تعداد میں ہیں اور جن میں سے یہ چیزیں ملی ہیں دوسری یا تیسری صدی عیسویؑ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں حال ہی میں دریافت ہونے والوں کا تعلق آٹھویں اور نویں صدی عیسویؑ سے بھی ہے۔ یہ چیزیں عیسائیوں کے مقبروں کے علاوہ غیر عیسائیوں کے مقبروں سے بھی دست یاب ہوئی ہیں۔ جنہیں بغیر تابوت کے دفن کیا گیا تھایا جو عام نجی مقامات پر مدفون تھے۔ گو ہیلنس کے عجائب گھر میں کپڑے کا ایک ایسا ٹکڑا موجود ہے جس کے دھاگے خالص ریشم کے ہیں اس کے بارے میں گو ہیلنس کے ڈائریکٹر آف مینو فیکچرنگ کا کہنا ہے کہ اس کپڑے کا تعلق آٹھویں صدی سے ہے کیونکہ اس وقت تک مصر میں ریشم کا آرائشی کپڑا بننا شروع نہیں ہوا تھا۔

☆

فزکس اور اہرام

بیورٹن ' اوریگن کی ایک سائی کک اور روشن ضمیر "ٹنی ہیل" اہرام کی سریت میں عرصے تک غوطہ زن رہی ہے۔ وہ یہ بات جاننے کے لیے کوشاں ہے کہ مراقبے اور بعد از حواس بصیرت (ESP) پر اہرام کیا اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ ایک معاون گروپ کے ساتھ دو اہراموں کو استعمال کر رہی ہے۔ اس کے تجربات میں اس بات کا تعین کرنا بھی شامل ہے کہ آیا اہرام اس کی پیش گوئی کی قابلیت پر بھی اثرانداز ہوتے ہیں یا نہیں۔ کیا اہرام کا اپنا ایک ہالہ یا مقناطیسیت ہے اور یہ ہالا اہرام میں موجود انسان کے ہالے کو تبدیل کر دیتا ہے۔ ٹنی ہیل اس جستجو میں بھی مصروف ہے کہ اس تحقیقی پروگرام کے لیے جن روحی ماہرین (Psychics) کو مدعو کیا گیا ہے ان پر اہرام کیا اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں سائنسی انداز میں ایک تجرباتی ڈیٹا ترتیب دیا جا رہا ہے جسے تحقیق کے مکمل ہونے کے بعد جاری کیا جائے گا۔ پھر اس رپورٹ کو سائنس دانوں کی ایک اور ٹیم جانچے گی اور نتائج کا تعین کرے گی۔ ٹنی ہیل کا بیان ہے کہ اس کی ملہمانہ (پیش گوئی) قابلیتوں کا اظہار اس وقت سے ہی شروع ہو گیا تھا جب وہ ایک چھوٹی بچی تھی۔ وہ پیش نظری کی صفات کی حامل تھی۔ مستقبل کے بارے میں باتیں بتا سکتی تھی اور مریضوں کو صحت یاب کرنے کی صفات کی حامل تھی۔ "جب میں بچی تھی تو میری ان صفات کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔" اس نے بتایا۔ "میرے والد پادری تھے اور میری ان غیر معمولی صفات کے فروغ کے سخت خلاف تھے۔" دوست اور شناسا بھی ان صفات کی بہت کم حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ "میری اس قابلیت کو ایک سراپ یا تکفیر سمجھا جاتا تھا۔" ٹنی ہیل نے کہا "روحی قابلیت کے حامل فرد کے لیے زندگی ہمیشہ سے ہی ایک عذاب رہی ہے۔ میری حوصلہ شکنی کی جاتی تھی ' پریشان کیا جاتا تھا ' برا بھلا کہا جاتا تھا۔ آخر ۱۹۶۷ء میں ' میں نے فیصلہ کیا کہ ان تمام مخالفتوں کے باوجود میں اپنی ان صفات کا انکار نہیں کروں گی اور خود کو ایک طبیب نفسی (Psychi-cist) کے طور پر منوا کر رہوں گی۔" کئی برسوں تک پھر اس نے چپ سادھ لی اور پچھلے آٹھ سالوں تک یہ دل کش اوریگن خاتون اپنی پیغمبرانہ صلاحیتوں کی تدوین میں مصروف رہی۔ "میں پیشہ ور روحی معالج بن گئی اور اس میدان میں تربیت اور تجربات میں مصروف ہو گئی۔" اس نے بتایا: "ایسی باتوں سے مجھے ہمیشہ ہی سے دلچسپی رہی تھی جو کسی طور بھی ماورائے طبعی یا فوق الفطرت کے زمرے میں آتی تھیں۔ چند برسوں تک میں مشتری کے طور پر بعید از حواس بصیرت (ESP) کے وجود کو ثابت کرنے میں مصروف رہی۔ اب میں محسوس کرتی ہوں کہ میرا مقصدِ وجود اس سے بھی کہیں زیادہ گھمبیر اور اہم ہے تاہم اب تک یہ مقصد مجھ پر آشکار نہیں ہو سکا ہے۔"

دو سال قبل اس نے خدا سے کہا کہ اگر اسے روحی (Psychic) نہیں ہونا تو اس سے یہ صفات چھین لے۔ ”میں مراقبہ میں چلی گئی۔ مجھے کسی علامت کسی نشانی کی جستجو تھی۔“ اس نے بتایا: ”تاریخِ عالم میں تمام صوفیاء کا یہی دستور رہا ہے۔ میں کسی ایسی علامت یا کسی ایسے اشارے کی طلب گار تھی جس سے مجھ پر واضح ہو جاتا کہ میں طبیبِ نفسی یا روحی کے طور پر اپنا علم اور کام جاری رکھوں یا ترک کر دوں۔“ کئی گھنٹوں کے مراقبے کے بعد ٹینی ہیل باہر گئی اور اپنے کولئس کے پودے کو پانی دینے لگی (کولئس کا پودا اپنے خوبصورت پتوں کی وجہ سے کاشت کیا جاتا ہے) مراقبے کے دوران میں کولئس میں انقلاب پیدا ہو چکا تھا۔ ٹینی ہیل نے بتایا: ”میرے پودے میں چاروں طرف چھوٹے چھوٹے پھول کھلے ہوئے تھے۔ یہ پھول ہمیشہ درمیان میں سرخ اور باہر سے سبز ہوتے تھے مگر مراقبے کے بعد پھولوں کا رنگ خون کی طرح سرخ ہو گیا تھا۔ دیگر پھولوں کے بیچ میں سفید رنگ چمک رہا تھا کچھ پھول باہر سے سبز اور سفید اور اندر سے سرخ ہو گئے تھے۔ میرے پھولوں میں اب تقریباً ہر رنگ کا حسین ترین امتزاج موجود تھا۔“ ٹینی ہیل کولئس کے پھولوں میں تغیر کے بارے میں کہتی ہے کہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے مگر ”میرے پھولوں میں یہ تبدیلی صرف چند گھنٹوں میں پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے کئی باغ بانوں سے بات کی۔ انہوں نے بتایا کہ پھولوں میں تبدیلی آتی ہے مگر بتدریج اور آہستہ آہستہ آتی ہے۔ میرے کولئس پودے کے پھول گویا میری روحی طاقت کی علامت تھے۔ اس کے بعد سے میں نے اس پودے میں سے پینتیس قلمیں کاٹیں اور اب انہیں اہرام کے تجربات میں استعمال کر رہی ہوں۔“ پودے میں تغیر کے بعد ٹینی پھر مراقبے میں چلی گئی۔ ”میں اب اپنے کام کے سلسلے میں ہدایات کی طلب گار تھی۔“ اس نے بتایا: ”میں اس مراقبے کی حالت میں سات روز تک رہی۔“ اس کے شعور میں ایک پیغام آیا۔ ”اہرام کے اندر جاؤ۔“ پیغام میں کہا گیا۔ ٹینی ہیل نے احتجاج کیا اس کے پاس اہرام نہیں ہے۔ ”ہم تمہیں ایک اہرام دے دیں گے۔“ اگلا پیغام ملا۔ ”یہ کوئی آواز نہیں تھی جو میں نے سنی تھی۔“ اور یگن کی سائی کک نے کہا۔ ”یہ روحی خیال کی ایک صورت تھی۔ مجھے اس حقیقت کا علم تھا کہ میرے پاس کسی بھی قسم کے اہرام کے لیے کافی جگہ نہیں تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ اس سلسلے میں مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ میرے لیے ہر بات کا انتظام کر دیا جائے گا۔ دو ہفتوں کے اندر میں نے دیکھا

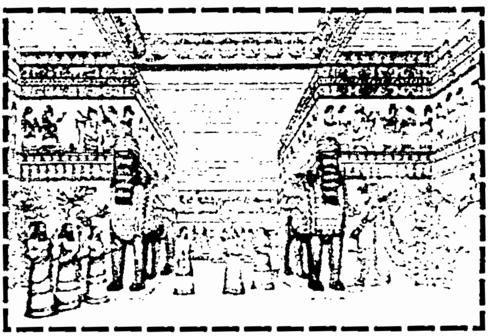

ریاستی امور نمٹانے کے لیۓ حکومتی دربار: یہ انتہائی خوبصورت آرائش پر مبنی دربار اسیریا کے بادشاہ اشور بنی پال دوئم کا ہے یہ خوبصورت پینٹنگ انیسویں صدی کے مصوری ہے جس میں اشور بنی پال دوئم ایک مصاحب سے مشورہ کر رہا ہے۔ اصل تصویر مہر پر کندہ کی گئی تھی۔

کہ سب کچھ ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا جن لوگوں کے ساتھ مجھے کام کرنا تھا وہ اہرام کی وجہ سے کھنچے چلے آرہے ہیں۔'' پہلا کام جو اس نے کیا وہ ایک نیوز لیٹر کی تیاری تھا جو اس نے اپنے مؤکلوں' دوستوں اور شناساؤں کو روانہ کیا۔ ''میں نے ان سے ہر اس تعاون کی درخواست کی جو وہ کر سکتے تھے۔'' ٹنی ہیل نے بتایا۔ ''چاہے مالی امداد ہو یا کوئی اور میں نے مقامی طور پر ایک اہرام بنانے کا انتظام شروع کیا تھ کیونکہ کشف میں مجھے مصر جانے کی ہدایت نہیں کی گئی تھی۔''

ٹنی ہیل کا بنیادی پروگرام دو اہراموں کی تجرباتی تعمیر تھا۔ اس کے گروپ کے دوسرے اراکین نے اہرام بنائے اور سائنسی طور پر اس کے تجربات کی تصدیق میں مصروف ہو گئے۔ ''نقل بہ مطابق اصل بنانا سائنس کا اہم اصول ہے۔'' ٹنی ہیل نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے طور پر تجربات کر کے ایک ہی نتیجہ حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم اب جس تجربے پر کام کر رہے ہیں وہ مختلف چیزوں پر اہرام کی توانائی یا مقناطیسیت کا اثر معلوم کرنا ہے۔ یہ تجربات ہم پودوں' آدمیوں پر اور دوسری چیزوں پر کر رہے ہیں۔'' اگر مسز ہیل اور اس کے گروپ کے دوسرے ارکان کے تجربات میں کوئی فرق ہوا تو پھر یہی تجربات دوسرے سائکس کے ذریعے کیے جائیں گے۔ ''ایک روحی قابلیت کا حامل فرد کسی نہ کسی طور پر اہرام کی توانائی سے تعامل کر سکتا ہے یا اثر پذیر ہو سکتا ہے۔'' اس نے بتایا: ''اس طرح دوسرے روحی افراد جو نتائج حاصل کریں گے اس سے ہمیں زیادہ بصیرت حاصل ہو سکتی ہے۔'' مسز ہیل نے اپنے تجربات کو دو مختلف درجات میں تقسیم کر لیا ہے۔ ''ایک حصہ طبعی چیزوں سے تجربات کا ہے مثلاً درخت' بیج کاٹنے والے آلات وغیرہ اور دوسرا حصہ اہرام کے اندر روحی مظاہر کا مشاہدہ اور تجزیہ ہے۔'' اہرام نے پودوں پر بڑے دلچسپ اثرات مرتب کیے۔ ''ایک تجربے کے لیے میں نے اپنے کولئس کی کچھ قلمیں لیں۔'' اس نے بتایا: ''ایک قلم کو میں نلکے سے برابر پانی دیتی رہی۔ اس کا پودا معمول کے مطابق بڑھنے لگا۔ دوسری قلم کو اہرام میں رکھ کر پانی دینے لگی۔ اہرام کے اندر رکھے ہوئے پودے نے غیر معمولی نشوونما کا مظاہرہ کیا۔ دوسرے پودے کے مقابلے میں اہرام کے اندر والا پودا کم وقت میں پہلے کے مقابلے میں چار گنا زیادہ بڑھ گیا تھا۔'' اہرام کی توانائی نے پانی کے ساتھ کیا کیا؟ ''میں نے محسوس کیا جیسے اہرام کی توانائی نے پانی میں آکسیجن کو زیادہ دیر تک موجود رہنے میں مدد کی تھی۔'' مسز ہیل نے بتایا: ''اہرام کے اندر جو پانی زیادہ عرصے تک رکھا گیا تھا اس میں آکسیجن کے زیادہ بلبلے تھے۔ اگر آپ پانی کی بالٹی کو اہرام کے اندر سے باہر لائیں تو بلبلوں کا اثر بھی کم ہو جاتا ہے۔ تاہم اہرام کے اندر موجود ہونے کی وجہ سے پودے کی نشوونما پر بڑا اچھا اثر پڑا تھا۔'' اسی دوران میں مسز ہیل بیمار پڑ گئی اور اتفاقیہ طور پر ایک اور ٹیسٹ ہو گیا۔ ''میں نے پودے کی ایک قلم اہرام میں رکھ دی تھی۔ یہ سوچتے ہوئے کہ رات بھر اسے یہیں رہنے دوں گی۔'' اس نے بتایا: ''پھر میں بیمار پڑ گئی اور وہ قلم میرے ذہن سے نکل گئی۔ پانچ دن بعد جب میں ٹھیک ہوئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ قلم بالکل تندرست اور صحیح حالت میں تھی۔ قلم کو اس دوران نہ مٹی ملی تھی اور نہ پانی نصیب ہوا تھا پھر بھی قلم تروتازہ تھی۔ میں نے اس قلم کو اہرام سے باہر لگا کر ایک گملے میں لگایا اور پانی دیا۔ صرف آدھے گھنٹے بعد وہ قلم سوکھ چکی تھی۔ بیجوں پر' ان کی نمو پر اور ایسے ہی دوسرے حالات پر بھی تجربات کیے گئے۔

"ہم نے انسانی ہالے کے کرلین فوٹوگرافی (Kirlian Photography) کے تجربات بھی کیے۔" مسز ہیل نے بتایا: "ہم نے اس سلسلے میں ایک الیکٹرونکس انجینئر سے بھی مدد حاصل کی جو اس پروجیکٹ کے خاص آلات بنارہا تھا۔" مسز ہیل کے اہرام سے متعلق دوسرے تجربات کا تعلق طبِ نفسی (Psychicism) سے تھا۔ "میں اہرام میں مراقبہ کرتی رہی ہوں۔" اس نے بتایا: "اہرام میں داخل ہونے سے پہلے میں نے روزہ رکھا تھا اور کچھ ذہنی ورزشیں کی تھیں۔" "کیا اہرام میں موجودگی کے وقت اسے سائی کک ڈیٹا موصول ہوا تھا؟" "حیرت کی بات ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔" اس نے بتایا: "واحد بات جو میں نے محسوس کی وہ انتہائی سخاوت کا جذبہ تھا۔ لوگوں کی بھلائی اور فلاح کا احساس تھا کیونکہ میں گویا کائنات میں مدغم ہوگئی تھی۔ پھر جب میں مراقبے کے بعد اہرام سے باہر آئی تو یہ ساری باتیں میرے لاشعور سے اُمڈ آئیں۔ اہرام میں مراقبے کے فوراً بعد میں نے ایک سو سے زیادہ پیش گوئیاں ٹائپ کرلیں۔ لگتا تھا جیسے اہرام نے میری روحانی قوت میں موجود رکاوٹیں دور کردی ہوں۔"

جو لوگ ٹنی ہیل سے رابطہ قائم کرنا چاہیں ان کے لیے اس کا پتا حاضر ہے۔ پی او باکس نمبر ۱۲۵' بیورٹن' اوریگن ۹۷۰۰۵ (P.O.Box No. 125 Beaverton, Oregon 97005 USA)۔ جو لوگ مسز ہیل کو خط لکھنا چاہیں ان سے درخواست ہے کہ جواب کے لیے ڈاک کے ٹکٹ لگا اپنا پتا لکھا ہوا لفافہ ضرور ارسال کریں۔ ایک اور سائی کک ایڈگر کیسی نے بھی اپنی عمر کا بڑا حصہ اہراموں کی سرّیت کی کھوج میں لگادیا۔ کیسی کا تعلق ورجینیا بیچ' ورجینیا سے تھا جہاں وہ 'خوابیدہ پیش گو' (Sleeping Prophet) کے طور پر مشہور تھا۔ کیسی ۱۸۷۷ء میں ہوپکنس ول' کینٹکی کے قریب ایک فارم میں پیدا ہوا تھا اور شروع ہی سے ایسی بصیرت کا اظہار کرنے لگا تھا جو عام حسیات سے ماوراء تھی۔ اس کی فطانت و طباعی سے بیسیوں کتابیں بھری پڑی ہیں۔ جب ۱۹۷۵ء میں کیسی کا انتقال ہوا تو اس نے لوگوں کے لیے آٹھ ہزار مختلف تحریریں کے چودہ ہزار اسٹینوگرافک ریکارڈ چھوڑے تھے۔ یہ تحریریں تینتالیس سال کے عرصے پر محیط ہیں اور انسان کی غیر معمولی روحی قابلیتوں کا ایک متاثر کن ریکارڈ ہے۔ ان تحریروں کو محفوظ کرنے کے لیے ایک فاؤنڈیشن بنائی گئی ہے جس کا پتا ہے: ایسوسی ایشن فار ریسرچ اینڈ این لائٹن منٹ ان کارپوریٹڈ پوسٹ باکس نمبر ۵۹۵ ورجینیا بیچ وی اے ۲۳۴۵۱۔ اس فاؤنڈیشن نے خود اپنی تحقیقی دریافتیں بھی شائع کی ہیں۔ درخواست کرنے پر کیٹلاگ بھی ارسال کیا جاسکتا ہے۔ کیسی کی تحریروں کے مطابق مصر کے اصل باشندے سیاہ قبیلے کے لوگ تھے جو دریائے نیل کے ساتھ ساتھ خیموں اور غاروں میں رہتے تھے۔ ملک کا پہلا بادشاہ کنگ رائی (King Raii) ایک بڑا مشفق اور مہربان آدمی تھا جس نے دنیا بھر کے داناؤں کو انسان کے روحانی پہلوؤں پر مذاکرات کے لیے جمع کیا تھا۔ کنگ رائی کا خیال تھا کہ یہ انسان کی روحانی طاقت ہی ہے جس نے اسے درندوں اور دیگر جانوروں پر فضیلت اور برتری عطا کی ہوئی ہے اور یہ روحانی طاقت اسے مقتدرِ اعلیٰ کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے۔ اس گروہ نے کئی اصول اور نظریات پیش کیے جو بعد میں مصریوں کی "بک آف ڈیڈ" میں مذکور ہوئے۔ کیسی کہتا ہے کہ بک آف ڈیڈ محض مصر کی تدفینی رسوم کا کتابچہ ہی نہیں ہے بلکہ اس میں اہم روحانی معاملات بھی درج ہیں۔

۱۰۴۹۰ قبل مسیح میں مصر پر حملے کیے گئے۔ کئی انقلابات آئے اور وہ غرقاب براعظم ایٹلانٹس کے پس ماندگان کی جائے پناہ بنا۔ کنگ رائی نے محسوس کیا کہ قدیم مصری علوم کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کیا جانا چاہیئے۔ اس کے علاوہ ایٹلانٹس والوں نے بھی اپنے براعظم کی غرقابی سے قبل بیش بہا معلومات کا ذخیرہ کر لیا تھا۔ کنگ رائی کے خیال کے مطابق ان تمام اہم مواد و معلومات کو محفوظ کرنے کے لیے ایک زیرِ زمین پوشیدہ مقام کی ضرورت تھی۔ کیسی کہتا ہے کہ اس تمام بیش قیمت ریکارڈ کو محفوظ کرنے کے لیے میمون (Sphinx) اور عظیم اہرام کے درمیان ایک اور اہرام تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ مقام اس وقت تک پوشیدہ رہنا تھا جب تک انسان اپنے خود پسندانہ اور خود غرضانہ جذبات پر قابو نہ پالے۔ ریکارڈ کا یہ ہال اس وقت کھلے گا جب انسانیت اپنے روحانی مقاصد کا صحیح معنوں میں ادراک حاصل کر لے گی۔ عظیم اہرام کی تعمیر ابتدائی یا روشناسی مندر کے طور پر ہوئی تھی۔ اس کی سنگی چوٹی سونے، تانبے اور پیتل کی بنی ہوئی تھی۔ کیسی کی رپورٹ کے مطابق یہ چوٹی کا پتھر (Capstone) آسمانی آگ (Cosmic Fire) سے روشن تھا اور روشنی کے اس انداز سے صرف ایٹلانٹس والے ہی واقف تھے۔ یہ کیپ اسٹون جو اس یادگار کا طرۂ امتیاز تھا ایک فرعون کے ہاتھوں تباہ ہوا تھا جو بہت بعد کے دور میں اقتدار میں آیا تھا۔ کیسی کا خیال ہے کہ دنیا کے بیشتر روحانی پیشواؤں بشمول حضرت عیسیٰ نے یہیں سے ہدایات حاصل کرنے کی ابتداء کی تھی۔ کیسی کہتا ہے کہ عظیم اہرام میں انسانی ترقی کا اقلیدس، ریاضی اور دوسرا ڈیٹا موجود ہے۔ یہ ڈیٹا یا معلومات ۱۹۹۸ء میں اختتام کو پہنچ جائیں گے، اس وقت جب کیسی کے اندازے کے مطابق موجودہ تہذیب کا دور تکمیل کے مراحل طے کر چکے گا۔ ایک نئی نسل جنم لے گی جس کی ذیلی نسل کا آغاز ۱۹۳۲ء سے ہو گا۔ چونکہ کیسی نظریۂ تناسخ (آواگون) پر یقین رکھتا تھا اس لیے اس کا خیال تھا کہ نئی نسل ایٹلانٹس، لیموریا اور دوسری روایتی یا گم شدہ تہذیبوں کے افراد کی روحوں کے حامل لوگوں پر مشتمل ہو گی۔

آر سی ڈاکٹر اینڈرسن آف روزول جارجیا جو "وہ آدمی جو آنے والے کل کو دیکھ سکتا ہے" کے طور پر مشہور ہے۔ وہ زندہ ایڈگر کیسی کہلاتا ہے۔ جارجیا کے اس عارف کو سرّیت سے بھی بڑی دلچسپی رہی ہے۔ اس کے روزول میں واقع "ESP" اسٹوڈیو کی سیر کے دوران میں 'اینڈرسن سے اہراموں کے بارے میں میری بڑی تفصیلی گفتگو رہی۔ اینڈرسن نے گہرے ٹرانس کی حالت میں جانے پر رضامندی ظاہر کی تو میں نے اس گفتگو کو ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ کر لیا۔ اس گفتگو کا کچھ حصہ پیش خدمت ہے:

سوال: اہراموں کی تعمیر کب ہوئی؟

اینڈرسن: میں کام میں پیش رفت دیکھ رہا ہوں۔ لوگ بڑے بڑے پتھر اٹھا رہے ہیں۔ اپنی تہذیب کی یادگار تعمیر کر رہے ہیں۔ یہ کوئی مقبرہ نہیں ہے حالانکہ بہت سے لوگ ایسا ہی سمجھ رہے ہیں۔ یہ ایک بے حد ترقی یافتہ تہذیب کی یادگار ہے جو ہمارے اپنے دور کی پیش رو ثابت ہو گی۔ بعض تہذیبیں ہماری اب تک کی تہذیبوں سے مادی اور روحانی طور پر کہیں ارفع و اعلیٰ ہیں یہ اہرام اسی دور میں تعمیر کیے گئے تھے۔ یہ دور اس دور سے کم از کم دس ہزار سال قبل کا ہے جب حضرت مسیح زمین پر موجود تھے۔

سوال: اہرام کس نے تعمیر کیے؟

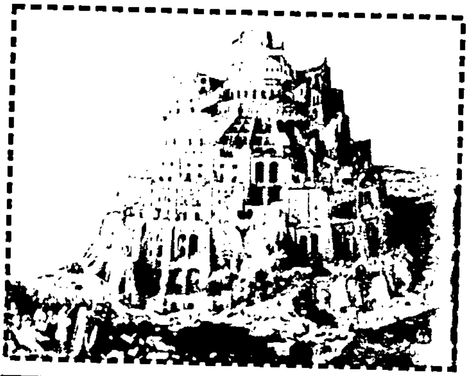

بابل کے معلق باغات: میسوپوٹیمیا جسے آج عراق کے نام سے جانا جاتا ہے، کے معلق باغات کو بھی اہرام کے ساتھ دنیا کے سات عجوبوں میں شمار کیا جاتا ہے جسے حضرت نوحؑ کی اولاد نے جنت تک پہنچنے کے لیئے بنایا تھا یہ باغات زیگورات کے مندر پر بنائے گئے تھے یہ تصویر پیٹر برو گیل نے بنائی تھی۔

بنڈرسن: اہراموں کو مصریوں نے
نیر کیا ہے۔
وال: اہراموں کی منصوبہ بندی
س نے کی تھی؟
ینڈرسن: اس دور میں مصر میں کئی
فراد تھے جو ترقی یافتہ علوم سے بہرہ
ر تھے۔ یہ علم کہ ان اہراموں کو
یسے تعمیر کیا جائے ایٹلانٹس والوں
ے ملا تھا۔ ان لوگوں سے جو عظیم
ر اعظم کی لہروں میں غرق ہوتے
وقت وہاں سے بھاگ آئے تھے۔
انہوں نے پہلے ہی ایسے علوم
(سائنس)' مابعد الطبیعیاتی
تعلیمات اور دیگر علوم کے لیے ایک خانقاہ یا مدفن تعمیر کر لی تھی۔ انہیں پہلے ہی اس سیلابِ عظیم کا علم ہو گیا تھا جو الوہی کتاب بائبل میں مذکور تھا۔ انہیں ایک مقام کی ضرورت تھی جہاں وہ اپنے علوم کو ہزاروں بلکہ لاکھوں برسوں تک محفوظ رکھ سکیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے سب سے پہلے سطحِ مرتفع غزہ میں زیرِ زمین کمرے بنانے شروع کیے۔ ان زیرِ زمین کمروں میں ان گم شدہ تہذیبوں کا ریکارڈ ابھی تک محفوظ ہے۔

سوال: کیا تم خود کو ان زیرِ زمین کمروں میں لے جا سکتے ہو؟

اینڈرسن: بہت سارے کمرے ہیں۔ اہرام کے نیچے ان وسیع کمروں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ وہاں سارا ریکارڈ اسی صورت میں موجود ہے جس صورت میں کہ بارہ ہزار سال پہلے رکھا گیا تھا۔ ان کمروں کی تکمیل کے بعد بہت کم لوگوں کی ان تک رسائی ہو سکی ہے۔ دنیا کے کئی روحانی پیشوا اور عظیم مذہبی رہنماؤں کو ان کمروں کی سیر کرائی جا چکی ہے۔ ان عظیم افراد کو کچھ عرصے تک ان علوم کے مطالعہ کی اجازت بھی دی گئی تھی تاکہ وہ دنیا میں جا کر لوگوں کو ان کی تعلیم دے سکیں۔

سوال: کیا تم ان کمروں (Chambers) کا حال بتا سکتے ہو؟

اینڈرسن: چٹانوں میں سرنگیں تراشی گئی ہیں جن کی دیواروں سے دائمی روشنی پھوٹتی ہے۔ پہلے ان سرنگوں کو چٹانوں میں تراشا گیا پھر ان پر دھات کاری کی گئی۔ سرنگ کی سنگی دیواروں پر اسی انداز میں دھات کی دلاسازی (Panelling) کی گئی ہے جس طرح ہم اپنے مکانوں کے تہہ خانوں میں پلائی وڈ کی تختہ بندی کرتے ہیں۔ دھات کے ان پینلز پر مختلف تصاویر اور علامتیں نقش کی گئی ہیں۔ یہ سرنگیں سطحِ مرتفع کی طرف نکلتی ہیں۔ بے شمار کمرے ان سرنگوں سے منسلک ہیں اور ان سے دور بھی ہیں۔ کئی بڑے بڑے ہال ہیں جیسے ہمارے ہاں آڈیٹوریم یا لائبریری ہال ہوتے ہیں۔ ان ہالوں میں سے کئی ایک

میں بے شمار چیزیں رکھی ہوئی ہیں جیسے ہمارے ہاں میوزیم میں ہوتی ہیں۔ یہ وہ نوادرات اور مشینیں ہیں جو ان تہذیبوں کے لوگوں کے استعمال میں تھیں۔ انہیں ہوابستہ یا کیمیاگرانہ انداز میں سیل بند کیا ہوا ہے اور ایک مستقل درجۂ حرارت پر رکھا ہوا ہے۔

سوال: کیا وہاں موجود روشنی اور روشنی کے نظام کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟ وہ روشنیاں دائمی طور پر کیسے جل رہی ہیں؟

اینڈرسن: اس طریقے یا نظام سے وہی لوگ واقف تھے جو ایٹلانٹس میں رہتے تھے۔

سوال: کیا اس بارے میں کچھ اور بتا سکتے ہو؟

اینڈرسن: اس وقت اس سے زیادہ بتانا مناسب نہیں ہے۔ ایسی معلومات صرف اسی وقت مہیا کی جا سکتی ہیں جب ان کے طالب یا متلاشی پوری طرح اس کے لیے تیار ہوں۔

سوال: کیا کچھ اور وضاحت کر سکتے ہو؟

اینڈرسن: یہ عمل کسی کیمیائی طریقہ کا مرہونِ منت ہے جس سے صرف ایٹلانٹس والے ہی واقف ہیں۔

سوال: کیا وہاں موجود مشینوں کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟

اینڈرسن: وہاں بہت ساری مشینیں ہیں۔

سوال: وہ کیا کرتی ہیں؟

اینڈرسن: ایٹلانٹس والوں نے موت کی شعاع والی مشین بنائی تھی وہ وہاں موجود ہے۔ وہاں ایسی مشینیں بھی ہیں جنھیں تغیر پذیری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے آخر ان کا معاشرہ تباہ ہو کر رہ گیا۔ یہ تغیر پذیری منقلب انسانوں اور جانوروں کے امتزاج سے پیدا کی جاتی تھی۔ سائنس کو ان معاملات سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کیونکہ اٹلانٹین معاشرے کے تاروپود بکھرنے لگے تھے۔ معاشرے کے اس زوال کے ساتھ سائنسی اخلاقیات بھی زوال پذیری کا شکار ہو کر رہ گئی تھیں۔ زندگی کی تغیر پذیری کے علم کے ذریعے اٹلانٹین سائنس داں ایک قابلِ رحم مخلوق پیدا کرنے لگے تھے۔ اس مخلوق کا دماغ انسانی ہوتا تھا مگر ان کے اجسام اور طبعی ساخت شعاعوں کی رہینِ منت تھی۔ اٹلانٹین خلیات کی پیوندکاری کے علم سے بھی واقف تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے اجزاء کے خلیات کی ایک دوسرے میں پیوندکاری کر کے نئی نئی چیزیں بنانے لگے تھے۔

سوال: وہ ایسا کیوں کرتے تھے؟

اینڈرسن: اس طرح اپنے ملک کے مال دار لوگوں کے لیے غیر معمولی قسم کی داشتائیں پیدا کرتے تھے۔ وہ اس ہنر کو نصف آدمی' نصف جانور پیدا کرنے کے کام میں بھی لاتے تھے اور یہ دوغلی مخلوق ان کے کھیتوں میں کام کرتی تھی۔ آخری برسوں کے دوران میں ماہی مرد (Fishman) کا امتزاج بھی پیدا کر لیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی زمین ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی تھی اور کھیت تباہ ہوتے جا رہے تھے۔ یہ ماہی مرد سمندروں میں کاشت کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔

سوال: ان ہالوں میں اور کیا کیا چیزیں نمائش کے لیے موجود تھیں؟

اینڈرسن: دوسرے کمروں میں جواہرات بھرے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے ہیرے' مٹھی کے برابر

موتی شیشوں کے نیچے رکھے ہوئے تھے۔ ان قیمتی پتھروں کی اپنی چمک ہی اتنی تھی کہ وہاں کسی اور روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔

سوال : ایسا قیمتی خزانہ وہاں ہمیشہ کے لیے بند کر کے کیوں رکھا ہوا تھا؟

ینڈرسن : جن لوگوں نے اہرام تعمیر کیے تھے انہیں ان مادی خزانوں سے ذرا دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے یہ جواہرات صرف ماضی کی فن کاری کی یادگار کے طور پر رکھے ہوئے تھے۔

سوال : یہ زیرِ زمین عمارات کس قدر وسیع تھیں؟

اینڈرسن : یہ سرنگیں میلوں لمبی تھیں۔ ایک راستہ ریکارڈ والے ہال میں جا نکلتا ہے۔ ہر نمائندہ تہذیب و ثقافت کے متعلق یہاں مواد موجود ہے۔ یہاں طومار (Scrolls) ہیں کتابیں ہیں جو عجیب وغریب زبانوں میں تحریر ہیں۔ گول کرسٹلس ہیں جن میں مختصر ریکارڈنگ کی گئی ہے۔

سوال : ریکارڈنگ سے تمہارا کیا مطلب ہے؟

اینڈرسن : وہ لوگ ایسے پتھر کے ٹکڑے استعمال کرتے تھے جن میں سے آواز نکلتی تھی۔

سوال : کیا یہ سب ایٹلانٹس میں تھا؟

اینڈرسن : ایٹلانٹس میں بھی تھا مگر دراصل یہ گوشہ گمنامی میں جانے سے قبل لیمورین لوگوں کا کارنامہ تھا۔

سوال : ہم پھر اہرام کی طرف آتے ہیں۔ اسے کیسے تعمیر کیا گیا تھا؟

اینڈرسن : غلام مزدوروں کے ذریعے۔ اس زمانے میں مصر میں ہزاروں غلام موجود تھے۔ خوراک کی قلت کی وجہ سے وہ لوگ فاقہ کشی پر مجبور تھے۔ ایٹلانٹس والوں نے اپنے لیے خوراک پیدا کرنا بند کر دیا تھا۔ ایک آدمی کو مٹھی بھر اناج کے لیے سارا دن کام کرنا پڑتا تھا۔ ان غلاموں نے یہ اہرام تعمیر کیے مگر اس کام میں ان کی رہنمائی دنیا بھر کے داناؤں نے کی تھی۔

سوال : انہوں نے آخر یہ عمارتیں کیسے تعمیر کی تھیں؟

اینڈرسن : سب سے پہلے سطح مرتفع کے نیچے ریکارڈ روم بنائے گئے تھے۔ اس کام میں انہیں ہمارے حساب سے چالیس سال کا عرصہ لگا تھا۔ پھر زیرِ زمین کمروں کے دروازوں کو سیل کر دیا گیا اور پھر عظیم اہرام کی تعمیر شروع ہوئی۔ اس عظیم عمارت کو مکمل ہونے میں تقریباً ساٹھ برس لگے تھے۔

سوال : کیا ان کے پاس کوئی خاص آلات تھے؟

اینڈرسن : ایٹلانٹس کے زوال کے بعد کئی مشینیں باقی بچ گئی تھیں۔ انہی مشینوں کی مدد سے زیرِ زمین مدفن بنائے گئے تھے۔ بعد میں اہراموں کے نیچے

گوئٹے مالا میں ٹکال کے مقام پر مایا تہذیب کا [illegible] اہرام اس بات کی علامت ہے کہ [illegible] اہراموں کی رسم کو دیگر تہذیبوں [illegible] جس میں مایا تہذیب سرفہرست تھی۔

ان میں سے بیشتر مشینوں کو نمائش کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ چند ایک مشینیں سطح زمین پر پتھروں کو تراشنے اور لانے لے جانے کے لیے رکھ لی گئی تھیں۔ انہی مشینوں کی مدد سے وہ لوگ کششِ ثقل کی قوت پر قابو پا سکے تھے۔ جہاں ان مشینوں کے بغیر کسی پتھر کو اٹھانے میں دو سو آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی، وہیں ان مشینوں کی مدد کے ساتھ یہی کام صرف بیس آدمی کر لیتے تھے۔

سوال : کیا عظیم اہرام میں اب بھی یہ چیمبرز (کمرے) موجود ہیں ؟

اینڈرسن : ابتدائی چیمبر جہاں آقا اپنے قابل خدام کو بلایا کرتے تھے اب بھی موجود ہے۔ یہ کمرہ ابھی تک سیل بند ہے اور کوئی اسے چھو نہیں سکا ہے۔ یہ حالت اس وقت تک رہے گی جب تک انسانیت ان علوم کو حاصل کرنے کے قابل نہیں ہو جاتی۔ اس کمرے میں وہ دروازہ پوشیدہ ہے جو اہرام کے نیچے زیرِ زمین کمروں تک جاتا ہے۔

سوال : یہ کمرہ (Chamber) کب تک دریافت ہو گا ؟

اینڈرسن : سن دو ہزار سے پہلے ممکن نہیں ہے۔

سوال : دنیا کا ردِ عمل کیا ہو گا ؟

اینڈرسن : (ہنستے ہوئے) حیرت کے بڑے اسرار سامنے آئیں گے۔ بے شمار نئی کتابیں لکھی جائیں گی۔ بے شمار موجودہ معلومات غلطیوں سے پُر نظر آئیں گی۔ تاہم دنیا اس وقت ان سب باتوں کے لیے تیار ہو گی اور ہماری اپنی ثقافت اور تہذیب ایک سنہرے دور میں داخل ہو جائے گی۔ اسی لیے تو انہوں نے معلومات وہاں ذخیرہ کی ہوئی تھیں تاکہ آنے والی نسل خوش حال اور خوش کمال ہو سکے۔ ان معلومات کے ساتھ یقیناً چند ایک اصول بھی ہیں جن کے تحت یہ معلومات کام میں لائی جا سکیں گی۔ ہم ان کی کئی خامیوں اور اغلاط سے فائدہ اٹھا سکیں گے اور صحیح معنوں میں دنیا کے وارث کہلائیں گے۔ زندگی میں اور بے شمار باتوں کی طرح اینڈرسن کے تنویم زدہ بیانات کی ریکارڈنگ نے بھی ہمارے سامنے کئی اسرار لا کھڑے کیے ہیں۔ عظیم اہرام کے نیچے وسیع کمروں کا جال حیرت انگیز اور دماغ کو چکرا دینے والا ہے۔ تاہم شاید گم شدہ براعظم کی قدیم داستانیں حقیقت پر ہی مبنی ہوں اور اس معاشرے کی غلطیوں کو سامنے رکھ کر داناؤں کا ایک گروہ آنے والی نسلوں کو کسی عظیم تحفے اور صلاحیت سے نواز سکے۔

☆

امیدیں اور توقعات

تیس سالہ پیٹ فلے نیگن کا' جو بچپن ہی سے برقیات میں حیرت انگیز ذہانت کا مظاہرہ کرتا چلا آرہا ہے' امریکا کے ان ممتاز محققین میں شمار ہوتا ہے جو اہرام کی توانائی کے غیر معمولی میدان میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ گلین ڈیل' کیلیفورنیا کا یہ ذہین لڑکا مختلف ایجادات کر چکا ہے اور دو سو سے زیادہ پیٹنٹس (Patents) کا مالک ہے۔ کئی برس قبل جب ''لائف'' میگزین نے قوم کے ایک سو انتہائی اہم افراد کے بارے میں لکھا تو فلے نیگن کے لیے میگزین کے دو مکمل صفحات مختص کیے تھے جن میں ایک ایسا برقی آلہ تیار کرنے پر جس کی مدد سے بہرے لوگ سن سکتے تھے' اس کی سائنسی اور اختراعی صلاحیتوں کا بڑی فراخ دلی سے اعتراف کیا گیا تھا۔ فلے نیگن نے اپنا کام ایک خاص ریڈیو ٹرانسسٹر سے شروع کیا تھا۔ اس نے ریڈیائی لہروں کی فریکوئنسی میں ایسی ترمیم کی تھی کہ وہ اس کے اعصابی نظام میں سمعی حس کو چھونے لگی تھیں۔ فلے نیگن کو امید تھی کہ وہ عام سمعی اعصاب کو نظر انداز کر کے عصبی تحریکی لہروں کے ذریعے آواز کو سن لے گا۔ اس نے ریڈیو کو ایک چھوٹے سے ٹرانسسٹر سے منسلک کیا پھر اسے ایک ترمیم شدہ کن پوش (Earmuff) سے جوڑ دیا۔ بے شمار ابتدائی تجربات کے بعد اس نے اپنے کانوں کو بند کیا' اپنے اوپر کن پوش کو چڑھایا اور ریڈیو آن کر دیا۔ نتیجہ اس کے حسبِ منشا تھا۔ وہ آواز سن رہا تھا۔ فلے نیگن نے اپنی اس ایجاد کا نام ''نیوروفون'' رکھا اور یہ طریقہ ''نیوروسپشن (Neuroception) کہلایا۔ ''یہ آلہ برقی پیغامات کو بالکل اسی انداز میں دماغ تک پہنچاتا ہے جیسے آواز جسم کے اعصابی نظام میں سے گزرتی ہوئی دماغ تک پہنچتی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں شاید برسوں آگے نکل گیا تھا۔ اس ایجاد کو پیٹنٹ کرانے میں مجھے دس سال لگ گئے تھے۔''

فلے نیگن کی ایک اور ایجاد ''لیزر اسٹیریو کانفرنس سسٹم'' ہے۔ یہ ایک ایسا آلہ ہے جو انسانی آوازوں کو ایک پر شور کمرے میں الگ الگ بالکل ٹھیک انداز میں ریکارڈ کر سکتا ہے۔ اگر بعد میں اس کی نشر نگاری (Transcription) کی جائے تو ہر آواز بالکل صاف سنائی دیتی ہے۔ ''میری یہ مشین کسی کانفرنس یا سیمینار میں بیک وقت دو یا اس سے زیادہ آدمیوں کی آوازیں ریکارڈ کر سکتی ہے۔ اس میں لوگوں کے کھانسنے' کاغذات کو الٹنے وغیرہ کی آوازیں بھی ریکارڈ ہو جاتی ہیں۔ اس مشین کی بنیاد اسی تکنیک پر رکھی گئی ہے جس کے تحت انسانی نظام خلاء میں آوازوں کے مقامات کو شناخت کر سکتا ہے۔ یہ ''لیزر مائیکروفون میٹرکس'' کسی جگہ پیدا ہونے والی آوازیں ایک ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے سنتا ہے یہ آوازیں ایک ٹیپ پر منتقل ہو جاتی ہیں اور جب اس کو ری پلے کیا

جاتا ہے تو اسٹینو گرافر بتا سکتا ہے کہ آوازیں دراصل کس جگہ سے آ رہی ہیں۔ اس طرح آسانی سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کیا کہا گیا اور کس نے کہا ہے۔ اگر بیک وقت زیادہ افراد بول رہے ہوں تو سیکریٹری ٹیپ کو ری پلے کر کے ہر آواز کو الگ الگ نقل کر سکتا ہے۔ پیٹ فلے نیگن کی حالیہ دلچسپیوں میں اہرام اور اس کی طاقت سرِ فہرست ہیں۔ اسے یقین ہے کہ اہرام کی شکل اور ساخت میں ایک خاص توانائی پنہاں ہے جسے وہ ''بایو کاسمک انرجی'' (Biocosmic Ener-gy) کا نام دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ طویل عمری کا راز ہی بایو کاسمک انرجی ہے۔ ''موت توانائی اور اعضاء کے انحطاط کی وجہ سے آتی ہے۔'' فلے نیگن نے کہا۔ ''تاریخ بایو کاسمک انرجی کے غیر معمولی مظاہر اور مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ مصری ممیاں' بائبل کی کشتی نوحؑ اور میتھوزلہ (Methuselah) ایک بطریق جس نے ۹۶۶ سال کی عمر پائی) اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ موجودہ زمانے میں بھی یہ دیکھا گیا ہے کہ جو جانور گھومتے گھامتے اہرام کے اندر چلے گئے اور پھر مر گئے ان کے اجسام چند برسوں بعد مکمل طور پر ممیائے ہوئے پائے گئے۔ فلے نیگن کو یقین ہے کہ اہرام اور بایو کاسمک انرجی کو عملی طور پر استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ ''اس کا استعمال دنیا میں بھوک کا خوفناک مسئلہ حل کر سکتا ہے'' اس نے کہا۔ ''ہم خوردنی اجناس مثلاً گندم وغیرہ کو خراب اور برباد ہو جانے کے خوف کے بغیر غیر معینہ مدت تک محفوظ رکھ سکتے ہیں۔'' اس کا خیال ہے کہ کوئی بھی شخص مساوی الاضلاع مثلث والا ایک اہرام بنا کر اپنے لیے بایو کاسمک انرجی کا ذریعہ پیدا کر سکتا ہے۔ اس اہرام کی ایک سمت یا ضلع مقناطیسی شمال کے عموداً ہونا ضروری ہے۔ اہرام کی یہ شکل اس توانائی کی ضامن ہے۔ اہرام کی توانائی پر تحقیق کرتے وقت فلے نیگن نے لفظ پیرامڈ (Pyramid) کے معنی بھی دیکھے۔ پیر (Pyr) یونانی لفظ Pyro سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں آگ یا حرارت۔ امڈ (Amid) بھی یونانی لفظ ہے جس کا مطلب مرکز کے قریب یا وسط میں ہے۔ اس طرح لفظ پیرامڈ کا مطلب ہوا ''وسط میں آگ''۔ اس لیے میں اہرام کی توانائی کو ظاہر کرنے کے لیے کاسمک انرجی کی اصطلاح استعمال کرتا ہوں۔ روسی اس توانائی کو سائیکوٹرانک بایو پلازمک انرجی کہتے ہیں۔ یہی توانائی اصل میں قوتِ حیات ہے۔ یہ سدا سے موجود ہے مگر آج تک کوئی اسے الگ حیثیت سے نہیں سمجھ سکا یا کوشش ہی نہیں کی۔ غزہ کا عظیم اہرام' دنیا کا ساتواں مقدس عجوبہ' آخر کار دنیا کے سامنے اپنے اصل مقاصد کے ساتھ ظاہر ہو ہی گیا کہ وہ بایو کاسمک انرجی کا انتہائی طاقت ور منبع یا سرچشمہ ہے۔ اپنے ایک مضمون ''اہرام اور بایو کاسمک انرجی سے اس کا تعلق'' میں فلے نیگن لکھتا ہے کہ انسان صدیوں سے توانائی کی تلاش میں سرگرداں ہے''۔ اس توانائی یا قوت کے کئی نام ہیں۔ اسے لائف انرجی' بایو پلازمک انرجی' اوڈِک فورس' پرانا' مانا' میگنل' میگنم' این ریز' ایتھرک فورس' سائیکوٹرانک انرجی' انیمل میگنازم' کنڈالینی' کے آئی (KI) سی ایچ آئی CHI' وائیلٹ فلیم' میگنیٹک لائف فورس کہا جاتا رہا ہے۔ اس توانائی کے مختلف پہلوؤں پر حالانکہ سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں مگر اس کے ذرائع اور خواص

کے بارے میں جو آراء آج تک سامنے آئی ہیں وہ مذہب اور ساحری کے احاطے سے باہر نہیں نکل
لی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی تربیت یافتہ اور مستند سائنس دان نے اس طرف دیکھنے کی بھی
سارت نہیں کی ہے۔ اگر کوئی شخص اس موضوع پر لکھی جانے والی کم از کم تین سو کم یاب کتابوں
ر مسودات کو کھنگالنے کی زحمت گوارا کر لیتا تو بلاشبہ وہ جان لیتا کہ ان تمام توانائیوں میں چند
واص یقیناً ایسے ہیں جو سب میں مشترکہ ہیں۔ بہت جلد اس پر یہ بات بھی آشکار ہو جاتی کہ یہ تمام
م صرف اور صرف ایک ہی قسم کی توانائی کی نشان دہی کر رہے ہیں۔

پیٹ فلے نیگن کی کمپنیوں میں سے ایک "پیرامڈ پروڈکٹس۔ پی او باکس نمبر ۶۳۸۶' گلین ڈیل' بلیفورنیا ۹۱۲۰۵ ہے۔" بایو کاسمک انرجی پر لکھے ہوئے اس کے ایک مضمون کی کاپی کی قیمت تین الر ہے۔ اس قیمت میں کارڈ بورڈ کا بنا ہوا ایک اہرام اور اس کے بارے میں تجربات کے سلسلے میں ہدایت نامہ بھی شامل ہے۔ فلے نیگن کی ایک اور جامع کتاب "پیرامڈ پاور" بھی دستیاب ہے (۶ء۹۵ الر) جس میں ایتھرک پلازما سے لے کر کنڈالینی تک تمام توانائیوں کے بارے میں اس کے نظریات ور تحقیقی مواد موجود ہے۔ اس کتاب میں اہرام کی توانائی کا تجزیہ کرنے کے لیے ناپنے والے آلات کی شکلیں اور تفصیلات بھی موجود ہیں۔ اس کتاب میں کائنات کے ایتھرک میٹرکس (Etheric Matrix) کے ایک نئے نظریے پر بھی بحث کی گئی ہے۔

فلے نیگن کی ایک اور پروڈکٹ شی اوپس کے اہرام کا چھ فٹ مربع اور پچاس انچ لمبا خیمہ (Tent) ہے۔ اس خیمے میں اتنی گنجائش ہے کہ اس میں ایک بالغ آدمی آرام سے سا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس خیمے کے اندر جانے سے ان لوگوں کی حسیات تیز ہو جاتی ہیں جو ماورائی مراقبہ (Transcendental Meditation)' حیاتی باز افزائش یا انشراح (Biofeed Back)' الفاویوز (Alphawaves)' یوگا (Yoga) اور اسی قسم کی دیگر تکنیک کے حامل ہوتے ہیں۔

فلے نیگن کی ایک اور ایجاد (Product) بے حد دلچسپ ہے۔ یہ "a3×5-" کا تجرباتی پیرامڈ انرجی جنریٹر ہے جس کی قیمت ۵ ڈالر ہے۔ یہ اختراع ایک ایک انچ کے پندرہ اہراموں پر مشتمل ہے جن کی بنیاد (Base) میں میگنیٹک فیلڈ سورس موجود ہوتا ہے۔ اس اختراع کے لیے ضروری نہیں ہے کہ اسے قطب شمالی ہی سے تطبیق کیا جائے بلکہ کسی بھی سمت میں رکھنے سے اس کی

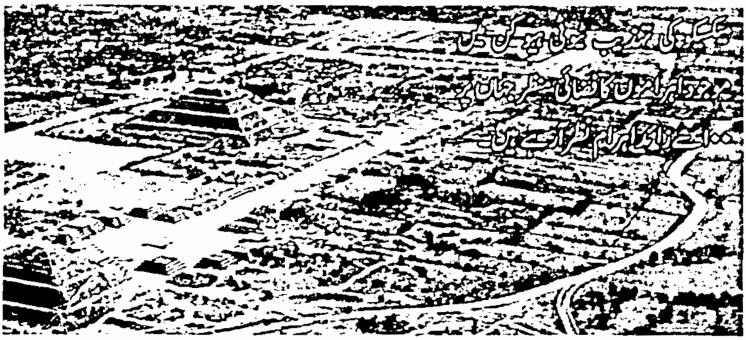

کار کردگی متاثر نہیں ہوتی۔ فلے نیگن کہتا ہے "انسٹنٹ کافی کا ایک کپ پانچ منٹ تک اس جنریٹر میں رکھ کر دیکھ لیں۔ آپ کو تازہ کشید کی ہوئی یا ملائی ہوئی کافی کا لطف آجائے گا اور جب آپ اس کے ذائقے سے مطمئن ہو جائیں تو کافی کے پورے جار کو جنریٹر میں رکھ دیں، اس کا ہر کپ آپ کو ایک نیا مزا دے گا۔ اس طریقے سے سستی شرابوں، جن اور ووڈکا وغیرہ کی تلخی کو کم کیا جا سکتا ہے۔"

جب اہراموں میں میری دلچسپی بڑھی تو میں نے فلے نیگن کا مضمون، اس کا پیرامڈ انرجی جنریٹر (PEG) اور کارڈبورڈ اہرام حاصل کر لیا۔ فلے نیگن نے کہا تھا کہ بایو کاسمک انرجی سگریٹوں کی تلخی ختم کر دیتی ہے۔ میں نے ایک سگریٹ دس منٹ تک PEG میں رکھی پھر اسے پیا تو نہ صرف اس کی تلخی کم ہو گئی تھی بلکہ اس کی خوشبو بھی بڑھ گئی تھی۔ اس رات میں نے پورا سگریٹ کا پیکٹ جنریٹر میں رکھ دیا۔ اگلی صبح سگریٹ کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ اس بات سے قائل ہو کر کہ اہرام کی توانائی واقعی کوئی چیز ہے میں نے کئی اور ٹیسٹ کیے۔

ریزر بلیڈ کی تیزی

میری داڑھی گھنی اور سخت ہے۔ مجھے ابھی تک کوئی ایسا الیکٹرک ریزر نہیں مل سکا تھا جو میرا نفیس شیو کر سکے۔ برسوں سے میں ریزر بلیڈ کمپنیوں کی طرف سے خار کھائے ہوئے تھا۔ ایسی ٹیکنالوجی بھی دستیاب نہ تھی کہ جس سے ایک بلیڈ دس، پندرہ بلکہ پچیس بار کارآمد ثابت ہو سکے مگر بلیڈ کمپنیاں جلد ہی ناکارہ ہو جانے والے بلیڈ بنا رہی تھیں۔ میں بازار جا کر جلیٹ سپر بلیو بلیڈ کا ایک پیکٹ خرید لایا۔ شیو کرنے کے بعد میں نے ہدایات کے مطابق اس بلیڈ کو فلے نیگن کے کاربورڈ اہرام کے اندر سطح سے ایک انچ اوپر رکھ دیا (کنگس چیمبر کی اونچائی)۔ ایک سستے سے کمپاس کی مدد سے کارڈبورڈ اہرام کو میں نے قطب شمالی کے جانب رکھ دیا۔ میں نے اس بلیڈ سے بیالیس دن تک بہترین شیو کیے۔ بیالیس دن کے بعد اس کا معیار گر گیا۔ میں نے پیکٹ میں سے دوسرا بلیڈ نکالا اور اسے اہرام میں سے گزار کر مزے سے استعمال کرنے لگا۔ دو سال ہونے کو آئے ہیں میرے بلیڈ کے خرچ میں بے حد کمی آچکی ہے۔

مچھلی کی خوراک کا طاقتور ہو جانا

جس شخص کے پاس بھی حاری مچھلیوں (Tropical Fish) کا ماہی خانہ (Aquarium) ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے اس چھوٹی سی مخلوق کو زندہ رکھنے میں کتنے مسائل ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ان کی خوراک کو بھی اہرام زدہ کر دیا جائے۔ رات بھر کے لیے میں نے ان کی خوراک کو جنریٹر (PEG) میں رکھ دیا پھر صبح مچھلیوں کے ایک نئے گروپ کی اس سے ضیافت کر دی۔ آج تک نئی مچھلیوں کا وہ گروہ ہر قسم کی بیماری سے دور ہے۔ ہو سکتا ہے وہ زیادہ سخت جان قسم کی مخلوق ہوں بہر حال میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ خوراک کو توانائی بخش بنانے سے میرا ایکویریم زیادہ زندہ دل مچھلیوں کا مسکن بنا ہوا ہے۔ چند ماہ بعد میرے کچھ تجربات ناکام ہونے شروع ہو گئے۔ میں نے کارڈ

ورڈریزر بلیڈ شارپنر کا مقام بدل کر اسے کھڑکی کے قریب رکھ دیا۔ بلیڈیں اس میں رکھنے کے باوجود
بھی ناکارہ ہی رہیں۔ بعد میں مجھے پتا چل گیا کہ ریڈیو' ٹیلی وژن سیٹ' ریڈی ایٹر' دیواریں اور
کھڑکیاں اہرام کی توانائی کے بہاؤ میں رکاوٹ پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اہرام کو میں نے واپس
وسط میں رکھ دیا تو پھر مثبت اور بہتر نتائج حاصل ہونے لگے۔ پیٹ فلے نیگن کا خیال ہے کہ اس کا
اہرامی خیمہ اس کی جنسی توانائی کو بہتر بنا دیتا ہے۔" تاہم میں اپنی اس ایجاد کو جنسی محرک کے طور پر
مشتہر کرنا نہیں چاہتا۔" اس نے کہا۔ ایکٹریس گلوریا سوانسن اپنے بستر کے نیچے ایک چھوٹا سا اہرام
رکھ کر سوتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس طرح اس کے جسم کا "ہر خلیہ جھنجھنا اٹھتا ہے"۔ ایکٹر جیمس کو
برن اکثر اپنے اہرامی خیمے میں بیٹھ کر مراقبہ کرتا ہے پھر اپنی بلی اور اس کے بچوں کو چھوٹے چھوٹے
اہراموں سے بنے ہوئے بستر پر سلا دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ بلی کے یہ بچے بڑے ہو کر بے مثال
بلیاں بن جائیں گی۔ ٹیکساس میں ہوسٹن کے ایک ڈاکٹر نے جرثوموں (Microbes) کو ایک
چھوٹے سے اہرام میں رکھا تو پتا چلا کہ اہرام سے باہر والے جرثوموں کے مقابلے میں وہ جرثومے
چوسٹھ گھنٹے زیادہ دیر تک زندہ رہے تھے۔ فرانس اور چیکوسلواکیہ سے آنے والی رپورٹوں کی وجہ سے
اہرام کی توانائی میں دلچسپی کچھ اور بڑھ گئی۔ یہ بات اس وقت سے شروع ہوئی تھی جب ستر سال قبل
محققین کو ایک ایسی مردہ بلی ملی تھی جس کا جسم گل سڑ جانے کے بجائے نابید (Dehydrated) یا
ممی بن گیا تھا اور یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا تھا کہ بلی کی وہ لاش اہرام کے اندر تھی۔ ان تجزیوں سے
بہت کچھ سیکھ کر پراگ کے ایک ریڈیو انجینئر کارل ڈربل نے اہرام پر مزید تجربات کرنے شروع کر
دیے۔ چیکوسلواکیہ میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ترویج کے بانی ڈربل کے پاس اب عظیم اہرام کے کارڈ
بورڈ کے ماڈل کا چیک پیٹنٹ نمبر ۹۱۳۰۴ ہے۔ یہ ماڈل ریزر بلیڈ شارپنر کے طور پر پیٹنٹ ہے۔
امریکا میں ڈربل کے اس پیٹنٹ کے حقوق ٹوتھ پیرامڈ کمپنی کے میکس ٹوتھ کے پاس ہیں۔

"ان پیرامڈ پاور" (In Pyramid Power) فری وے پریس نیویارک ۱۹۷۴ء میں
مصنفین میکس ٹوتھ اور گریگ نیلسن نے کارل ڈربل کی کتاب کا ایک باب بھی شامل کیا ہے جس میں
اس نے اپنے اس بے مثال پیٹنٹ کے بارے میں تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ ڈربل کو یہ پیٹنٹ
حاصل کرنے میں دس سال کا عرصہ لگا تھا جب کہ عام طور پر تین سال سے زیادہ وقت نہیں لگنا
چاہیے تھا۔ ڈربل نے دیکھا کہ اہرام کے اندر ایک استعمال شدہ بلیڈ رکھنے سے اس کی دھار دوبارہ تیز
ہو جاتی ہے۔ اپنے دوست سے حوصلہ افزائی پا کر اس نے مذاقاً اپنی اس ایجاد کے پیٹنٹ کے لیے
درخواست دے دی۔ وہ جانتا تھا کہ اہرام بلیڈ کی دھار کو دوبارہ تیز کر دیتا تھا مگر ڈر بھی رہا تھا کہ چیک
پیٹنٹ کمیشن والے کیا سوچیں گے۔ ڈربل کے پیٹنٹ کے آخری پیراگراف میں لکھا ہے:

"یہ ایجاد خاص طور پر ایک مخصوص اہرامی شکل کے نمونے پر مشتمل ہے۔ مگر اس مخصوص
شکل کی کوئی قید نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی بھی غیر موصل مادے سے بنائی ہوئی اور کوئی بھی
جیومیٹرک شکل کارآمد ثابت ہو سکتی ہے مگر اس کا استعمال اس انداز میں ہونا چاہیئے جو اس ایجاد کے
ضمن میں بتایا گیا ہے۔ اس خلاء میں جو اس شکل سے بنتا ہے ایک تجدیدی عمل شروع ہو جاتا ہے جو

خودکار انداز میں ریزر بلیڈ کے کناروں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ عمل بلیڈ کے کناروں پر 'استعمال کی و
سے طبعی اور میکانکی صفات میں پیدا ہونے والی تخفیف یا "تھکاوٹ" دور کر کے اسے نئی زندگی
پہلے سے بہتر زندگی عطا کر دیتا ہے۔" ڈربل نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ ریزر بلیڈ کے
استعمال ہونے والی اسٹیل اعلیٰ درجے کی ہونی چاہئے۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ اہرام کے اندر کے خ
کو کسی طریقے سے میگنیٹک 'گریویٹک 'الیکٹرو اور دوسری قسم کی توانائی کی فیلڈس سے زیادہ طاقت
بنایا جاسکتا ہے۔ آخر توانائی کی یہ غیر معمولی قسم ہے کیا؟ ڈربل کا کہنا ہے کہ بہت چھوٹے طولِ م
(Wave Length) کے مائیکروویوز ایسے ہم آہنگ اثرات پیدا کرتے ہیں جن سے آبید گی-e
(hydration) بڑھ جاتی ہے۔ اہرام کی شکل اور ساخت ان ننھی مائیکروویوز کو ذخیرہ کرتی ہیں
سے الیکٹرو میگنیٹک ڈی ہائیڈریشن پیدا ہوتا ہے۔

یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ برق مقناطیس جان دار اور غیر جان دار دونوں قسم کے مادوں پ
انداز ہوتی ہے۔ حال ہی میں صدیوں پرانے نظریہ ایتھرک فلیوڈ (Etheric Fluid) کی
الیکٹرو میگنیٹک ریڈی ایشن اسکیل (Electromagnetic Radiation Scale) نے
لی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ یہ طریقہ کس طرح کام کرتا ہے مگر ہم یہ ضرور جانتے ہیں اس اسکیل
بے اندازہ ارتعاش ہوتے ہیں جو ہزاروں لاکھوں برسوں تک جاری رہتے ہیں۔ دیگر طولِ موج
پیدا کی جاسکتی ہے جو ناقابلِ یقین نظر آتی ہے یعنی

(10,000,000,000,000,000,000,000)

ارتعاش فی سیکنڈ ہے۔ برق مقناطیسی لہروں کا سفر بھی دماغ کو چکرا کر رکھ دیتا ہے کیونکہ ا
رفتار ۱۸۶ ملین میل فی سیکنڈ ہے۔ لہروں کی اس رفتار کے پیچھے کس قدر قوت کار فرما ہے ا
وضاحت سائنس کے بس کی بات نہیں ہے۔ آج کے دور کے ریڈیو' ٹیلی وژن' راڈار' اوون او
طرح کی دیگر برقی ایجادات میں اسی طرح کی الیکٹرو میگنیٹک لہریں استعمال ہو رہی ہیں۔
سائنس داں کے بقول "ہم ان چیزوں سے بلاشبہ فائدہ اٹھا رہے ہیں مگر نہیں جانتے کہ یہ کام
کرتی ہیں۔" اہرام کی توانائی کے بارے میں مزید تحقیقات ال مینگ (Al Menning) نے کی
جس کا تعلق ای ایس پی لیباریٹری ۷۵۵۹ سانتا مونیکا بلیوارڈ لاس اینجلس کیلیفورنیا ۹۰۰۹۶
ہے۔ مینگ نے یونیورسٹی آف کیلیفورنیا سے بڑی عزت اور امتیاز کے ساتھ گریجویشن کیا تھا
کے پاس بزنس ایڈ منسٹریشن کی ڈگری تھی۔ وہ سرٹی فائڈ پبلک اکاؤنٹنٹ اور ایرو اسپیس کارپو
ایگزیکٹو تھا۔ زندگی کے ماورائی پہلوؤں میں دلچسپی میں اضافے کے بعد اس نے ای ایس پی کی
تحقیقی لیباریٹری قائم کی۔ اس وقت مینگ دیگر تجربہ کرنے والے محققین کے ایک گروپ
ساتھ اہرام کے بارے میں ایک غیر معمولی تحقیقی پروگرام میں مصروف ہے۔ "ہم اس و
دریافت کر رہے ہیں کہ" مینگ نے ایک انٹرویو کے دوران میں بتایا" اہرام کی ہندسی شکل
طاقت میں اضافہ کر دیتی ہے۔ یہ مذہبی لوگوں کی روحانی مناجات اور منتوں میں توانائی اور قبو
باعث بنتی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم نے کئی لحاظ سے بڑی غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے۔"

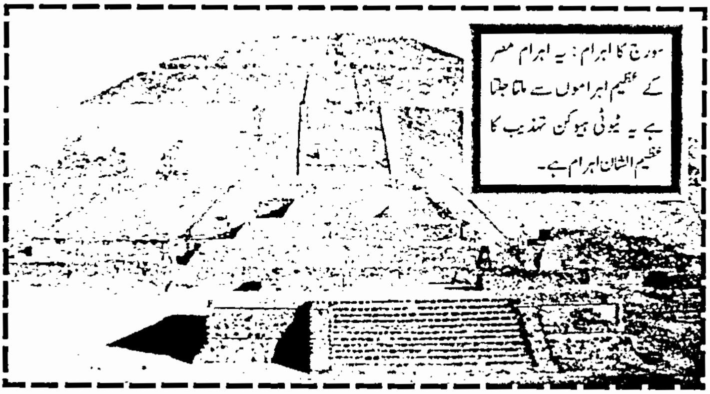

سورج کا اہرام: یہ اہرام مصر کے عظیم اہراموں سے ملتا جلتا ہے یہ ٹیوٹی ہیوکن تہذیب کا عظیم الشان اہرام ہے۔

کارڈبورڈ کا ایک چھوٹا سا اہرام دیتا ہے اس کے ساتھ مثلث شکل میں کٹے ہوئے کاغذوں کی کئی شیٹس ہوتی ہیں۔ نیلے رنگ کا کاغذ صحت یابی کے لیے اور سبز رنگ کا محبت کے لیے ہے۔ میننگ نے بتایا۔ ''نارنجی رنگ دماغی توانائی کے لیے' زرد رنگ وجدان کے فروغ کے لیے ہے۔ تجربہ کرنے والا اپنی ضرورت کے مطابق رنگ کا کاغذ منتخب کرتا ہے پھر اس پر اپنی طلب لکھ دیتا ہے۔'' مثال کے طور پر اگر وہ شخص اپنی کسی بیماری سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے تو وہ نیلے رنگ کے کاغذی مثلث کا انتخاب کرتا ہے اور اس پر اپنا مقصد لکھ دیتا ہے۔ میننگ کہتا ہے کہ یہ درخواست صاف اور سادہ زبان میں لکھنی چاہیئے۔ پھر وہ شخص اس کاغذ کو اپنی ہتھیلیوں کے درمیان میں دبالیتا ہے پھر اسے نیچے سے موڑتا ہے اور اس طرح سے تین تہوں میں کرلیتا ہے۔ اس کے بعد اس کاغذ کو کارڈبورڈ کے اہرام کے اندر شمالاً جنوباً رکھ دیتا ہے۔ میننگ اس طریقے کو ''خیالی شکل'' (Thought Forms) کا نام دیتا ہے۔ اہرام میں اس کاغذ کو رکھ دینے کے بعد سینے کا (Incubation) کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس عمل میں تین سے نو دن کا عرصہ لگتا ہے۔ پھر اس کاغذ کو اہرام میں سے نکال کر جلا دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے گویا خیالی صورت کو آزادی نصیب ہو جاتی ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی پرندہ اپنے گھونسلے میں سے نکل کر کھلی فضاء میں آ گیا ہو۔ ایک بار جب خیال پختگی اختیار کر لیتا ہے تو اسے پھر گویا مقصد کے حصول کے لیے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ پھر انتظار کا عرصہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس عمل میں کاغذ کو جلانے والے عمل کی بھی بڑی اہمیت ہے کیونکہ آگ کو ایک طاقتور ترین مقدس عنصر سمجھا جاتا ہے۔ پھر یہ خیالی صورت یوں توانائی پاکر حقیقت کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔

بہ ظاہر یہ باتیں مذہبی رسوم یا ٹونے ٹوٹکے جیسی لگتی ہیں مگر میننگ کے ان ای ایس پی تجربات کے بارے میں جو رپورٹیں ملی ہیں وہ خاصی تسلی بخش ہیں۔ ''پہلے میں یہی سمجھا کہ یہ کسی قدیم قلم میں دکھائی جانے والی رسمیں (Ritual) ہیں'' جیمس ڈریک نے اس طریقے کی آزمائش کرنے کے بعد کہا۔ سخت مقابلے و مسابقت کی وجہ سے ڈلاس میں میرا کاروبار روبہ زوال تھا۔ میں کاروبار کو فروخت کر کے ریٹائر ہونے کی سوچ رہا تھا ایک نوجوان عورت نے جو پراسرار علوم کی طالبہ تھی' مجھے اہرام اور ''خیالی شکل'' کے بارے میں بتایا۔ میں نے خود کو بڑا احمق سا محسوس کیا مگر پھر فیصلہ کیا کہ کر کے دیکھ

لینے میں کیا حرج ہے۔" ڈریک نے ہدایات پر عمل کیا۔ "حالات چونکہ بہت خراب تھے اس لیے میں نے اپنی 'خیالی شکل' والے کاغذ کو دس روز تک اہرام میں رہنے دیا۔" اس نے بتایا "میں اس تجربے کا ریکارڈ رکھ رہا تھا۔ دو ہفتے بعد مجھے اپنے کاروبار کے لیے پیش کش موصول ہوئی۔ ان حالات میں وہ پیش کش میری توقعات سے کہیں زیادہ بہتر تھی۔ وہ خریدار ایک شام ٹہلتا ہوا اس طرف نکل آیا تھا۔ اس روز کے بعد سے وہ مسابقت بھی ختم ہو گئی اور اب وہ شخص خاصا اچھا جا رہا ہے یعنی وہی کاروبار جو میرے پاس تقریباً ختم ہونے کے قریب تھا اب خوب پھل پھول رہا ہے اور مجھے بھی اس کی اچھی قیمت مل گئی ہے۔ اب جب کبھی مجھے یا میری بیوی کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو ہم ان رنگین کاغذوں کی شیٹوں پر اپنی خواہش یا ضرورت کو لکھ کر اہرام کے اندر رکھ دیتے ہیں اور اپنا مقصد حاصل کر لیتے ہیں"۔ تحقیقی گروپ کے دوسرے اراکین نے بھی اسی قسم کے غیر معمولی نتائج کی رپورٹ دی ہے۔ "کچھ لوگوں کو مطلوبہ ملازمتیں مل گئیں۔ چند ایک اپنے موذی امراض سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے"۔ ال مینگ نے بتایا۔ "دولت اور سرمایہ کاری ان کے پسندیدہ مقاصد تھے۔ کئی تجربات کے نتائج بڑے مثبت نکلے تھے۔"

ای ایس پی لیبارٹری کے کیلیفورنیا ہیڈ کوارٹر میں چھ اور آٹھ فٹ کے دو اہرام ہیں۔ ال مینگ ان بڑے بڑے اہراموں سے ہر وقت تجربات کرتا رہتا ہے۔ "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ انسانی جسم کی طرح اہرام میں بھی توانائی کے کئی مقامات ہیں۔" اس نے کہا۔ "ہمارے اسی فیصد شریک کار نے بتایا کہ انہوں نے اہرام میں توانائی کے کئی مراکز دریافت کیے ہیں۔ تقریباً ہر شخص اس بات پر متفق ہے کہ اہرام کے اوپر والے دو تہائی حصے میں سب سے زیادہ توانائی ہوتی ہے اور نچلے حصے میں بھی سب ہی نے ایک حرارت آمیز اور سنسنی خیز فرحت کی نشان دہی کی ہے۔" مینگ کا کہنا ہے کہ اہرام سے برے اثرات بھی ظاہر ہو سکتے ہیں۔ اہرام کے بعض مقامات انسانی صحت کے لیے ضرر رساں بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس نے بتایا۔ "بعض افراد نے کچھ وقت اہرام کے اندر گزارنے کے بعد سر درد کی شکایت کی ہے"۔ "دی سائیکک ورلڈ آف کیلی فورنیا" کے مصنف ڈیوڈ سینٹ کلیئر نے حال ہی میں مینگ کے ساتھ دس منٹ اہرام کے اندر گزارے ہیں۔ جب وہ اہرام سے باہر آئے تو سینٹ کلیئر بڑا مضمحل دکھائی دے رہا تھا۔ اگلی صبح اس نے مینگ کو ٹیلی فون کر کے حسبِ وعدہ آنے سے معذرت کر لی اور بتایا کہ اسے نیند آ رہی ہے۔ اس سے اگلی صبح جب وہ بیدار ہوا تو خود کو پہلے سے زیادہ چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ کئی لوگوں نے مراقبے کے لیے اہرامی خیمے خرید لیے ہیں۔ انہوں نے رپورٹ دی ہے کہ مراقبے کے بعد انہوں نے خود کو بے حد پر سکون اور ہشاش بشاش پایا ہے۔ "میرے شعور کو گویا جلا مل گئی ہے۔ میں خود کو ذہنی طور پر بے حد مستعد محسوس کرتا ہوں"۔ ایک شخص نے خیمے کے تجربے کے بعد بتایا۔ "میں خود کو بے حد پر سکون اور مطمئن محسوس کر رہا ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ خیمے کے اندر باہر کی دنیا کا شور بالکل سنائی نہیں

دیتا۔ میرے خیالات بڑے صاف اور واضح ہو گئے ہیں۔ اب ذہن میں انتشار نہیں ہے۔ وہاں خیالات کا ہجوم نہیں ہے بلکہ اب میں اپنی توجہ ایک ہی بات پر پوری طرح سے مرتکز کرنے کے قابل ہو گیا ہوں۔'' بعض افراد نے بتایا کہ اہرامی خیمے میں مراقبے کے بعد وہ ذہنوں پر چھائے ہوئے گرد و غبار اور فکر و پریشانی سے نجات حاصل کر چکے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ ان کی ذہانت اور باخبری میں گراں قدر اضافہ ہو گیا ہے اب وہ خود کو عالم گیر کائناتی شعور کا حصہ سمجھنے لگے ہیں اور یہ کہ وہ اس وسیع کائنات کا ایک اہم حصہ ہیں۔ مگر ہر شخص اہرام کے اندر مراقبے کو اتنی اہمیت نہیں دیتا۔ جیمز مولن' سدرن کیلی فورنیا پیرا سائیکولوجی فاؤنڈیشن' سان ڈیاگو کا ریسرچ ڈائریکٹر ہے۔ وہ خبردار کرتا ہے کہ اہرامی خیمے کے اندر زیادہ دیر تک مراقبہ نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کا کہنا ہے کہ جاندار چیزیں اہرام کے اندر روبہ زوال نہیں ہوتیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اہرام کی توانائی بیکٹیریا کو مار دیتی ہے جو اس کے زوال کا باعث بنتی ہے۔ کیونکہ خیمہ میں اچھے اور برے دونوں قسم کے بیکٹیریا ہوتے ہیں اس لیے اہرام کے اندر زیادہ رہنا صحت کے لیے مضرت رساں ہو سکتا ہے۔ آج تک مضر اثرات کے سلسلے میں ای ایس پی لیبارٹری تک جو رپورٹ پہنچی ہے وہ یہی ہے کہ کبھی کبھی سر میں درد ہو جاتا ہے۔ اگر آپ اہرام کی توانائی کے بارے میں مزید تجربات کے خواہش مند ہیں تو مندرجہ ذیل فرمیں اہرام اور ان کے بارے میں ہدایات مہیا کرتی ہیں۔

۱۔ ایسٹرل ریسرچ کمپنی (Astral Research Company) پی او بکس A-۵۸۳' ڈیٹرائٹ مشی گن ۴۸۲۳۲۔ یہ فرم ایک ماڈل اہرام' لٹریچر اور ایک عارفانہ اہرام (Mystic Py-ramid) جس کے ذریعے درون بینی تجربات کیے جا سکتے ہیں' سپلائی کرتی ہے۔ اس کے ذریعے دیکھنے والے کو شبیہیں' انسانی اشکال اور عجیب و غریب مناظر نظر آتے ہیں۔

۲۔ ای ایس پی لیبارٹری ۷۵۵۹' سانتا مونیکا بلیوارڈ لاس اینجلس کیلی فورنیا ۹۰۰۴۶۔ ڈائریکٹر ال مینگ ہدایات کے ساتھ کئی قسم کے اہرام فراہم کرتا ہے۔

۳۔ پیٹ فلے نیگنس پیرامڈ پروڈکٹس پی او بکس ۶۳۸۶ گلین ڈیل' کیلی فورنیا ۹۱۲۰۵۔ جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں فلے نیگن کے اہرام کے کئی ماڈلوں کے علاوہ اس موضوع پر کتابیں اور مضامین بھی ہیں۔

۴۔ ٹوتھ پیرامڈ کمپنی ۶۰ / ۱۸' ۲۴۸ ویں اسٹریٹ نیویارک این وائی۔ میکس ٹوتھ امریکا میں اہرام کے نمونے بناتا اور فروخت کرتا ہے جس کے حقوق اس نے ڈاکٹر ڈربل اور چیک موجد سے حاصل کر رکھے ہیں۔

اہرام۔ قدیم آثار کا عظیم اسرار

اہرام کی حیرت انگیز اور متنازعہ دنیا کا ہمارا سفر اختتام کو پہنچا۔ اس غیر معمولی موضوع پر ہم نے اگنیشئں ڈونلے (Ignacious Donnelly) اور میڈم بلاوٹسکی کے بیانات بھی پڑھے اور مصری

حنوط کاری' اہرام کی توانائی اور غیر ارضی مخلوق کی امکانی آمد کا کھوج لگانے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ ہم نے اہراموں کے مقاصد' استعمال اور تعمیر کے سلسلے میں مختلف افکار اور نظریات کا جائزہ بھی لیا۔ اگر ہم ان اہراموں کی تعمیر کے اسباب پر غور کریں تو مندرجہ ذیل نظریات سامنے آتے ہیں۔

یہ اہرام ستاروں سے ہمارے رابطے کا ذریعہ ہیں

اگر کبھی اور جب کبھی کسی دوسرے سیارے سے ہمارا رابطہ ہوا تو بتایا گیا ہے کہ وہ امکانی رابطہ ریاضی کی زبان میں ہوگا۔ یہ بات قریب القیاس ہے کہ ازمنۂ قدیم میں کسی وقت آنے والی دوسری دنیاؤں کی غیر ارضی خلائی مخلوق نے غزہ کا عظیم اہرام کسی خفیہ پیغام (Coded Mes-sage) کے طور پر تعمیر کیا ہو۔ یہ پیغام یا معلومات ممکن ہے کہ اہرام کی جہتوں میں پوشیدہ ہو یا اندر کسی خفیہ کمرے یا چیمبر میں بہ حفاظت مقفل ہو۔ عجب ستم ظریفی ہے کہ ہزاروں برس گزر جانے کے باوجود آج تک وہ پیغام ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے اور تمام تر ارتقاء کے باوجود وہ راز ابھی تک راز ہے۔ ایک اور امکان یہ ہے کہ یہ اہرام ہماری کائنات کا ایک نمونہ (Model) ہے۔ اس نظریے کے تحت یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ کائنات کی صورت اہرام جیسی ہی ہے۔ مختلف سنگی قطاریں (Tiers) کائنات کی مختلف جہتوں کی نشان دہی کرتی ہیں۔ بادشاہ اور ملکہ کے چیمبرس اور دوسرے کمرے (خلاء اور وقت میں) آفاقی قوتوں کی علامت ہیں اور اہرام کی راہ داریاں مثلثی کائنات کے "کھلے" راستوں کا پتا دے رہی ہیں۔ جہاں یہ معلوم کائنات ہمارے خلائی سفر کے استعداد سے کہیں زیادہ وسیع و عریض ہے وہیں ممکن ہے کہ اہرام کی یہ راہ داریاں ان کھلے راستوں کی نشان دہی کر رہی ہوں جن پر چل کر ہم کائنات کی تسخیر کا کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ یو ایف اوز نے شاید زمان و مکاں کی مسافت پر قابو پا کر کائنات کی چوٹی (اہرام) سر کر لی ہے اور اب وہ اس چوٹی سے نیچے آ کر زیادہ وسیع میدانوں کو کھنگالنے میں مصروف ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک دور از کار نظریہ ہے جو محض قیاس پر مبنی ہے۔

یہ اہرام قدیم علوم کی لائبریری ہیں

حالانکہ انسانوں کو اس زمین پر بستے بیس لاکھ سال ہونے کو آئے ہیں مگر اب بھی ہم ماضی کی عظیم تہذیبوں کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ سیلانی (Erratics)' غیر مکانی (OOP's) اور اسی قسم کی دیگر اشیاء کی موجودگی سے پتا چلتا ہے کہ قدیم تہذیبوں میں کہ وہ سائنس کی چند ایک شاخوں میں خاصی ترقی یافتہ تھیں، پھر کسی انتہائی ہولناک طوفان اور تباہی کے خطرے کے پیش نظر ہمارے ان آباؤ اجداد نے اپنی بیش قیمت کتابیں' ریکارڈ اور تواریخ کو عظیم اہرام کے کسی خفیہ چیمبر میں رکھنے کا فیصلہ کیا ہوگا تاکہ وہ اس تباہ ناکی سے محفوظ رہ سکیں۔ شی اوپس کے اہرام میں ایسے تقریباً تین ہزار سات سو مسودات اور اشیاء کا خزانہ دفن ہے۔

یہ اہرام ہمارے لیے گم شدہ براعظم ایٹلانٹس کا ایک سراغ ہیں

افلاطون کے زمانے میں اس بات کا سراغ یا شہادت ملتی رہی ہے کہ یہ اساطیری براعظم واقعی موجود تھا۔ اس ضمن میں ہم سب سے بڑی شہادت کو مسلسل نظر انداز کرتے چلے آرہے ہیں اور وہ ہیں سطح مرتفع غزہ اور دنیا کے دیگر علاقوں میں بکھرے ہوئے جناتی پتھروں کے آثار اور ڈھیر۔ یہ کہہ کر کہ اہرام دراصل ایٹلانٹس کی باقیات ہیں ہم گویا ایک اسرار کا جواب دوسرے اسرار سے دیتے ہیں۔ جب تک کوئی اور واضح شہادت سامنے نہیں آجاتی ہمیں اسی امکانی نظریے پر صبر کرنا چاہئیے۔

یہ اہرام گم شدہ توانائی کی کنجی ہیں

ہم پڑھ چکے ہیں کہ اہرام کے خلاء میں سے کسی قسم کی توانائی کا مسلسل اخراج ہوتا رہتا ہے۔ کیلی فورنیا کا پیٹ فلے نیگن اور دوسرے افراد اس توانائی کے مخرج کا سراغ لگانے کے لیے تحقیق و تفتیش میں مصروف ہیں۔ ہم ابھی تک اس توانائی کی اصلیت اور ماہیئت کو نہیں جان سکے ہیں مگر اس حقیقت میں کوئی شائبہ نہیں ہے کہ یہ موجود ہے۔ اگر یہ اہرام کائناتی توانائی کے میدان کی کنجی ہیں تو پھر ہمارے سامنے کئی لاینحل سوالات آکھڑے ہوئے ہیں کہ یہ اہرام کس نے تعمیر کئے؟ اس توانائی کے بارے میں انہیں کیسے علم ہوا؟ اس قدر بھاری بھر کم سنگی تعمیرات کی زبان میں پیغام چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی؟

یہ اہرام زمین کی نگرانی کر رہے ہیں یا اسے چلا رہے ہیں (Monitoring)

ایک بار پھر ہم اسی نظریے کی طرف چلتے ہیں جب پرانے زمانوں میں قدیم خلاء نورد آسمان کی وسعتوں کو چیرتے ہوئے زمین پر آیا کرتے تھے۔ ان ستارہ مکینوں کی آمد' بائبل کے معجزات' ماضی کے حیرت انگیز واقعات' مذہبی فرشتوں' عظیم الشان سنگی یادگاروں اور اسی قسم کی دوسری محیر العقول چیزوں کو ایک لڑی یا ایک نظریے میں پرو دیتی ہے۔ ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ واقعی قدیم زمانے میں کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہماری زمین پر آئی تھی۔ شاید جیسا کہ کچھ محققین کا خیال ہے' انہی ستارہ مکینوں نے زمین پر انسان کے ہم شکل (Homo Sapiens) کا بیج بویا تھا۔ اگر انسان واقعی بین السیارہ جاتی تجربے کی تخلیق ہے تو پھر یہ تخم ریز وقتاً فوقتاً فضائے بسیط میں اس مٹی کی گیند پر اپنی کارکردگی کا مشاہدہ کرنے ہی آتے رہے ہیں۔ اور دور سے بھی اس کی حرکات پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ان نگہداشت کے لیے ظاہر ہے کہ انہیں کسی نظر داری کے نظام (Bugging System) اور ایک ایسے بین السیارہ جاتی ٹرانسمٹر (Inter-galactic Transmitter) کی ضرورت تھی جس کی مدد سے وہ ہمارے سیارے کو مانیٹر کرسکیں۔ یہ عظیم اہرام ان کا نظر داری کا آلہ (Bugging Device) ہو سکتا ہے جہاں سے یہ برق مقناطیسی

لہروں کے ذریعے پیغام کی ترسیل میں مصروف ہے۔ یا شاید اس اہرام میں کسی خفیہ مقام پر کسی پوشیدہ چیمبر میں انہوں نے کوئی ٹرانسمٹر نصب کرر کھا ہے۔

اگر اب بھی آپ کا دماغ نہیں چکرایا تو ذرا درج ذیل منظر نامے پر نظر ڈالیئے۔ وقت کی دبیز کہر میں چھپے دورِ ماضی میں شاید پانچ لاکھ سال پہلے ستارہ مکیں جاں بازوں کی ایک ٹیم اس زمین پر آئی۔ ان کی آمد کا مقصد شاید محض مہم جوئی تھا' اس کرۂ ارض کی کھوج اور تحقیق تھا یا وہ اس پس ماندہ سیارے پر اپنی تہذیب کی تخم ریزی کرنے آئے تھے یا شاید وہ اس جھگڑالو اور مسابقت پسند مخلوق کے لیئے جسے انسان کہا جاتا تھا' اسے قرنطینہ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ شاید یہ ہوموسیپئن (Homo Sapiens) ان کے کسی جینیاتی تجربے کی پیداوار تھے اور اب ان کے اپنے سیارے کے لیے خطرہ بنتے جا رہے تھے۔ یہ ستارہ مکین کی وجہ سے اس زمین کو مانیٹر کرنا چاہتے تھے۔ اس غرض سے اپنے ترقی یافتہ انداز میں انہوں نے غزہ کا عظیم اہرام تعمیر کیا۔ اس کام کے دوران میں جب وہ مصر میں تھے تو اس دور کے لوگوں نے انہیں دیوتاؤں کا درجہ دے دیا اور ان کی پوجا کرنے لگے۔ آپ کسی قدیم وحشی قبیلے میں جدید ریڈیو لے جائیں تو وہ لوگ یقیناً آپ کو جادوگر سمجھنے لگیں گے۔ اس دور کے جدید ساز و سامان کے ساتھ ہزار سال پہلے کے دور میں کسی مہم پر چلے جائیں اس دور کے لوگ آپ کو دیوتا ہی سمجھنے لگیں گے۔ اس منظر نامے میں ان ستارہ مکینوں نے اہرام تعمیر کیے۔ یہ عمارت شاید ہماری زمین کی نگرانی کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے۔ یہ کسی سرویئر (Surveyor) کی نشانی بھی ہو سکتی ہے جو کائنات میں کسی گروپ کی حدوں کا تعین کر رہی ہے۔ ہمارے سرویئر بھی تو کسی جائداد یا زمین کی حدبندی کے لیے پتھر لگاتے ہیں۔ شاید ستارہ مکینوں نے اس عمارت کے ذریعے بین السیارہ جاتی (Inter-galactic) حد بندی کی ہو۔ بہر حال وہ یہاں آتے تھے اور انہوں نے یہ عظیم اہرام تعمیر کیا تھا۔

اس منظر نامے کا دوسرا حصہ ان ہوموسیپئن کا ہے جنہوں نے جہازی مسلک شروع کیا تھا (Cargo Cult)۔ یہ مسلک جنوبی بحر الکاہل کے جزائر میں آباد قدیم اور وحشی قبیلوں نے دوسری عظیم کے بعد تخلیق کیا تھا۔ جب امریکی اور جاپانی طیارے ان جزیروں پر سے پرواز کرتے گزرا کرتے تھے، چند ایک طیاروں کے انجنوں میں خرابی پیدا ہوئی اور وہ کریش کر گئے۔ یہ زمین پر گر کر تباہ ہو جانے والے طیارے ان پس ماندہ اور وحشی قبائل کے لیے ایک حیرت انگیز عطیہ یا نعمت غیر مترقبہ تھے۔ جنگ پھیلتی گئی تو طیارے ان جزیروں پر اترنے بھی لگے۔ ہوا باز اکثر ان مقامی لوگوں کو تحفے تحائف دیا کرتے تھے۔ اس طرح سے وہاں جہازی مسلک (Cargo Cult) کی بنیاد پڑی۔ آج بھی ان طیاروں کے باقیات ان کی قربان گاہیں بنی ہوئی ہیں۔ شامان اور ساحر طبیب (Witch Doctors) اپنے پیروکاروں کو بلند ترین پہاڑوں پر لے جاتے ہیں اور دیوتاؤں سے دعائیں مانگتے ہیں۔ ان کی دعا یہی ہے کہ دیوتا لوٹ آئیں اور ان کی جھولیاں خزانوں سے بھر دیں۔ اگر خلائی مخلوق ہی نے اہرام تعمیر کیا تھا تو پھر گویا کہ قدیم زمانے میں اہرامی مسلک (Pyramid cult) بھی شروع ہو گیا تھا۔ لوگوں نے ان وحشی قبائل کی طرح آسمانوں سے دیوتاؤں کو بلانے کے لیے پھر بے شمار

اہرام تعمیر کر ڈالے اور ٹھیک اسی طرح جیسے اب بھی جیٹ طیارے ان جزیروں پر سے پرواز کرتے گزر جاتے ہیں وہ ستارہ مکین اپنے خلائی جہازوں میں آتے ہیں اور کسی کو کچھ کہے بغیر گزر جاتے ہیں۔

اہرام جو دکھائی دیتے ہیں وہی ہیں

شاید ہیروڈوٹس ٹھیک ہی کہتا تھا کہ یہ اہرام مصریوں نے تعمیر کیے تھے۔ پاگل پن یا فیشن پرستی پر جدید دنیا ہی کی اجارہ داری تو نہیں ہے۔ شاید یہ عظیم اہرام اور دنیا بھر میں بکھری ہوئی ایسی ہی دیگر عمارات محض قدیم حکمرانوں کے مقبرے یا یادگاریں ہوں جیسے جیسے ان عمارات کا فیشن بڑھتا گیا دنیا بھر کے بادشاہوں نے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے خیال سے ایک سے ایک بڑھ کر عالی شان اور وسیع و بلند عمارات تعمیر کرانی شروع کر دیں۔ ان کا موٹو یہی رہا ہوگا "کام پوری رفتار سے ہو اور غلام کھڈے میں جائیں۔"

اگلے دس ہزار برسوں میں یہ سرّیت اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی۔ اور تمام تر سوالات کے جوابات مل جائیں گے۔ کوئی بھی معمہ حل طلب نہیں رہے گا۔ چند لوگ پھر ماضی میں جھانکیں گے تو حیرت زدہ رہ جائیں گے کہ قدماء کو عظیم اسرار کے ساتھ رہنا کیسا لگتا ہوگا۔ ان کے بچے نامعلوم اشیاء کا تصور کرنے کی کوشش کریں گے۔ انہیں تعجب ہوا کرے گا کہ دنیا میں کبھی ایسا دور بھی تھا جب انسانی ذہن پیچیدہ اسرار کی گتھیاں سلجھانے میں منہمک رہا کرتے تھے۔ جب لوگ سوچ بچار کرتے تھے' غور و فکر کرتے تھے اور کوئی مسئلہ حل کرنے کے لیے ذہنی قلابازیاں کھاتے تھے۔ آنے والی نسل کے بچے اس دور کو یاد کرنے کی کوشش کریں گے جب شکوک و شبہات تھے' حیرت و استعجاب تھا' کسی موضوع کی تہہ تک پہنچنے کے لیے بحث و مباحثہ ہوا کرتا تھا۔ وہ اس دور کو 'دماغی مہم جوئی کا دور' کے نام سے پکاریں گے۔ ایسے دور سے قبل کا دور جب تمام معمے حل ہو چکے ہیں کہیں کوئی اسرار نہیں ہے کائنات کے تمام راز منکشف ہو چکے ہیں۔ سو قارئین! ہم نے اہراموں سے متعلق خاصی گفتگو کر لی ہے مگر اب بھی تشنگی باقی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ابھی اس موضوع پر بہت کچھ کہنے سننے اور جاننے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں تاریخی دستاویزات اور مستند گواہیاں اور شہادتیں ایک قانونی عدالت میں بھی قابلِ قبول ہوتی ہیں سو میں نے ایک اٹارنی کی حیثیت سے آپ کی عدالت میں وہ سب کچھ پیش کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے جو مجھے اس ضمن میں میسر آ سکا تھا۔ جہاں کہیں ممکن ہو سکا میں نے آپ کے سامنے گواہان کو بھی لا کھڑا کیا ہے اور انہوں نے اپنے اپنے الفاظ میں وضاحتیں اور شہادتیں پیش کی ہیں۔ اب اہرام کے تمام تر پہلو آپ کے سامنے ہیں۔ آپ کو اختیار ہے کہ اپنی اپنی استعداد و تیقن کے مطابق انہیں رد کر دیں یا قبول کر لیں۔

آپ کی حیثیت جیوری کی سی ہے۔

اب آپ بتایئے اہراموں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

☆☆

سائنس ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی دوسری تہلکہ خیز پیشکش

برموداٹرائی اینگل

حقیقتیں اور افسانے

راجپوت اقبال احمد

امریکی ریاست فلوریڈا کی شمال مشرقی سمت تقریباً بارہ سو میل کے فاصلے پر بحرِ اوقیانوس میں جزائر برمودا کے قریب ایک مثلث نما علاقہ ایسا ہے جس پر سے گزرنے والے سمندری جہاز، طیارے یا کوئی بھی جاندار شئے اس علاقے سے گزرتے ہوئے یکایک غائب ہو جاتے ہیں لیکن کیوں؟ اس کا سبب آج تک معلوم نہ ہو سکا حتیٰ کہ سمندر کی تہہ میں بھی ان کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ اس علاقے سے سفر کرنے والے ہزاروں مسافروں، کپتانوں، ملاّحوں اور پائلٹوں نے ایسے ایسے عجیب و غریب اور ناقابلِ یقین واقعات، حالات اور مشاہدات کے تذکرے کئے ہیں جن کے بارے میں انسانی عقل کچھ کہنے سننے سے قاصر ہے۔ برمودا کے معمے پر سائنس ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی دوسری تہلکہ خیز اور ہلچل مچادینے والی کتاب جس کا آپ کو برسوں سے انتظار تھا اور جس کا ہر صفحہ اور ہر سطر بار بار پڑھے جانے کے قابل ہوں گے اپنا آرڈر آج ہی بک کرالیجئے۔

200 باتصویر صفحات قیمت مع ڈاک خرچ =/120روپے

سائنس ڈائجسٹ کے مستقل قارئین کے لیئے رعایتی قیمت =/80روپے

سائنس ڈائجسٹ پبلی کیشنز 207 النور چیمبرز، پریڈی اسٹریٹ، صدر کراچی 74400

فون: 7727064 E.mail: sci_dig@yahoo.com